مشہور ناول
"سنائپر" کا دوسرا حصہ
سپاٹر
SPOTTER
ریاض عاقب کوہلر

دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دینے والے نشانہ باز کے ہنگامہ خیز شب و روز

سپائر

راوی: راجا ذیشان حیدر

رياض عاقب کوہلر

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور

فون: 042-37652546, 37668958

www.alquraish.com email: info@alquraish.com

"ٹھ ٹھ ٹھ ... تڑ تڑ تڑ..... "ایک دم تیز فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ میری آنکھ پہلی گولی ہی سے کھل گئی تھی۔ اور بلا شک وشبہ وہ روزمرہ کا تلاشی فائر نہیں تھا۔ (تلاشی فائر سے مراد وفاع لی ہوئی فوج کا وہ فائر ہوتا ہے جو دشمن کی موجودگی کے خطرے کو مدنظر رکھ کر سنتری دشمن کو تاڑے بغیر اندازے سے کرتا ہے ایسا فائر فقط شک دور کرنے کو کیا جاتا ہے)

ساتھ والے بستر پر لیٹا سردار خان بھی اٹھ بیٹھا تھا۔ گولیاں رہائشی مورچے کی غربی دیوار سے ٹکرائیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت قریب سے گولیاں چلائی گئی ہوں۔ کلاشن کوف اٹھاتے ہوئے وہ اطمینان سے بولا۔

"راجے! بہتر ہوگا کہ کلمہ شہادت دہرا لے۔"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تم جیسے خان ہی پٹھانوں کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں کہ گولیوں کی آواز پر تمھیں کلمہ شہادت ہی بھول گیا ہے۔"

فوجی جوانوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ نمایاں آواز "رانی" کی تھی۔ پاک آرمی کے جوان "ایل ایم جی" کو پیار سے رانی کہتے ہیں۔ اور بلاشبہ یہ میدان جنگ کی رانی ہے۔ ایک منٹ میں گیارہ سو سے تیرہ سو گولیاں فائر کرنے والی ایسی گن جس کی آواز سن کر ہی دشمن پر لرزہ طاری ہو جائے۔ یہ تیز ترین ریٹ آف فائر والی گن ہے اور اسی وجہ سے اس کے ساتھ دو بیرل استعمال کی جاتی ہیں۔ جونھی ایک بیرل گرم ہوتی ہے فی الفور دوسری بیرل ڈال دی جاتی ہے۔ بیرل تبدیل کرنے کا طریقہ کار نہایت سادہ اور آسان ہے اور اس پر سیکنڈ بھر سے زیادہ وقت بھی خرچ نہیں ہوتا۔

وہ جھکے جھکے دروازے کے قریب ہوا۔ "کلمہ شہادت کی تلقین تمھاری آخرت سنوارنے کو کی ہے، ورنہ تمھارے کالے کرتوتوں سے بعید ہے کہ تمھیں کلمہ پڑھنا یاد رہے۔"

وہ وقت لفظوں کی گولہ باری کے بجائے عملی اقدام کا تھا میں خاموشی سے اس کی تقلید کرتے ہوئے دروازے کے قریب ہو گیا تھا۔ ایل ایم جی کے ساتھ کلاشن کوفوں کی تڑتڑاہٹ بھی جاری تھی۔ سردار دروازہ کھولنے سے پہلے چھاتی کے بل لیٹ گیا تھا۔ میں نے روشنی بجھا دی۔ رات کے وقت سب سے اچھا ہدف روشنی ہی بنتی ہے۔ اور پھر لکڑی کا دروازہ بھی گولی کے خلاف کوئی آزمیا نہیں کرتا۔

عموماً ایکشن فلموں میں ہیرو صاحب کسی میز وغیرہ کی آڑ لے کر گولیوں کی بوچھاڑ سے یوں بچ جاتا ہے جیسے بکتر بند

میں پناہ لے رکھی ہو۔ اور میز کی موٹائی بھی ایک ادھ انچ سے کم ہوتی ہے۔ یاد رکھیں تو دس انچ تک موٹی لکڑی بھی فائر کے خلاف آزمایا نہیں کرتی، تو ایک ادھ انچ موٹی لکڑی کیسے گولی کو روک سکتی ہے۔

رہائشی بنکر کے سامنے فائری خندقیں بنی تھی۔ میدانی علاقے میں ایسی خندقیں زمین کو کھود کر بنائی جاتی ہیں اور کھدائی سے جو مٹی نکلتی ہے وہ خندق کے سامنے بند کی صورت ڈھیر کر دی جاتی ہے۔ لیکن پہاڑی علاقے میں کھدائی نہیں کی جا سکتی اور پتھروں کی دیوار بنا کر فائری خندق بنائی جاتی ہے۔ تاکہ نقل و حرکت کو دشمن کے فائر اور نگرانی سے محفوظ رکھا جا سکے۔

فائری خندق رہائشی بنکر سے ذرا نشیب میں بنی تھی، ہم وہاں تک کھڑے ہو کر نہیں جا سکتے تھے۔ پہاڑوں پر مورچے اور رہائش بنانے میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ جہاں جگہ اجازت دیتی ہے وہاں دیوار کھڑی کر دی جاتی ہے۔ رہائشی بنکر کی دیواریں بنانے کو تو جگہ مل جاتی ہے لیکن فائری خندقوں کی مسلسل دیوار بنانے کو کافی احتیاطوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ وہ دیوار بھی کمروں سے ذرا نشیب میں تھی اور لیٹ ہی کر گولیوں کی بوچھاڑ سے بچا جا سکتا تھا۔

ہم کرالنگ کرتے ہوئے نیچے پہنچے۔ کلاشن کوفوں کے دہانے بارش کے قطروں کی طرح گولیاں اگل رہے تھے۔ دہشت گردوں کی بڑی تعداد حملہ آور ہوئی تھی، دہشت گردوں کی فائرنگ کا عمومی طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ، آڑ میں رہتے ہوئے کلاشن کوف کی نال (بیرل) کو ہدف کی جانب سیدھا کر کے حفاظتی لیور (سیفٹی) کو خودکار (آٹومیٹک) حالت پر رکھ کر لبلبی (ٹریگر) دبا دیتے ہیں۔ اور جب تک میگزین خالی نہیں ہو جاتی لبلبی سے انگلی نہیں اٹھاتے۔ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ کلاشن کوف کے ساتھ مختلف قسم کی میگزینیں استعمال ہوتی ہیں جن میں تیس، چالیس اور پچھتر گولیوں کی میگزینوں کا استعمال عام ہے۔ کلاشن کوفوں کے گرجنے کے ساتھ ایل ایم جی اور جی تھری کا دھاڑنا بھی شروع تھا۔

ہم اس وقت ''کیو۔ جے ٹاپ'' پر موجود تھے۔ شوال وادی عبور کرنے کے بعد ایک مسلسل پہاڑی سلسلہ ہے جو شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سامنے وسیع اور چوڑا نالہ ہے جس کی چوڑائی تقریباً ساڑھے چار پانچ کلومیٹر کے بہ قدر ہوگی۔ نالے کا زیادہ تر حصہ خشک ہے اور درمیان میں بہت کم مقدار میں پانی بہہ رہا ہے جس کا بہاؤ جنوب سے شمال کی جانب ہے۔ اسے افغان نالہ کہا جاتا ہے۔ یہ صرف کہنے کی حد تک نالہ ہے ورنہ اس کی وسعت کسی بھی طرح چوڑی وادی سے کم نہیں ہے۔ نالے میں چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں اور پتھر کی چٹانیں بکثرت پھیلی ہیں۔ جتنی کثرت سے چٹانیں اور ٹیکریاں پھیلی ہیں اس سے زیادہ تعداد میں دہشت گردوں کی ٹولیاں اکٹھی ہوئی ہیں۔ جو آرمی کے خلاف تو کارروائیاں کرتے ہی ہیں معصوم مقامی لوگوں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

نالہ عبور کر کے ایک اور پہاڑی ہے۔ جو کیو جے ٹاپ کے متوازی شمال سے جنوب کی طرف پھیلی ہے۔ اس کے بلند مقام کا نام بامک ٹاپ ہے۔ بامک ٹاپ کی بلندی قریباً گیارہ بارہ ہزار فٹ ہے۔ اور شمالاً جنوباً اس کی بلندی بتدریج کم ہوتی ہوئی زمین سے مل جاتی ہے۔ اس سے ملحق جنوب کی جانب افغانستان کے شہر لمن کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ اور شمال کی جانب ایک بڑا گاؤں گرش خیل کلے ہے۔ گرش خیل کلے میں امریکی فوج کی ایک چھاؤنی بھی موجود ہے، جبکہ لمن شہر کے شمالی جانب انڈیا کی ایک پوسٹ ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ دہشت گردوں کے اصل ماخذ امریکی چھاؤنی اور انڈین پوسٹ ہی ہیں۔ بامک ٹاپ پر بھی دہشت گردوں کے ٹھکانے موجود ہیں۔ انڈیا ہماری سرحد کو کسی صورت محفوظ نہیں دیکھ سکتا اور باڑ کو مکمل ہونے سے روکنے کو مسلسل دہشت گردانہ کارروائیاں کروا رہا ہے۔ بلکہ دہشت گردوں کے ساتھ عموماً انڈیا کے سنائپر بھی پاکستان آرمی کے خلاف مصروف کار نظر آتے ہیں۔ سنائپنگ کے علاوہ گاہے گاہے جسمانی حملے بھی ہوتے رہتے ہیں جن کا منہ توڑ جواب دیا جاتا ہے۔

پہلے سردار اور میں انگور اڈے سے جنوب کی جانب لکوانڑا سیکٹر میں تعینات ہوئے مگر وہاں سنائپر حملے قلیل تعداد میں

ہوتے تھے،تبھی ہماری ضرورت کیو بے تاب پرمحسوس کی جانے لگی اور ہم یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ ہفتے ہونے کو تھے،دن بھر مورچے میں لیٹ کر دشمن کے سنائپروں کو تاڑتے اور شام کو رہائشی بنکر میں گھس کر آرام کرتے۔ ہماری آمد کے بعد یہ دہشت گردوں کا پہلا جسمانی حملہ تھا۔

فائری خندق میں اترتے ہی سردار دوڑ کر قریبی مورچے میں پہنچا۔خندق میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچے بنے ہوئے تھے۔ایک مورچے کے موکھے(Loop Holes) پر کلاشن کوف کی نال ٹیک کر سردار جوابی فائر کرنے لگا۔ میں نے بھی اس کے دائیں جانب پوزیشن سنبھالی۔حملہ آور کافی قریب پہنچ چکے تھے۔اوران کے چھپ کر قریب پہنچنے میں سنتریوں کی غفلت کے بجائے علاقائی خدوخال کا ہاتھ تھا۔ورنہ اس علاقے میں پہرے دار سستی یا غفلت کا شکار نہیں ہو سکتے۔درختوں کے جھنڈ،ابھری ہوئی ڈھلانیں اور ادھڑی زمین چھپ کر حرکت کرنے کو نہایت معاون و مددگار ہوتی ہیں۔خاص کر اندھیرا تو دشمن کے لیے قریبی دوست کی حیثیت رکھتا ہے۔

سردار کے فائر کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ خندق کی دیوار سے ٹکرائی،سر نیچے کرتے ہوئے وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''تمھاری کلاشن کوف گونگی ہے۔''

''کوئی نظر بھی آئے یا گولی ضائع کردوں۔''میں نے منہ بنایا۔

''نشانہ بازی کا مقابلہ نہیں ہے حضور!ایسے موقع پر اندھادھند فائرنگ کی جاتی ہے۔''

میں ہنسا۔''اندھادھند فائر،اندھے کرتے ہیں۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔''اندھوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اندھا بننا پڑتا ہے۔''

''بغیر ہدف دیکھے جب بھی ٹریگر دبانے لگوں تصورصاحب کا تنبیہ بھرا دعظ کانوں میں گونجنے لگتا ہے۔''

سردار نے موکھے سے بیرل نکال کر ایک چھنا(برسٹ) گولیوں کا نکالا۔''وہ خود تو صوبیدار میجری کے مزے لوٹ رہے ہیں اور تم ان کے نصائح کی خاطر اپنا نقصان کرانے پر تیار بیٹھے ہو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''استاد کی نصیحتوں پر عمل کرنے سے کم از کم نقصان نہیں ہوسکتا۔''ایک دم فائرنگ میں تیزی آئی،ہمیں موکھے کے سامنے سے ہٹنا پڑا۔ ہمارے دائیں جانب مورچے میں بھی دو جوان موجود تھے۔ان کے پاس ایل ایم جی تھی۔اور وہ درمیانے چھٹے فائر کر رہے تھے۔(ایک تربیت یافتہ فائرر ایل ایم جی استعمال کرتے وقت چار اقسام کا فائر کرتا ہے۔آہستہ،درمیانہ،تیز اور لگاتار۔ایک بار ٹریگر دبانے سے گن کے دھانے سے نکلنے والی گولیوں کی تعداد کو فائری چھنا یا برسٹ آف فائر کہتے ہیں۔اور فائری چھٹے میں گولیوں کی تعداد کا انحصار ٹریگر دبانے کی مدت پر منحصر ہے۔ایل ایم جی کا ریٹ آف فائر اتنا تیز ہے کہ ایک منٹ ٹریگر کو دبا کر رکھیں تو 1100 سے 1300 گولیاں فائر کر دیتی ہے۔اس سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چھے سات گولیوں کا چھنا نکالنے کو ٹریگر کو کتنا دبانا پڑے گا)

وہ دونوں ہم سے چند گز ہی دور تھے۔اچانک تیز کراہ سنائی دی۔سردار فوراً بولا۔''کام ہو گیا۔''

کراہ میں نے بھی سن لی تھی اور اسی جانب متوجہ تھا۔ایک جوان کندھے کو تھامے نیچے بیٹھ گیا تھا جبکہ دوسرا ٹارچ روشن کر کے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں تیزی سے ان کی طرف بڑھا،سردار اپنی جگہ ڈٹا رہا۔

زخمی ہونے والے نے گن کی بیرل تبدیل کرنے کو بیرل کیچ کھولا تھا تبھی بھولی بھٹکی گولی نے موکھے سے گزر کر اسے وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا۔قسمت اچھی تھی ورنہ تین چار انچ کے فرق کے ساتھ گولی اس کی گردن میں بھی پیوست ہو سکتی تھی۔۔۔اور ایسا ہونے پر ایک ماں کا بیٹا،بہن کا بھائی،کسی بیوی کا شوہر،ننھے منے بچوں کا ابو،بوڑھے باپ کا سہارا منوں مٹی

متعلق استفسار کرنے پر جوان بیوہ اور بوڑھی وادی کے آنسو ان معصوموں کی
تک پہنچ جاتا۔ اور ننھے بچوں کے اپنے باپ کے

سمجھ سے باہر ہوتے۔
اس کا نام ولدار تھا اور وہ بچ گیا تھا، لیکن ایسے کئی ولدار میں نے ارض پاک پر قربان ہوتے دیکھے ہیں۔ لاش گھر آتی
ہے تو کسی کا سر نہیں ہوتا اور کسی کا دھڑ نہیں ملتا۔ لکڑی کے ایک تابوت میں خاکی وردی کی چند دھجیاں لپیٹ کر والدین کے
بہلانے اور ان کی محبت کو مرکز مہیا کرنے کا حیلہ کر دیا جاتا ہے اور وطن کی خاطر جان دینے والے کے گوشت کے لوتھڑے
اور وفادار خون اپنی مٹی میں ایسے خلط ہو جاتا ہے کہ سرخ اور خاکی کی پہچان مٹ جاتی ہے۔
میں نے ولدار کا زخمی کندھا تھامتے ہوئے اس کے ساتھی اسلم کو کہا۔ "کیو سی بی لے آؤ۔" (Quick Combat
آرمی میں ہر جوان کو مہیا کی جاتی ہے۔ یہ حادثاتی چوٹ اور گولی وغیرہ لگنے سے بہتے خون کو روکنے کو ابتدائی طبی Bandage
امداد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اسے سادہ زبان میں فیلڈ پٹی بھی کہتے ہیں)
"میرے پاس موجود ہے۔" اس نے اپنے بنڈوریل (ہتھیار کی اضافی میگزینیں رکھنے اور چھاتی و پیٹھ کو گولی سے
بچانے کو بلٹ پروف پلیٹیں ڈالنے کا جیکٹ نما پہناوا۔ اسے عموماً بلٹ پروف جیکٹ کہتے ہیں) کی جیب سے "کیو سی بی"
نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ اس اثناء میں میں نے ولدار کا بنڈوریل اتار دیا تھا۔ حفاظتی پلاسٹک ہٹا کر میں نے نرم پٹی
زخم کے منہ پر دبا کر رکھی اور پٹی کو مہارت سے لپیٹ دیا۔
ولدار ہوش میں تھا۔ میں نے اسلم کو کہا۔ "اسے سہارا دے کر رہائشی بنکر میں لے جاؤ۔"
اس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی جی تھری کندھے سے لٹکائی اور ولدار کے ساتھ فائری خندق میں آگے بڑھ
گیا۔ اس حالت میں بھی جوان نے اپنا ہتھیار پیچھے چھوڑنا گوارا نہیں کیا تھا۔
میں نے ایل ایم جی میں بیرل ڈال کر بیرل کیچ بند کیا اور فیڈ ٹرے میں گولیوں کا بیلٹ چڑھا دیا۔ ایل ایم جی میں
گولیوں کا بیلٹ چڑھتا ہے اور ایک بیلٹ میں اڑھائی سو گولیاں آتی ہیں۔
سردار قریب آیا۔ "راجے! میں تمھیں ایل ایم جی کی بے حرمتی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تم وہ نمونے ہو جو
بارہ بور سے بھی ایک ایک چھرہ فائر کرنے کی کوشش کرو گے۔"
"خان صاحب آپ ہی شوق پورا کر لیں۔" میں نے پیچھے ہو کر کلاشن کوف اٹھالی۔
سردار نے اپنی کلاشن کوف دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور ایل ایم جی کا بٹ کندھے میں پھنسا لیا۔ لبلبی دبا کر اس نے
ایک لمبا چھٹا نکالا۔ اسی وقت دو تین اور ایل ایم جی بھی گرجیں، سامنے سے آنے والا فائر لمحہ بھر کو رک گیا تھا۔
اسلم ولدار کو پہنچا کر واپس لوٹا۔
میں نے کہا۔ "تمھیں ولدار کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔"
وہ اطمینان سے بولا۔ "نرسنگ حوالدار واجد کے حوالے کر آیا ہوں۔"
آرمی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر پیشے کے مینے اس میں موجود ہیں۔ علاج معالجے کو میڈیکل کے
نمائندے، ہتھیاروں کی دیکھ بھال کو آرمورر، گاڑیوں کی مرمت کو مکینک، سڑکیں، پل وغیرہ بنانے کو انجینئرز وغیرہ۔
میں نے پوچھا۔ "شب دیدہ عینک (نائیٹ ویژن سائیٹ) مل جائے گی۔"
اسلم نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اے این، پی وی ایس۔ فور اے (AN/PVS-4A) موجود ہے۔"
خوشی کا اظہار کرتے ہوئے میں مسرت سے بولا۔ "لے آؤ۔" اس کا ہیولہ دوبارہ اندھیرے کا حصہ بن گیا تھا۔ اس کی
واپسی تک میں سردار کی فائرنگ سے محظوظ ہوتا رہا۔ ایک بیلٹ ختم کر کے اس نے دوسرا چڑھا لیا تھا۔ اسلم کے آنے تک

دوسرا ایلٹ بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔اسلم نے شب دید عینک لے کر میں نے بیٹریاں ڈال کر آن کیا۔اور ۔ بمیشہ ایل ایم جی پر لگا دی۔"اسے این۔ وی۔ ایس فور (اے این۔پی وی ایس فور) کہا جاتا ہے اس کا تعلق تھرڈ جنریشن سے ہے۔(شب دید آلات کی اقسام کے متعلق میں سائیڈ میں وضاحت کر چکا ہوں کسی کو جاننے کا شوق ہو تو وہاں پڑھ سکتا ہے)

مورچہ کا موکھا اتنا چوڑا نہیں تھا کہ شب دید آل لگانے کے بعد بھی دکھاؤ کی سہولت مہیا کرتا۔سردار نے کہا۔"گن کسی اور جگہ لگانا پڑے گی۔"

فائری خندق میں بغیر چھت کے مورچے بنے ہوئے تھے۔یوں کہ خندق کی دیوار میں جگہ جگہ موکھے بنا کر انھی سے مورچوں کا کام لیا جاتا۔البتہ پوسٹ کے چاروں کونوں میں ایک ایک بڑا مورچہ بنا ہوا تھا۔وزیرستان میں پاک آرمی کو ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہے کہ دشمن کی سمت متعین نہیں ہے۔بظاہر تو دشمن مغربی جانب تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہرے داروں کو چاروں اطراف کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے دقاع میں چور رستے موجود ہیں کہ دشمن کو سرحد پار کرنے کو اتنا جوکھم نہیں اٹھانا پڑتا۔پھر آستین کے سانپ بھی موجود ہیں اور انھیں چھپنے کو کئی ٹھکانے میسر ہیں۔

گن اٹھا کر ہم نے مزید دائیں جانب حرکت کی اور شمال مغربی مورچے کی چھت پر چڑھ گئے۔اسلم کو ہم نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔مورچے کی چھت پر گولی لگنے کا زیادہ خطرہ تھا۔مورچے کے اندر نائب صوبیدار اختر صاحب موجود تھا۔اس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی مگر ہم باصرار چھت پر چڑھ گئے تھے۔فوج میں جونیئر سینئر کی تمیز اور نظم و ضبط کا اعلیٰ معیار مقرر ہے۔سینئر کے منع کرنے پر بھی اپنی مرضی پر چلنے کا تصور کسی اور محکمے میں تو ہو سکتا ہے فوج میں نہیں۔لیکن وہاں ہماری الگ حیثیت تھی۔ہم براہ راست میجر نعیم کے زیر کمان تھے۔(میجر نعیم ،میجر اورنگ زیب کی جگہ تعینات ہوئے تھے،جواب لیفٹیننٹ کرنل بن چکے تھے)

اختر صاحب ہمیں نصیحت تو کر سکتا تھا حکم دینے کا مجاز نہیں تھا۔پوسٹ کمانڈر کے لیے ہماری حیثیت مہمان کی سی تھی، تبھی اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا تھا۔وہ فرنٹیئر فورس ۶۶ کی ایک مایہ ناز یونٹ تھی۔میجر نعیم سے ہمیں وائرلیس سیٹ پر احکامات موصول ہوتے تھے۔یا یونٹ کے نمبر پر کال آجاتی تھی۔افغانستان کی موبائل فون سروس جیسے AWCC (افغانستان وائرلیس کیمونی کیشن)ADIA اور روشن وغیرہ کے سگنل وہاں آتے تھے،مگر ہم نے ان کے کنکشن خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ ان کے بغیر بھی کام چل رہا تھا۔

مورچے کی چھت پر حفاظتی نقطہ نظر سے خطرہ تھا لیکن دکھاؤ کے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے تھے۔دہشت گرد یقیناً کوئی خاص مقصد لے کر آئے تھے تبھی تو مقابلے پر ڈٹے تھے۔ورنہ عموماً ان کا حملہ لمحاتی ہوتا تھا۔پہلے ہلے میں جتنا نقصان کر سکتے تھے،کرتے اور پھر بھاگ جاتے۔پہاڑی بناوٹ کسی بھی آدمی کو فرار ہونے کے بہترین مواقع مہیا کرتی ہیں۔درختوں کے جھنڈ،پتھریلی چٹانیں،گڑھے،نالوں کے کھڑے کنارے اور کٹی پھٹی زمین فائری اور نظری ہر قسم کی آڑ مہیا کرتی ہے۔

سردار نے بڑی مشکل سے مجھے ایل ایم جی کے پیچھے لیٹنے کی اجازت دی تھی۔ربڑ آئی شیڈ پر دائیں آنکھ ٹیکتے ہوئے میں نے جونھی دباؤ ڈالا،آئی لینز کو ڈھانپنے والا والا کور خودکار طریقے سے دائیں بائیں ہو گیا۔سائیٹ کا اندرونی نظارہ روشن تھا۔ہر طرف سبز سبز نظر آ رہا تھا۔مجھے چودھویں کے چاند کی روشنی سے بھی تھوڑا واضح علاقے کے خدوخال دکھائی دے رہے تھے۔یہاں ایک اور بات کی وضاحت کرتا جاؤں کہ گن اور رائفل کے فائر میں فرق ہوتا ہے۔گن ہمیشہ علاقہ ہدف کو استعمال ہوتی ہے،مطلب گن کا فائر ہدف پر بکھر کر پڑتا ہے۔اور گن کے اہداف آدمیوں کے جتھے،مورچے اور

گاڑیاں ہوتی ہیں،اس کے برعکس رائفل کا فائر نقطہ ہدف پر ہوتا ہے۔خصوصاً سنائپر رائفل کا فائر عام رائفلوں سے کئی گنا زیادہ درست اور کارگر ہوتا ہے۔وہاں ہمارے پاس سنائپر رائفلیں موجود تھیں لیکن ان کے عب دید آلات ہم نہیں منگوا سکے تھے۔اور مجبوراً ایل جی استعمال کرنا پڑ رہی تھی کہ''اے این،پی وی ایس فور الفا''ایل ایم جی ہی پر استعمال ہوسکتی ہے۔جی تھری،کلاشن کوف یا سنائپر رائفل پر اسے نہیں لگایا جاسکتا۔(اب تو ایل ایم جی کی نئی سائیٹ بھی آگئی ہے،جو اسے این پی وی ایس سے کارکردگی میں کافی بہتر ہے)گو میرے بہت سے قارئین ایسے ہیں جن کا تعلق پاک آرمی سے ہے اور یقیناً انھیں میری وضاحتیں بچکانہ لگتی ہوں گی،لیکن جن کا تعلق فوج سے نہیں ہے اور ان میں بڑی تعداد خواتین کی ہے انھیں سمجھانے کو مجھے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا پڑتی ہے تاکہ وہ بھی کہانی سے لطف اندوز ہوسکیں۔کیوں کہ بعض باتیں پڑھنے والے کو الجھا دیتی ہیں،اگر ان کی اچھے سے وضاحت کردی جائے تو قاری کی الجھنیں دور ہوجاتی ہیں۔اور ایک مصنف کسی مخصوص طبقے کے لیے نہیں سب کے لیے لکھتا ہے،اس لیے جن حضرات کی بصارتوں پر یہ وضاحتیں گراں گزرتی ہوں وہ حقیر کی معذرت قبول فرمالیں۔اور ان سطور کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ جایا کریں)

دہشت گرد حملہ کرتے ہوئے کافی قریب آچکے تھے۔ان کی تعداد میری توقع سے بھی زیادہ تھی۔دونوں جانب سے گولیاں موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی تھیں۔اگر آپ میں سے کسی کو فائر کا تجربہ ہوا ہو تو پتا ہوگا کہ رات کو فائر کے وقت مزل سے ہلکا سا شعلہ لپکتا نظر آتا ہے اور دن کے وقت مزل کے سامنے سے گرد اٹھتی ہے۔اور یہ ہتھیاروں کی ایک بڑی خامی ہے۔پہاڑی علاقوں میں فائر کی آواز سے ہتھیار کی جگہ کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ فائر کی بازگشت چاروں اطراف میں گونج رہی ہوتی ہے۔لیکن شعلے اور گرد سے ماہر افراد ہتھیار کی جگہ معلوم کرلیتے ہیں۔ایک سنائپر کا تو کام ہی یہی ہوتا ہے۔چھت پر لیٹتے ہی سردار نے دو تین جگہوں کی نشان دہی کردی تھی۔خود مجھے بھی مختلف چٹانوں کے عقب سے شعلے لپکتے محسوس ہورہے تھے۔ایل ایم جی کے بیلٹ میں ہر پانچویں گولی ٹریسر ہوتی ہے۔جو ہدف تک روشنی کی لکیر بناتی ہوئی جاتی ہے اور یوں فائرر کو اندھیرے میں بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کا فائر ہدف پر لگ رہا ہے یا یہاں دائیں بائیں نکل رہا ہے۔

دشمن پوسٹ سے قریباً ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر پتھریلی چٹانوں کے عقب میں مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔میرے مشاہدے میں کائنات کی بزدل مخلوق دہشت گرد ہیں۔دولت وغیرہ کے لالچ میں فتنہ فساد تو برپا کیے رکھتے ہیں لیکن وار ہمیشہ چھپ کر کرتے ہیں۔

پاک آرمی کا جوان مخصوص لباس میں متعین جگہ ہی پر پایا جاتا ہے۔اس کی پہچان واضح ہوتی ہے۔ایسے ہدف پر چھپ کر دور سے چند گولیاں چلا دینا یا رات کے اندھیرے میں راستے پر IED وغیرہ لگا دینے کو اگر کوئی بہادری سمجھتا ہے تو یقیناً اس کے دماغ کو علاج کی ضرورت ہے۔

عوام کی اکثریت مجاہدین اور دہشت گردوں میں فرق بھی نہیں کرسکتے۔حالاں کہ ان بھیڑیوں اور آستین کے سانپوں کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔انڈیا،اسرائیل،افغانستان،امریکہ وغیرہ کی شہہ پر پاک آرمی اور نہتی عوام کو نشانہ بنانے والے یہ درندے کسی صورت مجاہد نہیں ہوسکتے۔افغانستان کے اندر مجاہدوں کا ایک بڑا گروہ کفر سے برسرپیکار ہے۔انھیں بدنام کرنے کو ملک دشمن ایجنسیوں نے انسان نما حیوانوں کا ایک گروہ پیدا کیا ہے جو پیسے کی خاطر ملک کیا اپنے رشتہ داروں کو بھی ذبح کرنے سے پیچھے نہ ہٹیں۔یہ ضمیر فروش بھیڑیے،بھیڑوں کے روپ میں ہدف کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔اور جونھی موقع ملتا ہے بچھو کی طرح ڈنک مار کر چھپ جاتے ہیں۔لیکن الحمدللہ پاک آرمی کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں سے ان کی تعداد پہلے سے کئی گنا کم ہوگئی ہے۔اب یہ اپنی بقا کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔جیسے ڈوبنے والا بچنے کو

بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا ہے یہی حالت ان کی ہوگئی ہے۔ شمالی اور جنوبی وزیرستان میں پاک آرمی نے مجاہدوں نے فقر مار مار کر انھیں پاکستان کی حدود سے افغانستان کی طرف دھکیل دیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کی مثال آستین کے سانپ کی سی ہے اور ان میں بڑی تعداد پاکستان کے باسیوں پر بھی مشتمل ہے۔

کافی خواتین و حضرات یہ کہتے ہیں کہ وزیرستان کے لوگ دہشت گرد ہیں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ وزیرستان کے لوگ بہت امن پسند اور سچے پاکستانی ہیں۔ سادہ دل، محبت کرنے والے، اسلام کے شیدائی، مہمان نواز، نماز روزے کے پابند، شرعی پردے پر کاربند اور اس کے علاوہ بھی بہت سی خصوصیات کے حامل۔ اگر افراد دہشت گردی میں ملوث ہیں تو ان سے کئی گنا زیادہ دوسری قوموں کے افراد دہشت گردو تخریب کار ہیں۔ اس میں پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی وغیرہ کی تخصیص نہیں ہے۔ یوں بھی ایک دہشت گرد کا نہ تو مذہب ہوتا ہے اور نہ قوم۔ البتہ دہشت گردوں کے پاس پاکستانی شناخت موجود ہے اور اسی وجہ سے یہ اکثر خود کو چھپانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ بہرحال میں اندھیری رات کے کلمت سحر کے کا ذکر کر رہا تھا

"اے این پی وی ایس فور اتھا" کی عام آنکھ کی نسبت دیکھنے کی طاقت ساڑھے تین گنا ہے اور چاند ستاروں کی روشنی میں یہ انسانوں کے خلاف ساڑھے چار سو سے سات سو میٹر تک دکھاؤ مہیا کرتی ہے۔ اور اس وقت دشمن ڈیڑھ دو سو کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ البتہ شب دید آلہ لگا کر فائر کرنے اور دن کی روشنی میں فائر کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور سنائپر کو مخصوص رائفل کے بجائے گن استعمال کرنا پڑے تو فائر کی درستی مزید مشکوک ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ایک سنائپر کو بھی فائر کرتے وقت اچھے ہتھیار اور دکھاؤ کے بہتر حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہماری پوسٹ سے بھی مسلسل فائر ہو رہا تھا اس وجہ سے دشمن آڑ کے پیچھے ہی چھپا تھا۔ اگر دن کی روشنی میں میرے پاس سنائپر رائفل ہوتی تو میں اس فاصلے پر دشمن کے کسی بھی عضو کی جھلک پر اسے کامیابی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرے لیے کامیاب فائر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے قریب ظاہر ہونے والے فائر کے شعلے پر نشانہ سادھ کر میں نے سانس روکا اور لبلبی دبا دی۔ وہاں ایک درمیانے حجم کے پتھر کا ہیولہ نظر آ رہا تھا۔ ایل ایم جی کی گرج دوسرے ہتھیاروں کے شور کا حصہ بن گئی تھی۔ فوراً ہی وہاں سے فائر آنا رک گیا تھا۔ پہلے چھٹے کے بعد میں اسی جانب متوجہ ہو کر لیٹا رہا۔

سردار کی طنزیہ آواز گونجی۔ "راجے صاحب! خود کو گولی تو نہیں ماردی کہ دو گولیاں نکال کر دم سادھے لیٹے ہو۔"

میں جھلاتے ہوئے بولا۔ "تمھیں نہیں معلوم سنائپر کو کیا انتظار ہوتا ہے۔"

"تمھارے ہاتھ میں ایل ایم جی ہے بادشاہو! اور پہلے بھی عرض کی تھی کہ ایل ایم جی کی بے حرمتی نہ کرو۔"

میں اس کی بکواس پر کان دھرے بغیر ہدف کی جانب متوجہ رہا۔ جلد ہی پتھر کی اوٹ سے مجھے ایک ہیولہ نظر آیا، شاید وہ ساتھی کی مرہم پٹی کر رہا تھا یا اسے گھسیٹ کر پیچھے لے جانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اس کی چھاتی پر شست لیتے ہوئے دوبارہ لبلبی دبا دی۔ ہیولا اچھل کر گرا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

ایل ایم جی کے فائر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جتنا لمبا چھٹا (برسٹ) فائر کرو، گولیاں اتنی زیادہ ہدف پر پھیل کر گرتی ہیں۔ کیوں کہ لبلبی (ٹریگر) دبانے سے گن مسلسل جھٹکے لیتی ہے جس سے گولیاں بکھر جاتی ہیں۔ اس میں کچھ اور وجوہات بھی شامل ہوتی ہیں جن کی تفصیل کسی اور موقع پر اٹھا رکھتے ہیں۔

میں نے شست دوسرے پتھر کی جانب موڑ دی، کوشش تھی کہ جہاں شعلے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے وہیں نشانہ سادھوں۔ فائرر ہتھیار کو استعمال کرتے وقت اپنا دایاں گال بٹ پر ٹیکتا ہے، بایاں ہاتھ آگے کو پھیلا کر رائفل کا "فرنٹ ہینڈ

گارڈ" پکڑتا ہے، دائیں ہاتھ سے "پسٹل گرپ" کو گرفت میں لے کر شہادت کی انگلی لبلبی پر ہوتی ہے اور بائیں آنکھ بند کر کے وہ شست لیتا ہے (کھبا، یعنی بائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے کا ہر عمل اس کے برعکس ہوتا ہے) یوں فائرر کا سر بیرل کی سیدھ میں رہتا ہے۔ جبکہ فائر ہوتے وقت مزل سے نکلنے والا شعلہ بیرل کی نشان دہی کرتا ہے۔ اور ایک تجربہ کار سنائپر، ہتھیار اور فائرر کی اس خامی کا اچھی طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ البتہ یہ فائر کرنا ہر شخص کے لیے ممکن نہیں۔ کوئی تجربہ کار سنائپر ہی ایسا کر سکتا ہے۔ سردار بھی بہت اچھا فائرر تھا۔ اگر سنجیدہ ہو کر فائر کرتا تو مقابلہ کرتے ہوئے مجھے بھی دانتوں پسینہ آ جاتا، مگر اس میں ایک بڑی خامی تھی۔ وہ لا ابالی اور بے صبرا تھا۔ اور یہ دونوں عادات اچھے سنائپر کے لیے بہت نقصان دہ ہوتی ہیں۔ میرے اور اساتذہ کے گاہے گاہے ٹوکنے پر وہ وقتی طور پر تو سنبھل جاتا، مگر فطرت کے خلاف چلنا اتنا آسان نہیں ہے۔ امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران بھی اس کی جلد بازی نے ہمیں ہار کے دھانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

تین چار لمحے شست سادھنے کے بعد میں نے تیسری بار لبلبی دبائی۔ مگر وہاں سے آنے والا فائر نہیں رکا تھا۔ یقیناً وہ بھی شست لیے بغیر اندھا دھند فائر کر رہے تھے۔ تاکہ جوابی فائر پر وہ بہادر گولی لگنے سے بچ جائیں۔ اور خود ان کا مقصد دہشت ہی پھیلانا ہوتا ہے، کوئی بھولی بھٹکی گولی ہدف ڈھونڈ لے تو سونے پر سہاگا نہیں تو گولیوں کی دو تین میگزینیں ختم کر کے یہ سور بھاگنے میں دیر نہیں لگاتے۔

لمحہ بھر ٹھہر کر میں نے ایک اور چھوٹا فائر کیا، مگر نتیجہ پہلے والا ہی نکلا تھا۔

"سا ہے بہتر ہوگا ایل ایم جی کے حال پر رحم کرو۔" سردار نے سہ بارہ ٹوکا۔

"لو مرو۔۔۔" ایک جانب ہو کر میں نے ایل ایم جی سردار کے حوالے کر دی۔ ایل ایم جی پر ہمیشہ دو آدمی مل کر فائر کرتے ہیں۔ فائر کرنے والے کو ایل ایم جی نمبر ایک اور دوسرے کو ایل ایم جی نمبر دو کہتے ہیں۔ نمبر دو کا کام گن کی نال تبدیل کرنا اور گن لوڈ کرنا ہوتا ہے۔ نمبر دو گن کے دائیں جانب لیٹتا ہے۔ سردار کے جگہ سنبھالتے ہی میں رینگ کر دائیں ہاتھ ہو گیا تھا۔ سردار نے بھی انھی جگہوں پر فائر کرنا شروع کر دیا جہاں سے مزل کا شعلہ جھلک رہا تھا، البتہ میرے برعکس اس نے لمبے لمبے چھوٹے فائر کیے تھے۔ اور اصولی طور پر اس وقت سردار کا طریقہ کار مجھ سے بہتر تھا۔

میں نے پیچھے کھسک کر مورچے کی چھت سے نیچے جھانکا اور اختر صاحب کو آواز دی۔ "سر! شب دید عینک مل جائے گی۔"

"یہ لو۔۔۔۔" اس نے ہاتھ اونچا کر کے شب دید عینک "سیون ڈی" مجھے پکڑا دی۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ کچھ شب دید آلات دوربین کی طرح صرف دکھاؤ کے کام آتے ہیں اور کچھ ٹیلی اسکوپ سائیٹوں کی طرح ہتھیار پر لگا کر فائر کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ موخر الذکر آلات ہتھیار کے علاوہ خالی دیکھ بھال کو بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

"شکریہ سر!" کہہ کر میں واپس اپنی جگہ پہنچ گیا۔ سردار ایک بیلٹ ایمونیشن اڑا چکا تھا۔ نیا بیلٹ لگا کر میں اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔

"کم از کم تین لعنتی نشانہ بن چکے ہیں۔" نئے ہدف کی جانب بیرل موڑتے ہوئے سردار نے فخریہ لہجے میں اعلان کیا۔ مجھے فوراً ہی یقین آ گیا تھا کیوں کہ ہماری سیدھ میں موجود دشمن کے تینوں مورچے خاموش ہو چکے تھے۔

سامنے اور بائیں جانب ایک آڑ سے گولیوں کی بوچھاڑ کا رخ مورچے کی چھت کی جانب ہو گیا تھا۔ یقیناً بلندی سے ہونے والا فائر دشمن کو بھی دکھائی دے گیا تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ ٹریسر گولیاں تھیں۔ ٹریسر گولی نال سے نکل کر جلتے ہوئے انگارے کی طرح ہدف تک جاتی ہے اور دور سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ایل ایم جی بیلٹ میں ہر پانچویں گولی ٹریسر ہوتی ہے۔ جو رات کے وقت فائرر کو گولیاں ہدف پر لگنے کی تصدیق کرتی ہیں تو مخالف کو بھی ہتھیار کی پوزیشن سے آگاہ کرتی ہیں۔

ہم نیچے دبک گئے تھے۔ جونہی دشمن کا فائر رکا سردار نے فوراً بٹ کو کندھے میں دبایا اور اسی جانب شست سادھ لی۔ لمحہ بھر بعد دشمن کی جانب سے ایک اور بوچھاڑ فائر ہوئی، مگر خان صاحب جوش میں آچکے تھے اور خان جب جوش میں آجائے تو جان لیتا ہے یا دیتا ہے، تیسری کوئی صورت نہیں ہوتی۔

''سردار نیچے ہوجاؤ۔ ..'' میں چیخا، مگر کان دھرے بغیر اس نے لبلبی دبائی اور انگلی تب ہٹائی جب اڑھائی سو گولیاں ہدف کے علاقے میں بکھر چکی تھیں۔ دشمن کا وہ مورچہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ میرے پاس گن کی بیرل تبدیل کرنے کا مخصوص دستانہ تو موجود نہیں تھا لیکن بیرل کو تبدیل کرنا ضروری تھا کیوں کہ اتنے لمبے چھٹے کے بعد بیرل انگارے کی طرح ہو گئی تھی۔

میں نے قمیص کے دامن سے ''بیرل کیچ'' کو دبا کر کھولا اور بیرل کو کھینچ کر مورچے کی چھت پر رکھ دیا۔ نئی بیرل چونکہ ٹھنڈی تھی اس لیے پکڑتے ہوئے کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

بیرل تبدیل کر کے میں نے نیا بیلٹ چڑھا دیا، اس اثناء میں فائرنگ ہلکی ہو گئی تھی۔

''اب یہ بھاگیں گے۔'' میں نے سردار کو ہوشیار کیا۔

''پٹھان سے پنگا لیا ہے، بھاگنا تو پڑے گا۔'' فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ ہدف ڈھونڈنے لگا۔ میں نے بھی شب دید عینک آنکھوں سے لگالی تھی۔ ایک دو ہیولے بھاگ کر ڈھلان اترتے نظر آئے، مگر ان کی خوش قسمتی میرے پاس صرف دیکھنے کی سہولت موجود تھی، ہتھیار سردار خان کے پاس تھا۔ اور اس کی کوشش تھی کہ دشمن اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکیں اس لیے وہ انھی مخصوص اہداف کے اطراف میں گن گھما کر چھوٹے چھوٹے چھٹے فائر کرتا رہا جہاں ہمارے اندازے میں دشمن کی لاشیں پڑی تھیں۔ دہشت گرد ہمیشہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی پہچان پوشیدہ رہے۔

جلد ہی ہماری فائرنگ یک طرفہ رہ گئی، دشمن کی طرف سے مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔ نائب صوبیدار اختر نے چند جوانوں کے ساتھ اگلے علاقے کی تلاشی کو جانا چاہا مگر پوسٹ کمانڈر کیپٹن حفیظ اللہ نیازی نے ''روشنی ہونے کا انتظار کرو۔'' کہہ کر منع کر دیا تھا۔ صبح صادق نمودار ہو گئی تھی۔ جلد ہی ملگجا اجالا ہو جانا تھا۔ فائرنگ رکنے کے بعد سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلے لڑائی کے جوش میں ہمیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

سردار کو وہیں رکنے کا کہہ کر میں کمرے سے گرم چادریں اٹھا لایا، باقی جوان بھی مورچوں میں ڈٹے ہوئے تھے۔ سرحدوں پر تعینات فوجیوں کی زندگی میں گولیوں کی ''تڑتڑ'' اور توپوں کی گھن گرج روزمرہ کا معمول ہے۔ تربیت یافتہ فوجی اور عام انسان میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے کہ تربیت یافتہ جوان کے اعصاب بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مسلسل مخصوص حالات میں رہ کر زندگی گزارنے سے مرنے کا ڈر اور خوف اس کے دل میں اتنا نہیں ہوتا جتنا عام آدمی کے دل میں ہوتا ہے۔ اگر عام آدمی بہت زیادہ دلیر، نڈر اور مضبوط اعصاب کا ہو تب بھی ایسے حالات میں حوصلہ چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ ایسے ماحول میں زندگی گزارنا کہ راستے پر چلتے ہوئے IED پھٹنے کا خطرہ ہو، بیت الخلا اور غسل خانے میں جاتے وقت دشمن کے سنائپر کا اندیشہ ہو، کھانا کھاتے ہوئے دشمن کے راکٹوں کی فکر ہو اور سوتے ہوئے دشمن کے حملے کا ڈر رہے۔ یہ تربیت یافتہ سپاہی ہی برداشت کر سکتا ہے۔

دوران لڑائی سردار کا مزاق کرنا بعض قارئین کو ہضم نہیں ہوتا ہوگا۔ جب جان پر بنی ہو تو ہنسی مذاق کرنا عجیب لگتا ہے لیکن یقین مانیں اس سے ناگفتہ بہ صورت حال میں بھی میں نے اپنے ساتھیوں کو قہقہے لگاتے اور ایک دوسرے کو چھیڑتے دیکھا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک انسان مختصر عرصے تک تو اپنی فطرت سے لڑ سکتا ہے لیکن جب مسلسل

حملہ کرنا چاہ۔"

میں نے حیرانی ظاہر کی۔"جھوٹ مت بولو۔اس مقصد کو چھوٹا سا حملہ ہی کافی تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے سردار کو درد کش ٹیکہ بنانے کا اشارہ کیا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سردار نے ٹیکہ تیار کیا اور اس کے بازو میں لگا دیا۔

میری بات کا جواب اس نے نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے ڈرانے کی کامیاب کوشش کی۔

"اگر چاہتے ہو کہ تمھاری جان بچائی جائے تو تعاون کرو، ورنہ کسی دشمن پر دوائیاں اور وقت ضائع کرنے کا ہمیں کوئی شوق نہیں ہے۔"

وہ بہ مشکل زبان ہلانے لگا، اس کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ ملک گل بدین خان، سردار فیروز خان، کمانڈر عدیل جان اور کمانڈر رحمین خان کی گزشتہ ہفتے بانک ٹاپ پر بیٹھک ہوئی۔ یوں تو ان کی آپس میں نہیں بنتی تھی، لیکن انھیں انڈین ایجنسی را کے ایک میجر نے اکٹھا ہونے پر مجبور کیا۔ اس نے کیو بے ٹاپ سلسلے کی تین پوسٹوں 9,8,7 پر قبضے کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ یہ تینوں پوسٹیں قریب قریب واقع تھیں۔ سات اور آٹھ ساتھ اور نو ان دونوں کے درمیان اور پیچھے کو ہٹ کر تھی۔ (ویسے تو کیو بے ٹاپ کی پوری دس پوسٹیں ہیں جو ایک قطار میں موجود ہیں۔ ان کے ساتھ شمال کی جانب متصل چپاپوسٹوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا یعنی چپاون، چپاٹو وغیرہ) میجر نے انھیں باور کرایا کہ ان پوسٹوں پر قبضہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ چاروں کمانڈروں کے لشکر ساتھ مل کر کام کریں۔ اس مقصد کو "را" کے میجر نے بڑی رقم کی پیش کش کی تھی۔ اور آج منصوبے پر عمل کرنے کی شروعات ہو گئی تھی۔ اس کارروائی کا مقصد واقعی اپنے ساتھیوں کو سرحد عبور کرانا تھا، تاکہ کیو بے ٹاپ کی تین پوسٹوں پر دونوں اطراف سے حملہ کیا جا سکے۔

"سردار یہ کمزوری محسوس کر رہا ہے، ڈرپ بھی تیار کرو۔" میں سردار کو مخاطب ہوا۔ جان بچانے کے لالچ میں وہ بڑی اہم معلومات اگل رہا تھا۔ کیپٹن حفیظ اللہ نیازی بھی ہمارے ساتھ ہی موجود تھا۔ زخمی کی باتوں نے اس کے کان بھی کھڑے کر دیے تھے۔

سردار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ڈرپ تیار کرنے لگا۔ سنائپر کورس کے بعد عملی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہمیں چند ہفتوں کا ابتدائی طبی امداد کا کورس لازماً کرایا جاتا ہے۔ اور ایک سنائپر کو ابتدائی طبی امداد کے بارے جاننا کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔

اس کی آنکھیں نقاہت سے بند ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "کک کمانڈر شیر گل، میں کمانڈر عدیل کا دست راست ہوں۔"

میں نے اگلا سوال کیا۔ "تینوں پوسٹوں پر ایک ساتھ حملہ کیا جائے گا یا علیحدہ علیحدہ؟"

وہ بہ مشکل بولا۔ "اکٹھے ...."

میں نے بے صبری سے پوچھا۔ "کب؟" اس کی حالت کھلی ہوا میں رکھے چراغ جیسی تھی۔ وہ چند ہی لمحوں کا مہمان نظر آ رہا تھا اور اس کے ہلاک ہونے سے پہلے جتنی معلومات اگلوا لیتا غنیمت تھا۔

کیپٹن صاحب نے دھیرے سے کہا۔ "اسے سنبھلنے کا موقع دو۔"

میں نے کیپٹن صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی مگر وہ خاموش رہا تھا۔

میں باآواز بلند بولا۔ "سردار ڈرپ میں "اسپیشل سیونگ لیکوئڈ انجکشن" ملاؤ تاکہ اس کی جان یقینی طور پر بچائی جا

گے ''

سردار نے فوراً کہا۔ ''آپ کے کہنے سے پہلے ملا دیا ہے، لیکن اسے جگا کر رکھو، اگر بے ہوش ہو گیا تو شاید انجکشن بے کار جائے۔'' اس نے سٹینڈ قریب کر کے اس میں ڈرپ لٹکائی اور زخمی کے تندرست ہاتھ میں سوئی لگا دی۔

میں نے اسے ہلایا۔ ''شیر دل ہوش میں رہو، ہم تمھاری جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

اس نے آنکھیں کھولیں، عجیب ویرانی اور خالی پن نظر آ رہا تھا۔ اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''تم نے کیا بتایا حملہ کب ہو گا؟''

''م میں ہوں '' اس کی آنکھیں دوبارہ بند ہو گئی تھیں۔

''شیر دل خان ہوش میں آؤ۔'' میں نے اسے جھنجوڑا۔

''ہوں ہاں '' اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر اذیت جیسے ثبت ہو گئی تھی۔

''مجھ سے باتیں کرو تا کہ تمھاری جان بچائی جا سکے۔''

وہ ہکلایا۔ ''ک ک کر رہا ہوں ''

''بتاؤ حملہ کب ہو گا ؟'' میں نے سوال دہرایا۔

''ج ج ج آ آ '' دو تین ہچکیاں لے کر اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔

کیپٹن حفیظ اللہ نیازی نے منہ بنایا۔ ''تمھارا 'اسپیشل سیرم لیکوئڈ انجکشن' تو کسی کام نہ آیا۔''

میں ہنسا۔ ''سر! ہم اسے تسلی دے کر کچھ اگلوانے کی کوشش میں تھے ورنہ ہم ڈاکٹر ہیں اور نہ ایسا کوئی انجکشن ہے۔''

کیپٹن حفیظ خوش دلی سے ہنسا۔ ''مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''سر! ہم نے یہ معلومات میجر نعیم تک پہنچانا ہے، آپ بھی بٹالین کمانڈر کو مطلع کر دیں۔''

وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

—●—

سہ پہر ڈھلے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے کیو آر ایف کی گاڑیاں دہشت گردوں کی لاشیں لینے پہنچ گئی تھیں۔ بٹالین کمانڈر اور سیکنڈ ان کمانڈ بھی ساتھ تھے۔ کیو آر ایف کی گاڑیاں تو واپس چلی گئیں البتہ بٹالین کمانڈر عارف عالم اور سیکنڈ ان کمانڈ میجر فیصل وہیں رہ گئے تھے۔ چائے وغیرہ پی کر انھوں نے ہمیں بلا لیا۔ کیپٹن صاحب کے بنکر میں کمانڈنگ آفیسر ان کی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ہم نے پلاسٹک کی کرسیاں سنبھال لی تھیں۔ اس علاقے میں رہائشی بنکر ہی کو دفتر کے طور پر استعمال کیا جاتا اور وہیں پر خصوصی نشست (اسپیشل کانفرنس) بھی ہوتی۔

عارف عالم صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''جوان! حفیظ صاحب مجھے تفصیل بتا چکا ہے، کیا تمھارے پاس کچھ اور بتانے کو ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سب کچھ کیپٹن صاحب کے سامنے ہی پیش آیا تھا۔''

انھوں نے اگلا سوال پوچھا۔ ''کیا خیال ہے مرنے والا دہشت گرد، جمعہ کہنا چاہتا تھا یا جمعرات؟''

سردار بولا۔ ''سر! یقین تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ دہشت گردوں کی نفسیات کو مد نظر رکھیں تو ان کی زیادہ تر کارروائیاں جمعہ ہی کو ہوتی ہیں۔''

وہ تحسین آمیز نظروں سے سردار کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ''صحیح کہا، جوابی کارروائی کے بارے تمھاری کیا رائے ہے۔'' (یہاں ایک بات مد نظر رہے کہ لیفٹیننٹ کرنل بہت بڑا عہدہ ہے۔ اور اس رینک کا کوئی آفیسر ایک سپاہی یا حوالدار

سے مشاورت میں وقت ضائع نہیں کرتا لیکن وہاں ہماری نشست مختلف تھی۔ ہم کافی عرصہ سے [illegible] میں تھے، میجر نعیم کی زبانی ان کے کانوں تک ہمارے کارناموں کا تذکرہ پہنچ گیا تھا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہمیں اہمیت دینے پر مجبور تھے)

میں انکساری سے بولا۔ "یہ سوچنا تو آپ کا کام ہے سر! البتہ ہم ہر تعاون کو تیار ہیں۔"

"بریگیڈ کمانڈر سے میری تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے اس ضمن میں چند تجاویز بھی زیر غور آئی ہیں۔ طے ہوا ہے کہ بریگیڈ کی دوسری یونٹوں سے کچھ نفری منگوا کر پہلی فرصت میں ان تینوں پوسٹوں کے دفاع کو مضبوط کیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "سر! دشمن اپنی کچھ نفری سرحد پار لا چکا ہے، یقیناً پوسٹوں پر اضافی نفری کی آمد پر وہ چوکنا ہو جائیں گے اور منصوبے پر عمل درآمد روک دیں گے۔"

عارف عالم صاحب مسکرائے۔ "میجر فیصل نے بھی یہی مشورہ دیا تھا۔ لیکن ہمارا مقصد دشمن کا منصوبہ ناکام کرنا ہے چاہے لڑ کر ہو یا بغیر لڑے۔"

"سر! آپ بہتر سمجھتے ہیں، لیکن اساتذہ سے سنا ہے کہ دشمن کے منصوبے کا علم ہو جانا آدھی فتح ہوتی ہے اور میرا نہیں خیال اپنی برتری میں دشمن کو آدھے کا حصہ دار بنانا عقل مندی ہو گی۔"

"برخوردار! دشمن کا منصوبہ ناکام کرنا تمھاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"سر! دشمن کا منصوبہ ناکام نہیں موخر ہو گا۔ ہم اضافی نفری مستقل پاس نہیں رکھ سکتے۔ جونہی امدادی جوان لوٹے دشمن دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کرے گا اور تب ہمیں دشمن کے منصوبے کی کوئی سن گن نہیں ہو گی۔"

عارف عالم صاحب مسکرائے۔ "شاباش برخوردار! اورنگ زیب صاحب تمھاری کافی تعریف کر رہے تھے۔ اور تب مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "تو پھر کیا سوچا ہے سر؟"

وہ اطمینان سے بولے۔ "بتا تو دیا ہے۔"

میں نے مایوس لہجے میں پوچھا۔ "یعنی پوسٹوں پر اضافی نفری منگوانا ناگزیر ہے۔"

"ہاں۔" انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جونہی دشمن کو معلوم ہو گا کہ ہم تیار ہیں وہ حملہ موخر کر دے گا۔ اور یقیناً وہ اضافی نفری کی واپسی کا انتظار کرے گا، اس اثناء میں ہمارے چھاپہ مار دستے افغان نالہ میں ان کا شکار کھیلنے نکلیں گے۔ امید ہے ان کے اجتماع کو ہم بھرپور ضرب لگا کر اپنے فائدے میں استعمال کر سکیں گے۔"

ان کا جامع منصوبہ سن کر مجھے اپنے اندیشوں پر شرمندگی ہوئی تھی۔ "معذرت خواہ ہوں سر! آپ کی سوچ میرے گمان سے بہت آگے ہے۔"

وہ خوش دلی سے بولے۔ "تمھارا اختلاف کرنا اچھا لگا۔ حکمت کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ تمھارا بغیر تکرار کے متفق ہونا برا لگتا۔ اب میں یقین کر سکتا ہوں کہ اس سے بہتر منصوبہ فی الحال ہم میں سے کسی کے دماغ میں نہیں ہے۔"

"شکریہ سر!"

انھوں نے پوچھا۔ "تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

سردار نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا۔ "ہمیں آپ شانہ بشانہ پائیں گے۔"

عارف عالم صاحب نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "یقین تھا یہی سننے کو ملے گا۔"

میں خفیف لہجے میں بولا۔ "لیکن ہمیں نعیم صاحب کی اجازت کی ضرورت پڑے گی سر۔" ہم چونکہ براہ راست میجر نعیم کے ماتحت تھے اور وہاں ہماری موجودگی کا مقصد کچھ اور تھا اس لیے مجھے صاف گوئی سے کام لینا پڑا تھا۔

مجھے گھورتے ہوئے عارف عالم صاحب مسکرائے۔ "کرنل اورنگ زیب تمھاری بہادری کے قصے سناتے نہیں تھکتے۔"

میں انکساری سے بولا۔ "وقت آنے پر ان شاء اللہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے سر! البتہ قانونی تقاضوں کو آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔"

عارف عالم صاحب نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "اگر میجر نعیم نہ مانا۔"

میں اطمینان سے بولا۔ "پھر آپ کو احسان مند کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔"

ان کا زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ "اب لگا کہ ایس ایس سے بات کر رہا ہوں۔"

میجر فیصل اور کیپٹن حنیفہ بھی مسکرا دیے تھے۔

عارف عالم صاحب خوشگوار لہجے میں بولے۔ "بہرحال میجر نعیم کی طرف سے تمھیں باقاعدہ حکم مل جائے گا کیوں کہ میرے ناتواں کندھے اتنے بھاری احسان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

میں لطف سے مسکرا دیا۔

عارف عالم صاحب سنجیدہ ہوئے۔ "تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دشمن کے منصوبے کے بارے آئی ایس آئی کی رپورٹ ہمارے پاس ہفتہ بھر پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ دن کا تعین کیے بغیر انھوں نے خطرے کی نشان دہی کر دی تھی۔ اور اب الحمداللہ بات مزید کھل گئی ہے۔" (پاکستان آئی ایس آئی کی جڑیں دشمنوں کے بہت اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت سے خطرات کی نشان دہی یہ خاموش مجاہد پہلے سے کر دیتے ہیں اور انھی معلومات کی بدولت ایسے ہزاروں حادثات سے بروقت نبٹا گیا ہے جو بڑی تباہی کا سبب بن سکتے تھے۔ البتہ ان کی خبر عوام تک نہیں پہنچ پاتی۔ اور ایسے کئی مجاہد گمنامی کی موت کو گلے لگا کر دھرتی اوڑھ چکے ہیں جن کے بارے ان کے گھر والے بھی نہیں جانتے کہ وطن خاطر وہ کیا قربانی دے چکے ہیں)

میں نے پوچھا۔ "سر! کارروائی کی ترتیب کیا ہوگی؟"

"آج سوموار ہے، پرسوں تک اضافی نفری ہمارے پاس پہنچ جائے گی۔ کل بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں بریگیڈ کی یونٹوں کے کمانڈنگ آفیسرز جمع ہو رہے ہیں تب حتمی منصوبہ بنایا جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے نشست چھوڑ دی، باقی سب بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ عارف عالم صاحب اور میجر فیصل کو گاڑیوں میں بٹھا کر ہم نے الوداعی سلیوٹ کیا اور کمرے میں لوٹ آئے۔

—●—

جمعرات و جمعہ کی شب ہم نہایت چوکس رہے، لیکن دشمن کو اضافی نفری کی خبر پہنچ چکی تھی، تبھی انھوں نے حملے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ ہفتے کی شب میں اور سردار آگے جانے کو تیار تھے۔ موسم کے تیور سہ پہر ہی سے بدلے بدلے تھے اور ایسا موسم چھپ کر سفر کرنے کو نہایت موزوں ہوتا ہے۔ ہم باقی جوانوں سے پہلے روانہ ہو رہے تھے کیوں کہ ہمیں افغان نالے میں کسی مناسب مقام پر کمین گاہ بنا کر چھپنا تھا۔ (سنائپر جگہ کی مناسبت سے مختلف اقسام کی کمین گاہیں بناتے ہیں۔ ان میں زمین کھود کر کھوہ بنانے سے مضبوط مورچہ اور درخت کے اوپر مچان بنانا شامل ہیں۔ ہر کمین گاہ کی علیحدہ خصوصیات اور بنانے کا طریقہ جدا ہے۔ اگر ان پر تفصیل سے روشنی ڈالوں تو یہ ناول سے زیادہ دری کتاب بن جائے گی۔ البتہ تھوڑی بہت وضاحت اس لیے کر دیتا ہوں کہ قارئین کو سمجھنے میں آسانی رہے)

اگلے دن چھاپہ مار دستوں نے آنا تھا۔ ہمارا کام سنائپنگ ہی تھا۔ ہمارے علاوہ بھی سنائپرز کی دو ٹولیوں نے روانہ ہونا تھا۔ ایک جوڑی تو الیاس اور شہزاد کی تھی جس نے "کے ٹو فائیو" سے آنا تھا۔ ایک جوڑی دوسری یونٹ کے سنائپرز کی

تھی ان سے میں نا واقف تھا۔ البتہ یہ معلوم تھا کہ وہ "کیو بے ٹمین" پہ موجود تھے۔ باقی سنائپرز کا ہم سے رابطہ نہیں تھا۔ انھیں اپنی پوسٹوں ہی سے احکام ملتے تھے۔

میں نے رینج ماسٹر کو پلاسٹک کے مضبوط بیگ میں ڈال کر کپڑے کے تھیلے میں ڈال لیا تھا۔ سردار کے پاس ڈریگنوو سنائپر رائفل اور ترکی کا ایجاد کردہ نائین ایم ایم پستول جبکہ میرے پاس سائلنسر لگا بریٹا ایم نائینٹی ٹو (Beretta M 92) موجود تھا۔ اٹلی کا ایجاد کردہ نیم خودکار (سیمی آٹومیٹک) خوب صورت پستول۔ اس کی میگزین میں پندرہ گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ کارکردگی میں یہ کسی بھی طرح گلاک سے کم نہیں ہے۔ البتہ وزن میں گلاک سے پاؤ بھر اور لمبائی میں انچ بھر زیادہ ہے۔ گولی دونوں میں نائین ایم ایم ہی پڑتی ہے۔ پاکستان آرمی میں عام طور پر گلاک اور بریٹا استعمال نہیں ہوتے۔ لیکن میرے پاس گلاک سیون ٹین، گلاک ٹوئنٹی اور گلاک نائنٹین کے علاوہ بریٹا ایم نائینٹی ٹو اور بریٹا نائنٹی تھری موجود تھے۔ یہ تمام مختلف معرکوں میں میرے ہاتھ لگے تھے۔ سنائپر رائفلوں میں ہیرٹ ایم 107 جو اعلیٰ معیار کی سنائپر رائفل ہے وہ یونٹ کے کوت (وہ کمرہ جہاں یونٹ کے ہتھیار رکھے جاتے ہیں) میں میرے نام سے پڑی تھی۔ اور بغیر میری اجازت وہ کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ وہ میں گھر نہیں لے جا سکتا تھا کہ پاکستان آرمی کا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ شاید اس کا لائسنس بنتا ہو لیکن اس بارے مجھے معلومات نہیں اور نہ کبھی پوچھنے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ دوران آپریشن دہشت گردوں کے جو ہتھیار پاک فوج کے ہتھے چڑھتے ہیں وہ براہ راست فوج کی تحویل میں جاتے ہیں۔ ان کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔ جی ایچ کیو تک اس کی رپورٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد ہائی کمانڈ ہی ان ہتھیاروں کے بارے فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن میرا رستہ جدا تھا۔ میں نے یہ ہتھیار آرمی کے کسی عام آپریشن میں حاصل نہیں کیے تھے۔ یہ بیرون ملک کے معرکوں میں میرے ہاتھ آئے تھے اور ان کے بارے میں نے زبانی طور پر تو اپنے سینئرز کو آگاہ کیا تھا، باقاعدہ تحریری رپورٹ میں ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اور گلاک نائنٹین کے علاوہ تمام ہتھیار یونٹ کے کوت ہی میں رکھے تھے۔ گلاک نائنٹین مع عمدہ سائلنسر البتہ پلوشے نے ضد کر کے اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ اور وہ ایسی لاڈلی ہے کہ ضد منوانا جانتی ہے۔

شام سے پہلے ہی اچھا خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔ جولائی میں بھی یہاں موسم خاصا خوشگوار ہوتا ہے کہ رات کو کمبل لپیٹنا پڑتا ہے۔ بارش بھی بہت زیادہ ہوتی ہے اور بارش کی زیادتی کی وجہ ہی سے موسم خوشگوار رہتا ہے۔

عشاء کی نماز پوسٹ پر پڑھ کر ہم محتاط انداز میں نکلے۔ براہ راست غربی جانب اترنے کے بجائے ہم نے فرلانگ بھر شمال کی جانب سفر کیا اور پھر ترچھا نشیب میں اترنے لگے۔ ہمارا رخ شمال مغرب کو تھا۔ ہوا چل رہی تھی، گاہے گاہے بوندا باندی بھی ہونے لگتی۔ ہم سادہ کپڑوں میں تھے، کیوں کہ وردی کی وجہ سے دوری ہی سے ہماری شناخت ہو جاتی۔ افغان نالہ غیر مذکورہ علاقہ تھا۔

(غیر مذکورہ علاقے سے مراد دو ملکوں کے درمیان وہ خالی جگہ جس پر کسی ملک کا قبضہ نہ ہو اسے انگریزی میں "نو مین لینڈ" کہتے ہیں اسی وجہ سے دہشت گردوں کے خلاف پاکستان آرمی وہاں بیلی کاپٹر وغیرہ بھی استعمال نہیں کر سکتی تھی کہ پھر افغان حکومت کے ہاتھ احتجاج کرنے کا بہانہ آ جاتا)

رینج ماسٹر میرے پاس تھی جبکہ سردار کے جھولے میں سنائپر ٹیم کا دوسرا ضروری ساز و سامان تھا۔ غالباً پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ سنائپر ٹیم کے پاس: نقشہ، قطب نما (کمپاس)، دوربین، ٹارچ، رسی، ریڈیو (وائرلیس سیٹ)، ہوا پیما (یعنی ونڈ میٹر جس سے ہوا کی رفتار ناپی جاتی ہے) اضافی ایمونیشن، لیزر رینج فائنڈر (فاصلہ ناپنے کا آلہ) شب دید عینک، جی پی ایس (گلوبل پوزیشننگ سسٹم) ماچس یا لائیٹر، چاقو، چھوٹے دستے کی کلہاڑی، سپاٹر اسکوپ (اس سے بھی دوربین کا کام

لیا جاتا ہے)، گھڑی، خشک راشن، وستی بم وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ سنائپر ہمیشہ جوڑیوں میں کام کرتے ہیں، ایک کو سپاٹر اور دوسرے کو شوٹر کہتے ہیں۔ "سپاٹر" ٹیم لیڈر ہوتا ہے جبکہ "شوٹر" فائرر۔

بہ مشکل نصف اترائی تک پہنچے تھے کہ ایک دم بارش کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ مجبوراً ہمیں پانی بلے (رین کوٹ) پہننا پڑے۔ سردار نے ڈریگنووکی نال کا رخ زمین کی طرف کر دیا تھا تاکہ نال میں پانی نہ چلا جائے۔ ایسا ہونے کی صورت میں فائر کی درستی میں فرق آ سکتا تھا اور گیلا ہونے سے نال کے زنگ پکڑنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔

(کوئی بھی ہتھیار یا اس کا ایمونیشن گیلا ہونے سے ناکارہ نہیں ہوتا۔ ہر دو کو سکھا کر استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ گیلا ہتھیار بھی فائر کر سکتا ہے، بس فائر کی درستی میں فرق پڑتا ہے۔ مطلب ایمونیشن اگر گیلا ہو تو گولیاں ہدف پر اونچی اور بکھری ہوئی لگیں گی۔ یاد رہے ہتھیار کوئی الیکٹرک مشین نہیں ہے کہ پانی سے ناکارہ ہو جائے)

بارش کی رفتار رفتہ رفتہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہم نشیب میں اتر رہے تھے، تیز بارش کی وجہ سے پھسلن بڑھ گئی تھی۔ آسمانی بجلی بھی مسلسل چمک رہی تھی۔ ان علاقوں میں یہ بھی بلائے ناگہانی ہے۔ اس سے بچنے کی احتیاطوں میں پانی کے ذخائر سے دور رہنا، درختوں کے نیچے پناہ نہ لینا خاص کر زیادہ بلند درختوں سے بچنا اور دھاتی اشیاء کے اتصال سے بچنا شامل ہے۔

بہتر یہی ہوتا ہے کہ انسان کوئی چھت ڈھونڈے، مگر اس وقت کوئی جائے پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہتھیار کو بھی خود سے دور کرنا ممکن نہ تھا۔ بس اللہ پاک کے بھروسے پر تھے۔ عملی زندگی میں بہت سی احتیاطوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ لکھائی پڑھائی کچھ اور کہتی ہے، تجربات دوسری راہ دکھاتے ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ تجربے اور عمل سے بڑا کوئی علم نہیں ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ عملی زندگی میں عموماً کاغذی علم کے الٹ دیکھنے کو ملا ہے۔ خاص کر عملی سنائپر کی زندگی تو نئے والو کھے واقعات کی تجربہ گاہ ہے۔ ایک سنائپر، جتنے امکان اس کے علم میں ہوں گے ان کا سدباب کر کے دشمن کی راہ میں گھات لگائے بیٹھا ہو گا اور دشمن کے قریب پہنچنے پر کسی نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔ ایسی صورت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا نا کامی کہلاتا ہے اور کچھ کرنے کا مطلب موت کو گلے لگانا ہوتا ہے۔

سردار نے مشورہ دیا۔ "لڑھکنے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ فی الحال رک جائیں۔"

مجھے متفق ہونا پڑا۔ کیوں کہ عام حالات میں بھی ڈھلان اترتے ہوئے گرنے کا بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے، اس وقت تو بارش ہو رہی تھی۔ اور پھر گہری تاریکی سونے پہ سہاگا تھی۔ ہم تاریخ جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔

پانی بلے ایک حد تک بارش سے بچاؤ مہیا کرتے ہیں، مسلسل تیز بارش کے سامنے پانی بلے بھی عاجز آ جاتے ہیں۔

وہاں شاہ بلوط کے درختوں کی بہتات تھی۔ اس سدابہار درخت کے پتے کافی گھنے ہوتے ہیں۔ آسمانی بجلی سے رہنمائی لے کر ہم ایک گھنے درخت کے نیچے ہو گئے۔ رینج ماسٹر کا جھولا میں نے درخت کے تنے پر رکھ دیا تھا کہ اتنی وزنی رائفل کو کندھوں پر اٹھا کر رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ رینج ماسٹر، عام رائفل کی نسبت کافی وزنی ہوتی ہے۔ ایک کلاشن کا وزن قریباً چار کلوگرام ہوتا ہے جبکہ رینج ماسٹر کا وزن سترہ کلوگرام ہوتا ہے۔ غیر فوجی حضرات کو سترہ کلوگرام حقیر وزن لگے گا کہ دس سال کا بچہ بھی اتنا وزن اٹھا سکتا ہے۔ لیکن پتا تب چلتا ہے جب اتنا بوجھ کندھوں پر ہو اور مسلسل چلنا پڑے۔ سنائپر ہونے کے ناتے میرے نزدیک رینج ماسٹر کی سب سے بڑی خامی اس کا وزنی ہونا ہے۔ گو کارکردگی کے مقابلے یہ وزن کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن، سنائپر کو لمبی مسافت طے کر کے دشمن کے علاقے میں جانا ہوتا ہے، مختلف حالات میں اسے اپنی رفتار کم زیادہ رکھنا پڑتی ہے، ایسی صورت میں آدھا من وزن بہت معنی رکھتا ہے۔

بارش رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ سردار خان نے بھی جھولا تنے پر رکھا اور درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"یار! ایسی بارش میں مریم (بیٹی زوجہ) کی یاد اور زور پکڑ لیتی ہے۔" اس کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔
اس کے ساتھ ہی نشست سنبھالتے ہوئے میں اطمینان سے بولا۔ "مجھے تو ہر موسم، ہر حالت، ہر وقت یکساں یاد آتی ہے۔"

اس نے منہ بنایا۔ "براہ مہربانی یہ جھوٹ صرف میری بہن کے سامنے بولا کرو۔"
میں لاپرواہی سے بولا۔ "پلوشے کے سامنے تو میں نے کبھی اظہار نہیں کیا۔"
"جتنا تم ڈرتے ہوئے بیوی سے شاید ہی کوئی ڈرتا ہوگا۔"
میں ترکی بہ ترکی بولا۔ "ڈرتے تم ہو، میں ڈرتا تو دوسری شادی نہ کرتا۔"
وہ استہزائی انداز میں بولا۔ "جیسے مجھے معلوم ہی نہیں کہ تم نے دوسری شادی کن حالات میں کی تھی۔"
"جیسے بھی کی ہو، اگر ڈرتا تو پلوشے کی واپسی پر اسے طلاق دے دیتا تم میں اگر جرأت ہے تو دوسری شادی کر کے دکھاؤ۔"
وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "میری بھی دوسری ہی شادی ہے جناب۔"
میں نے اکسایا۔ "پہلی بیوی کے ہوتے دوسری شادی کرو۔"
وہ معصومیت سے بولا۔ "یار! اگر میری موت کے خواہاں ہو تو خود ہی گولی مار دو، مریم کے ہاتھوں مروا کر کیوں بے عزت کرانا چاہتے ہو۔"
میں نے چھاتی چوڑی کی۔ "میں تو تیسری شادی کرنے والا ہوں۔"
اس نے منہ بنایا۔ "یہ سپنے نیند میں اچھے لگتے ہیں۔"
میں نے قہقہہ لگایا۔
سردار نے ٹوکا۔ "ہی ہی نہ کرو تم بیٹھک میں نہیں بیٹھے۔"
ہنسی ایک دم میرے ہونٹوں سے غائب ہو گئی تھی۔ طوفانی بارش میں بھی ہم دشمن کے خطرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ فوجیوں کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے، آگ و خون کے دریا میں تیرتے ہوئے پھول و شبنم کا موضوع چھیڑ رکھتے ہیں۔ گولیوں و بارود کے دھماکوں میں ساز و باجے کی آواز سنتے ہیں۔ موت کے سفر میں زندگی کی باتیں کرتے ہیں، ہجر و جدائی کی ترشی کو وصال کے میٹھے سپنوں سے سہارتے ہیں۔ ہم نے اپنے پیاروں کا ذکر چھیڑ کر آنے والے جاں گسل لمحات کو عارضی طور پر بھلانے کی کوشش میں تھے۔ استاد محترم تصور صاحب فرمایا کرتے: "سنائپر کا ہر مشن آخری مشن ہوتا ہے اور سنائپر کی بقا موت سے منسلک ہے، مارے گا تو بچے گا نہ مار سکا تو مرے گا۔"
اور ہمارا حالیہ مشن اس لیے بھی مشکل تھا کہ ہدف کوئی مخصوص شخصیت نہیں انسان، مذہب اور وطن دشمن عناصر کا ٹولہ تھا۔ اور افغان بالہ میں ان لوگوں کی ٹولیاں مردار پر اکٹھا ہونے والے گدھوں کی طرح جمع تھیں۔ شاید ہی کوئی اہم ٹیکری ہمیں خالی ملتی۔
سردار نے اندیشہ ظاہر کیا۔ "ممکن ہے کہ دشمن بھی موسم کا فائدہ اٹھا کر حملے کا قصد کرے۔"
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لگرز کرد کمانڈنگ آفیسر نے نصف نفری کو جاگتے رہنے کا حکم دیا ہے۔ جوان چوکس ہیں دہشت گردوں نے ایسی جرأت کی بھی تو منہ کی کھائیں گے۔"
"بارش رکتی نظر نہیں آتی یہیں بیٹھے رہے تو طلوع آفتاب کے بعد ہی حرکت کر سکیں گے اور ہمیں آج کی رات ہی مناسب ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے۔"

میں چڑ کر بولا۔ ”تم نے خود ہی رکنے کو کہا تھا۔“

”ایک سپاہی کو حوالدار سے زبان لڑانے کی جرأت نہیں ہونا چاہیے۔ اور یوں بھی تمہاری ناقص عقل میں میرے فیصلے نہیں آ سکتے۔“

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”قیامت کی نشانیوں میں پٹھانوں کی عقل مندی کا دعویٰ بھی شامل ہے۔“

”تمھیں کیا پتا خان کیا کیا کر سکتے ہیں۔“

میں برجستہ بولا۔ ”بات کرنے کی نہیں سوچنے کی ہو رہی ہے۔“

وہ بگڑ کر بولا۔ ”تمھارا خیال ہے پٹھانوں کے پاس دماغ نہیں ہوتا۔“

میں ہنسا۔ ”ہوتا ہوگا، استعمال دل ہی کو کرتے ہیں۔“

”مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”مسلسل بیٹھے رہے تو سردی سے جم جائیں گے۔“

سردی تو مجھے بھی لگ رہی تھی۔ اور میں متفق بھی تھا، پانی پلہ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش کا پانی پرشور آواز میں نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ جھوٹے اٹھا کر ہم نے قدم بڑھا دیے۔ ڈھلان اترنے تک ہمیں نہایت احتیاط کرنا تھی۔ ہمیں آڑا ترچھا (زگ زیگ) چل کر سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ جنھیں پہاڑوں میں سفر کرنے کا تجربہ ہو چکا ہو وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ بلند ہونے یا نشیب میں اترنے کا آسان اور محتاط طریقہ یہی ہے۔ اور اس وقت بارش کی وجہ سے ہمیں زیادہ احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ گہری تاریکی چھائی تھی، ٹارچ بھی نہیں جلا سکتے تھے کہ روشنی بہت دور سے نظر آ جاتی ہے۔

تھوڑا فاصلہ طے کرتے ہی جھاڑیوں اور کم بلند درختوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بجلی کی چمک میں جھاڑیاں نشیب تک پھیلی نظر آئیں۔ جھاڑیاں ہمیں نیچے اترنے میں سہولت دے سکتی تھیں، بغیر کسی مشورے کے ہم جھاڑیوں کا سہارا لے کر تیزی سے نشیب میں اترنے لگے۔ ٹہنیوں کو پکڑ کر چلنے سے پھسلنے کا خطرہ بالکل نہیں رہتا۔

نیچے پہنچنے سے چند گز پہلے جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہم رینگنے کی رفتار سے تہہ تک پہنچے۔ پانی کا بہاؤ نالے کے درمیان میں تھا۔ تیز بارش کے وقت نالوں میں پانی کی مقدار غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں نالوں کو عبور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ الفان نالے کی شکل دریا جیسی نہیں تھی کہ تمام پہاڑوں کا پانی اکٹھا بہتا۔ وہاں کئی چھوٹے چھوٹے نالے تھے جن کے بہاؤ کا رخ جنوب سے شمال کی جانب تھا۔ اور چھوٹے نالوں میں بھی اس وقت اچھا خاصا پانی بہہ رہا تھا۔ ہم نے کالے رنگ کے سپورٹس شوز پہنے تھے جو پہاڑی علاقے میں کافی کارآمد ہوتے ہیں۔ دونوں کے بوٹ اس وقت پانی سے شرابور تھے۔ ڈھلوان ختم ہوتے ہی پھسلنے کا خطرہ پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ البتہ چھوٹے بڑے پتھروں سے الجھ کر گرنے یا پاؤں میں موچ آنے کا خطرہ باقی تھا۔ چاندنی رات یا ٹارچ کی روشنی میں حرکت کرنے میں صرف تھکن ہی رکاوٹ ڈالتی ہے اور اندھیرے میں اس کے علاوہ بھی کئی مسائل درپیش ہوتے ہیں۔

سردار نے کپکپاتے ہوئے دہائی دی۔ ”راجے صاحب! دشمن کا تو پتا نہیں لیکن آج سردی سے نہیں بچنے والے۔“

”اچھا ہے ایک پٹھان تو کم ہوگا پاکستان سے۔“

وہ ہنسا۔ ”پنجابی بھی بچے گا نہیں، تو حساب برابر ہوا۔“

میں نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو کوئی پناہ ڈھونڈنا پڑے گی۔“

ہم نالے میں آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑا سا چلتے ہی میرے کانوں میں باتوں کی ہلکی سی آواز آئی۔ ایک دم سردار کا ہاتھ پکڑ کر میں نے ہلکے سے دبا دیا۔ قدم روک کر ہم نے آواز کی سمت کان لگا لیے۔ اسی وقت ٹارچ کی ہلکی سی روشنی بھی دکھائی دی تھی۔ وہ ایک ٹیکری کے عقب سے نمودار ہو رہے تھے۔

بجلی تیز چمکی اور ہم نے سرعت سے قریبی جھاڑی کی آڑ پکڑ لی۔ لمحہ بھر بعد بادل گرجا۔ "گڑ گڑ گڑ" کی آواز ختم ہوتے ہی نالے کا شور اور بوندوں کی۔ "ٹپ ٹپ" سنائی دینے لگی۔ اسی اثناء میں دوبارہ آواز ابھری۔ جو اس بار پہلے سے واضح تھی۔ لیکن الفاظ کی سمجھ کچھ نہیں آ رہی تھی۔ چند الفاظ جو میرے کانوں میں پڑے ان سے اندازہ ہوا وہ پشتو بول رہے تھے۔ ان کا رخ ہماری ہی طرف تھا کیونکہ آواز رفتہ رفتہ واضح ہو رہی تھی۔ دو ٹارچوں کی روشنی سے اندازہ ہوا کہ دو ہی آدمی ہیں۔

ان کے مزید قریب آنے پر الفاظ کی سمجھ آنے لگی تھی۔ "اتنا تیز نہ چلو، میں تھک گیا ہوں۔"

دوسری آواز نے تسلی دی۔ "تھوڑا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔" وہ رفتہ رفتہ ہم سے قریب آ رہے تھے۔

پہلا شخص بولا۔ "ملک گل بھی ہی اتنا بڑا کمانڈر ہے اور اس کے پاس اپنے آدمی کے علاج کرنے کو ڈاکٹر موجود نہیں ہے۔"

"اس کے زیادہ تر لشکری پار چلے گئے ہیں۔ تبھی اسے کمانڈر رحمدل کی مدد لینا پڑی۔"

پہلے نے طنزاً سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "کمانڈر خود تو گرم بستر میں لیٹا ہے اور بدبختی تو ہماری ہے جو اس موسم میں خوار ہوتے پھر رہے ہیں۔"

دوسرا کھلکھلا کر ہنسا۔ "تمھارا جانا تو لازمی تھا میں مفت میں خوار ہو رہا ہوں۔" وہ سامنے سے گزر کر پہاڑ کی بنیاد میں چلتے ہوئے شمال کی طرف بڑھنے لگے۔ دونوں نے سبز رنگ کے پانی پلے پہنے ہوئے تھے۔

سردار نے دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی۔ "ختم کر ان حرامزادوں کو کر دینا چاہیے۔" وہ دہشت گردوں کو اسی لقب سے یاد کرتا تھا۔ اور حقیقت تو یہی کہ وہ اس سے بھی غلیظ اور گھٹیا خطاب کے حق دار تھے۔

"چلو۔" میں رک سیک کا جھولا کندھوں سے اتار کر کھڑا ہو گیا۔ سردار نے بھی اپنا جھولا وہیں چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئے تھے اور اب ان کی ہماری جانب پیٹھ تھی۔ ٹارچ کی روشنی ہماری بہترین رہنمائی کر رہی تھی۔

سردار نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو۔" اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ مجھے ہی فائر کرنا پڑے گا۔ یوں بھی جب درست نشانے اور کامیاب فائر کرنے کی ضرورت ہوتی سردار مجھے ہی سونپ دیتا تھا۔

میں نے سائلنسر لگا ریوالور ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ البتہ پستول میں نے پانی سے بچانے کے لیے رکھا تھا کہ گیلا ہو کر پستول کی کارکردگی میں فرق نہ پڑ جائے۔ ہم نے ان کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ اچانک بجلی زور سے چمکی، اور مختصر لمحات کا فائدہ اٹھا کر میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا کیا چمک ختم ہونے تک ریوالور کی نال سے چند گرام سیسہ نکل کر ایک ناپاک وجود سے دھرتی کی جان چھڑا چکا تھا۔ سر میں لگنے والی گولی نے اسے چیخنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ بارش اور نالے کے شور نے اس کے ساتھی کے کانوں تک "ٹھک۔" کی آواز پہنچنے دی تھی۔ البتہ اس کے لڑکھڑا کر گرنے پر ساتھی نے۔ "سنبھل کر چلو۔" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ٹارچ کا رخ اس کی جانب موڑا مگر وہ نصیحتوں سے بہت دور جا چکا تھا۔ جب تک اسے ساتھی کی کھوپڑی میں کھلا روشن دان نظر آتا سردار ٹارچ جلا کر اسے روشنی کے حلقے میں لے چکا تھا۔

"اپنی کھوپڑی بچانے کو تمھیں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھنے ہوں گے۔"

"تت کون ہو تم" وہ ہکلا گیا تھا۔

"ملک الموت ہے۔"

سردار کی بات ختم ہونے تک ایک اور "ٹھک" ہوئی اور وہ چیخ مار کر نیچے گر گیا تھا۔ میں نے اس کی دائیں پنڈلی کو نشانہ بنایا تھا۔ اس نے کندھے سے کلاشن کوف لٹکائی ہوئی تھی، گرتے ساتھ اس کے ہاتھ کلاشن کوف کی طرف بڑھے مگر وہ فائر

سردار نے دونوں کی تلاشی لی۔ جیبوں سے انڈین رقم، آئی کام (وائرلیس سیٹ) اور ہتھیاروں کے علاوہ کوئی کام کی چیز برآمد نہ ہوئی۔ البتہ یاسین خان کے تھیلے میں ابتدائی طبی امداد کا ضروری سامان، دو تین قسم کے فورسپ (جسم سے گولی نکالنے کا چمٹی نما مخصوص آلہ) درد کش گولیاں، ٹیکے اور پٹیاں وغیرہ رکھی تھیں۔

لاشوں کو گھسیٹ کر ہم نے جھاڑیوں کے جھنڈ میں پھینکا اور کلاشن کوفوں کو پتھروں میں دبا دیا۔ ابتدائی طبی امداد کا تھیلا اور آئی کام سیٹ بھی ہم نے پاس رکھنا ضروری سمجھا تھا۔ ہمارے پاس اپنی پوسٹ سے ملاپ کو کینوڈ (وائرلیس سیٹ) موجود تھا۔ موبائل فون کی طرح وائرلیس سیٹ بھی مختلف کمپنیاں بناتی ہیں، جن میں کینوڈ، آئی کام، مٹرولا، ہیرس وغیرہ شامل ہیں۔ ان سیٹوں میں کنکشن کا رونا یا اس قسم کا کوئی بکھیڑا نہیں ہوتا۔ ہر کمپنی کے سیٹ مخصوص فریکوئنسی پر کام کرتے ہیں۔ اس لیے دوسری کمپنی کے وائرلیس سیٹ کے ساتھ ملاپ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ پہلے آرمی میں بڑے ریڈیو سیٹوں کا رواج تھا جو کافی وزنی ہوتے تھے البتہ ان کا ملاپ بھی لمبے فاصلوں تک ہو سکتا تھا۔ اب چھوٹے وائرلیس سیٹ آ گئے ہیں جنھیں ساتھ پھرانا نہایت آسان ہے لیکن ان کا ملاپ محدود فاصلے تک ممکن ہے۔ اب تو وزیرستان میں موبائل فون سروس کام کر رہی، اس سے پہلے عام لوگ بھی رشتہ داروں وغیرہ سے رابطے کو وائرلیس سیٹ خرید لیتے تھے۔

ضروری کارروائی کے بعد ہم جانے کو تیار تھے۔ ملک گل دین کے لشکریوں کا ٹھکانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یاسین خان سے اس متعلق ہمیں کافی کچھ معلوم ہوا تھا۔ پہاڑی کی بنیاد میں چلتے ہوئے آگے انٹرینٹ (انٹرینٹ نقشہ بینی کی اصطلاح میں ایک جگہ جو پہاڑ کے اندر کی طرف دبی ہوئی ہو۔ ایسی جگہ پہاڑ کے دو بازوؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ جبکہ پہاڑ کے بازو سے مراد وہ ڈھلوان ہے جو بتدریج نیچے ہوتے ہوتے زمین سے مل جائے) آتا تھا۔ اور وہیں ان کا ٹھکانہ تھا۔

اب ہم نے چار چیزیں جانی تھیں، یہیں کہ دشمن ہمارے متعلق غلط فہمی میں پڑتا تھا۔

ان کے ٹھکانے تک ہمیں ایک ادھ کلومیٹر فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ جلد ہی ہم انٹرینٹ تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں پہاڑی اندر کی طرف دبی ہوئی تھی۔ سو دو سو گز کے فاصلے پر روشنی نظر آ رہی تھی۔ بجلی چمکنے پر دو خیمے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے جھولے کے تسمے کندھے سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ جھولے یہیں چھوڑنا مناسب رہے گا۔''

سردار نے میری تقلید میں سستی نہیں کی تھی۔ جھولے جھاڑی کے نیچے رکھ کر ہم آگے بڑھ گئے۔ بارش اسی تسلسل سے جاری تھی۔ ہماری نگاہیں روشن خیموں پر تھیں۔ سامنے سے بھی ایک دو بار ٹارچ کا اشارہ دیا گیا۔ میں نے برچھے کے دستے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ''کوشش کروں گا کہ تمھیں فائر نہ کرنا پڑے۔ لیکن تیار رہنا۔''

وہ بے فکری سے بولا۔ ''خان ہر وقت تیار ہوتا ہے۔''

میں نے کارروائی کی ترتیب بتائی۔ ''تم ساتھ والے خیمے کا رخ کرنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' سردار نے کلاشن کوف تیاری حالت میں تھام لی تھی۔

چونکہ کچھ لوگ کلاشن کو کندھے پر لٹکانے کے بجائے ہاتھ میں اٹھانے کے عادی ہوتے ہیں اس لیے کسی کو سردار کی حرکت پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔

دونوں خیموں کے درمیان دو گھوڑے یا خچر بھی بندھے نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ مویشی باربرداری کو استعمال ہوتے تھے۔ عام استعمال کی اشیاء وہ کندھوں پر لاد کر وہاں تک نہیں لا سکتے تھے۔ جبکہ گاڑیوں کی حرکت بھی سڑکوں تک محدود تھی۔

دو آدمی برساتیاں پہنے خیموں کے باہر ہی ہمارے منتظر تھے۔ انھوں نے خیمے سے چند قدم آگے آ کر ''

بھی کر کر مجھے گھورنے لگی۔ کبھی اصل دین کو اور کبھی اس کی نظر بیٹری سے چلنے والے بلب پر جا ٹکتیں جو خیمے کو روشن کیے ہوئے تھا۔ بیٹری کے قریب ایک سولر پلیٹ بھی پڑی تھی۔ چینیا سولر پلیٹ نے پسماندہ علاقوں کے باسیوں کو اندھیروں سے نکالنے کا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ شہری آبادی سے دور دراز علاقوں میں بھی جہاں بجلی نہیں پہنچی، روشنی نظر آ جاتی ہے۔

"تمھارا نام؟" میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ ہچکچا گئی تھی۔ ہکلاتے ہوئے بولی۔ "گل... کشمالہ۔"

اس کا ڈر دور کرنے کو میں متبسم ہوا۔ "ان وحشیوں کے ہاتھ کیسے چڑھی ہو؟"

"مم... میں بکریاں چرا رہی تھی، یہ زبردستی پکڑ کر لے آئے۔" خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے اس نے باری باری ایک بھاری جثے والے شخص اور ایک چھریرے بدن والے کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ ابھی خاصی پرکشش و جاذبِ نظر تھی، جبھی تو خبیث اسے اٹھا لائے تھے۔ گہری نیلی آنکھیں دیکھ کر مجھے گلنگارے یاد آ گئی تھی۔ البتہ باقی چہرہ گل سے مختلف تھا۔

یہاں وضاحت کر دوں کہ لڑکی جس پشتو میں بات کر رہی تھی وہ بہ مشکل ہی میرے پلے پڑ رہی تھی۔ وزیرستان کی پشتو کافی کرخت ہے، جو کچھ والوں کا لہجہ کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ الفاظ کو یوں توڑ مروڑ دیتے ہیں کہ ٹھیک ٹھاک پشتو جاننے والے مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ میں تو خیر پٹھان نہیں ہوں، سردار خان جیسا خالص پٹھان بھی ان سے گفتگو کرتے ہوئے سر پکڑ لیتا تھا۔ البتہ میری جانِ حیات بلوشے ہر قسم کی پشتو روانی سے بولتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے میں بھی اس قابل ہوا کہ وزیرستانی لب و لہجے کو کم از کم سمجھ لیتا ہوں اس انداز کی پشتو بول اب بھی نہیں سکتا۔

"تمھارا گھر کہاں ہے؟" میرے سوال جاری رہے۔ اس اثنا میں سردار اندر آ کر خاموشی سے ہماری گفتگو سننے لگا۔

"گرش خیل کے مضافات میں ہے، آج دوپہر کو..." وہ تفصیل بتانے لگی۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ باک تاپ کے شمال میں ایک چھوٹا سا گاؤں گرش خیل کلے ہے جہاں امریکن فوج کی چھاؤنی بھی موجود ہے۔ گرش خیل کے مضافات میں چند گھرانوں پر مشتمل کافی آبادیاں ہیں اور وہ بے چاری بھی ایسی آبادی ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ خبیث لوگ اس طرح کی معصوم لڑکیوں کو اکیلا دیکھ کر اٹھانے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسی لڑکیاں مہینوں ان کے پاس پوری ٹولی کی اجتماعی بیوی بنی رہتی تھیں۔ کبھی کبھار یہ معصوم لڑکیوں کو ایک ہی بار خراب کر کے ان کا گلا کاٹ کر دفن کر دیتے اور ایسا بھی ہوتا کہ ہفتہ بھر پاس رکھ کر آزاد کر دیتے۔ اس کا انحصار اغوا کرنے والے کی مرضی اور طبیعت پر تھا۔ کشمالہ کو اٹھانے والے دو تھے۔ دونوں گرش خیل ضروری سامان کی خریداری کو گئے تھے کہ واپسی پر جنگلی پھول پر نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فی الفور اسے بے ہوش کیا اور اطمینان سے رنگ رلیاں منانے کی نیت سے ساتھ اٹھا لائے۔ لیکن جنگلی پھول کے حصول میں جھگڑا ہو گیا۔ اصل دین نے اسے چھڑانے کی کوشش کی اور ناحق پر گولی کھا بیٹھا۔ بات ان کے کمانڈر قلات خان تک جا پہنچی۔ جس کی وجہ سے وہ معصوم لڑکی عارضی طور پر ان وحشیوں کی دست برد سے محفوظ رہی تھی۔ البتہ اس کی قسمت عروج پر تھی کہ میں اور سردار بلائے ناگہانی کی طرح وہاں پہنچ گئے تھے۔

سردار شرارتی انداز میں بولا۔ "اتنی جلدی کاہے کی ہے، شادی کے بعد تفصیل جان لینا۔" کشمالہ کو بے خبر رکھنے کی غرض سے اس نے اردو میں بات کی تھی۔

میں سنجیدگی سے بولا۔ "اسے دوسرے خیمے میں لے جاؤ، مجھے اصل دین سے کوئی خاص بات کرنا ہے۔"

سردار سمجھ گیا کہ میں اصل دین کو کشمالہ کے سامنے قتل نہیں کرنا چاہتا۔

"چلو۔" سردار نے اسے خیمے سے نکلنے کا اشارہ کیا۔

دو مسلح افراد اندر داخل ہوئے خیمے میں گھسے۔ کلاشن کوف بھی ہماری طرف تنی تھی۔ آگے والا ادھیڑ عمر کا گرانڈیل شخص تھا۔

"خوچہ کا بچہ! ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ تمھارا کیا خیال تھا قانون خان سے بچ جاؤ گے۔"

کلاشن کوف کے خوف ناک دہانے کو اپنی جانب اٹھا دیکھ کر بہادری کا مظاہرہ سلطان راہی مرحوم یا بدر منیر ہی کر سکتا تھا۔ بے بس ہو گئے تھے۔ امید ہی نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی ہمیں آلیں گے۔

میری پراگندہ سوچوں میں کشمالہ کی چیخ نے خلل ڈالا تھا۔ وہ "ماما جان!" کہتے ہوئے قانون خان کی طرف بھاگی۔ "انھیں کچھ نہ کہو، انھوں نے مجھے لٹیروں سے بچایا ہے اور مجھے بہن بنا لیا ہے۔ اب مجھے گھر پہنچانے جا رہے تھے۔ یہ بہت اچھے ہیں۔ یہ میرے فوجی بھائی ہیں۔ انھوں نے سارے لٹیروں کو قتل کر دیا ہے" ماموں سے لپٹتے ہوئے وہ پرجوش لہجے میں تفصیل بتانے لگی۔

قانون خان کی درشتی، خوشگوار حیرت میں تبدیل ہوئی۔ کشمالہ کا ماتھا چوم کر اس نے کلاشن کوف کندھے پر لٹکائی اور ہماری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "شاباش تم جیسے دلیر جوان ہی ہمارا فخر ہیں۔" اس نے باری باری سردار اور مجھے گلے لگا کر پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے ہماری پیشانیاں چوم لی تھیں۔ دوسرے جوان نے بھی کلاشن کوف کی نال نیچے کر لی تھی۔ وہ کشمالہ کا بڑا بھائی تھا۔

قانون خان اسے مخاطب ہوا۔ "ترنگ خان! باقیوں کو بھی اندر بلاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد پانچ مسلح افراد خیمے کے اندر آ گئے تھے۔ قانون خان کے کہنے پر تمام ہمیں پرتپاک انداز میں ملے۔ تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ کشمالہ کو اغوا کرنے والوں کو قانون خان کی بیٹی تاکی نے دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے کشمالہ کو گھوڑے پر ڈال لیا تھا۔ وہ ایک ٹیکری پر چڑھ کر دور تک ان کی حرکت کو دیکھتی رہی۔ جیسے ہی وہ نظر سے اوجھل ہوئے وہ بھاگتے ہوئے گھر پہنچی اور باپ کو ساری تفصیل بتا دی۔ قانون خان تند مزاج کا بگڑا ہوا شخص تھا۔ غیرت مند دلیر اور کسی سے نہ ڈرنے والا تھا۔ وہ فوراً چند احباب کو اکٹھا کر کے بھانجی کو اغوا کرنے والوں کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ دہشت گردوں کی کارروائیاں ان کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ چونکہ انھیں کشمالہ کو اغوا کرنے والوں کی جگہ کے بارے معلوم نہیں تھا اس لیے وہاں تک پہنچنے میں انھیں کئی گھنٹے لگے تھے۔ اتنی دیر میں انھوں نے افغان بارڈر میں کئی خیمے کھنگالے تھے۔ جن میں کچھ گلہ بان (بکریاں چرانے والے) کچھ مقامی لوگ اور کچھ دہشت گرد تھے۔ تاکی نے انھیں کشمالہ کو اغوا کرنے والوں کی جانے کی سمت بتا دی تھی۔ اندازے سے چلتے ہوئے آخر وہ ٹھیک مقام پر پہنچ گئے تھے۔ ان کی آمد نے ہمیں تقویت دی تھی۔ کم از کم کشمالہ کا معاملہ بااحسن خوبی نمٹ گیا تھا۔

مشورے کے بعد انھوں نے دہشت گردوں کی کسی چیز کو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیوں کہ بچا سامان یکجان کر دہشت گردوں کے خلاف ہمارا آپریشن پر اتر آتے تو وہ مقابلہ نہ کر پاتے۔ البتہ ہم نے ان کا اسلحہ اور ایمونیشن ایک مخصوص جگہ چھپا دیا تھا کہ موقع ملنے پر نکال لیں گے یا کم از کم دہشت گردوں کے ہاتھ وہ نہیں لگے گا۔ وہ صرف آئی کام بھی لے تھے جو واکی ٹاکی کہتے ہیں۔ عام طور پر دہشت گرد کے پاس میں نے آئی کام سیٹ ہی دیکھے ہیں۔ (واکی ٹاکی وائرلیس سیٹ کا بہترین نعم البدل ہے اور اردو زبان میں اسے وائرلیس کی جگہ ایک مستقل لفظ کے طور پر شامل کیا جا سکتا ہے جیسے پہلے اردو میں وائرلیس کے لیے لفظ 'لاسلکی' استعمال ہوتا ہے)

عموماً دہشت گردوں کے پاس آئی ای ڈی اور بارود وغیرہ مل جاتا ہے۔ مگر یہاں وہ جس سمت پر حملے کی غرض سے اکٹھے ہوئے تھے اس لیے بارود وغیرہ پاس نہیں رکھا تھا۔ میرا اندازہ ان کے آنے والے ساتھیوں کے لیے بارود بھی چھپا تیار کرنے کا تھا۔ کیوں کہ ان کی آمد سو فیصد یقینی تھی۔ تھوڑا سوچ کر میں نے سردار سے دستی بم (ہینڈ گرنیڈ) مانگے اس کے

نہیں ہوتے کیوں کہ وہ ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے۔ شمالی علاقہ جات ہوں، کشمیر ہو یا افغانستان، چترال کی پہاڑی علاقوں میں گھومتے ہوئے میں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ پاک آرمی کی چوکیوں پر کتوں کا گروہ رہتا ہے۔ کتوں کو باقاعدگی سے خوراک ملتی ہے اور پہرے داروں کو ایسے دوست مل جاتے ہیں جو دشمن کو دور سے تاڑ کر بروقت چوکس کر دیں۔ ایک عجیب بات یہ بھی مشاہدہ کی ہے کہ پاک آرمی کی چوکیوں پر رہنے والے کتے سول کپڑوں والوں کو پوسٹ کے قریب نہیں آنے دیتے جبکہ آرمی کی وردی میں کوئی نووارد بھی آ جائے تو اس سے تعرض نہیں کرتے۔

"خان صاحب ٹیلے پر دوربین سے بلندی کا جائزہ لے لو۔"

سردار نے "سپین اژدی" آن کر کے آنکھوں سے لگائی۔ لمحہ بھر جائزہ لینے کے بعد بولا۔ "بلندی پر ایک مکان نظر آ رہا ہے۔"

دوربین لے کر میں نے بھی جائزہ لیا۔ درختوں کے جھنڈ میں ایک عمارت کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔

سردار نے خیال ظاہر کیا۔ "ہو سکتا ہے کسی سول شخص کا گھر ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پریشانی ظاہر کی۔ "اس کے برعکس اگر دہشت گردوں کا مستقر ثابت ہوا۔ اور ایسا ہونے کی صورت میں نہ صرف یہاں پہرے دار موجود ہوں گے بلکہ ان کی کافی تعداد نے ڈیرے ڈالے ہوں گے۔"

سردار متفق ہوا۔ "کوئی اور جگہ ڈھونڈیں؟"

میں نے کہا۔ "قریب سے جائزہ لیے بغیر فیصلہ کرنا بے وقوفی ہوگی۔"

"چلو پھر" شیر دل پٹھان خطروں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ میں نے بارہا جانچا تھا کہ سردار خان بے وقوفی کی حد تک دلیر تھا۔ خطرات اور اندیشوں کو وہ ہمیشہ ہی مذاق میں اڑا دیا کرتا تھا۔ مداہنت اس کی فطرت میں شامل نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ مجھے اس شعر کے مصداق لگتا تھا

مداہنت نہ سکھا جبر ناروا سے مجھے
میں سربکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

حالاں کہ خوف کا مادہ انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ہر شخص ڈرتا ہے۔ دلیر اور بزدل آدمی میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ دلیر شخص اپنے خوف پر قابو پا لیتا ہے۔ اپنے اندر کا ڈر وہ دل ہی میں چھپائے رکھتا ہے۔ جبکہ بزدل آدمی اپنے اعصاب پر قابو نہیں پا سکتا اور خوف کو ظاہر کر دیتا ہے۔ میں اپنی بات کروں تو عملی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں جب میرا دل خوف سے لرز اٹھا۔ موت آنکھوں کے سامنے دکھائی دینے لگی اور ایسے حالات میں "کل نفس ذائقۃ الموت" کا افسون ہی تھا جس نے مجھے بھاگنے سے روکا۔

اس وقت بھی بلندی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میرے چہرے پر تفکرات کا جال پھیلا تھا۔ اور ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ ہر ایسے وقت میں جب موت کچھ زیادہ ہی قریب دکھائی دینے لگے انسان کے احساسات ایسے ہو جاتے ہیں۔ میں اسے کتنا ہی احتیاط پسندی کا نام دوں، فہم و فراست گردانوں، ہوشیاری سے تعبیر کروں، دور اندیشی کہوں یا خبرداری سمجھوں حقیقت میں یہ خوف اور ڈر ہی سمجھا جائے گا۔ صرف بلوشہ کے غائب ہونے کے عرصے میں جب ہم اسے مردہ سمجھ رہے تھے تب موت کا ڈر میرے دل سے نکل گیا تھا۔ کیوں کہ اس کی موت ہی کے ساتھ زندگی کی ساری دلچسپیاں اور رعنائیاں لوٹ آئی تھیں۔ اس کی محبت کو میں نے ہر رشتے پر مقدم سمجھا تھا۔ وہ مجھے اتنی ہی عزیز اور پیاری تھی۔ اگر کبھی ایسا موقع آیا کہ مجھے اپنی جان اور اس کی زندگی میں ایک کا چناؤ کرنا پڑا تو یقیناً میری ترجیح اس کی سلامتی ہوگی۔ لیکن اب

جب وطن عزیز کی خدمت وحفاظت کی آ جاتی تو اپنی عزیز از جان ہستی کے دادے بیٹوں کو بھی میں نے کبھی پشت ڈالی دیا تھا۔
اس کی شروع دن سے کوشش تھی کہ میں فوج کی نوکری کو خیر باد کہہ دوں۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنی اولین ترجیح جانتے کے باوجود میں نے اس خواہش کو در خور اعتنا نہیں جانا تھا۔ بلکہ ایک بار تو اس کے تکرار کرنے پر اچھی خاصی ڈانٹ پلا دی تھی۔ وہ دن دو راتیں خفا رہی کر دو ماں کے کمرے میں ڈیرہ لگا لیا تھا۔ عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹا تو دو ماں کمرہ بند ملا۔ تیسرے دن دوماں کے منت سماجت کرنے پر راضی ہوئی تھی۔ البتہ یہ اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ نوکری چھوڑ دینے کا مشورہ یا درخواست میں کبھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ حال صرف میرا نہیں ہر فوجی کا ہوتا ہے۔ ہم بھی عام انسان ہوتے ہیں ہماری بھی خواہشات، ارمان، آرزوئیں اور تمنائیں ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں وطن کی ہواؤں کا مقابلہ اور گھر کے ماحول کا نعم البدل ارض پاک کی اصل جنت کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ بقول شاعر

کوئی بہشت کا پوچھے تو کہہ سکوں ہنس کر
کہ وہ بھی خوب جگہ ہے ہمارے گھر کی طرح

میرا بھی دل چاہتا ہے کہ دن بھر کام کے بعد شام کو گھر لوٹ کر اپنے بیٹے محمد اللہ کی تلقار یاں سنوں، دو چار ملے پڑھتی دو ماں کو اپنی آنکھوں سے خود کو تازہ دیکھوں اور جب چوری پکڑوں تو اس کی حیا آلود مسکراہٹ سے مستفید ہوں جو اس کے سرخ و سفید چہرے کو گلابی کر دیتی ہے۔ بادشاہ کی انگلیوں سے کھلونا بنوں، اماں جان، ابو جان اور پھوپھی جان کی شفقتیں سمیٹوں۔ جنگلوں، ویرانوں، پہاڑوں اور صحراؤں میں دشمن کا تعاقب کرنا، کبھی ان سے چھپنے کو بھاگنا، کبھی گولی چلا کر دشمن کو سر سے محروم کرنا، کبھی اپنے بدن پر گولی کھانا یہ کھیل پڑھنے والوں کو بے شک دلچسپ لگے۔ پڑھ کر لطف اندوز ہوں، اپنے قارئین ارقامت میں ان واقعات سے جی بہلائیں مگر جس پر گزر رہی ہے صرف وہی اس تکلیف اور درد کو محسوس کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی
دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات سے

بلندی طے کرتے ہوئے نظریں تسلسل سے دائیں بائیں کا جائزہ لے رہی تھیں اور دماغ الٹے سیدھے خیالات کی جگالی میں مصروف تھا۔ عجیب و غریب خیال تھے جو ساون کی گھٹا کی طرح امڈے چلے آ رہے تھے۔ سر جھٹک کر میں نے ان خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ ہم خاموشی اور احتیاط سے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ تو میرے جیسا پہاڑی علاقے میں ڈھلان چڑھتے یا اترتے وقت محتاط کرنا ایسی ہے جیسے کوئی دوشیزہ پائل پہن کر چھن چھن کی آواز پیدا کیے حرکت کرے۔ بقول شاعر

پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
تو لاکھ چلے رے گوری تھم تھم کے

جو خیال کافی شرمندہ کرنے والا تھا اور سردار کو شرمندہ کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے دینا کہاں کی عقل مندی تھی۔ ایک کنکر اس کی حرکت سے لڑھکتا ہوا نشیب کے سفر پر روانہ ہوا، وہ فوراً دبک کے بیٹھ گیا تھا۔ پاس پہنچتے ہوئے میں نے سرگوشی کی۔

"خان صاحب! اس وقت تمھاری حالت پازیب پہن کر گھر والوں سے چوری چھپے محبوب کی ملاقات کو جانے والی دوشیزہ کی سی ہے۔"

وہ بھڑک کر کھڑا ہوا۔ "تمھی کی تمھیں ان سالوں کی۔"

ہم کچھ حصہ توڑ کر، چلے جائیں گے۔ آپ کو گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے شکوک لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا یقین کیوں کروں؟"

میں اطمینان سے بولا۔ "کیوں کہ آپ کے گھر میں داخل ہونے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟" وہ اتنی جلدی مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا۔ "یہ جاننا آپ کے کسی کام نہیں آئے گا۔"

وہ چلانے لگی۔ "مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میرے بھائی گھر ہی میں سوئے ہیں۔"

"جاگ جائیں تو ہمارے پاس بھیج دینا، ہم مطمئن کر دیں گے۔ فی الحال آپ آرام کریں، ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔" گفتگو ختم کرنے کا عندیہ دے کر میں سردار کو بولا۔ "چلو۔"

ہم مکان کے شرقی جانب موجود سیاہی اونچائی کے درختوں کی طرف بڑھ گئے۔ دونوں درختوں کے تنوں کے درمیان چار فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ یہاں بہتر مچان بن سکتی تھی۔

سردار نے مشورہ دیا۔ "مچان کے بجائے "ٹیل ہائیڈ پوزیشن" کیوں نہ بنا دیں۔" (یہ پوزیشن کسی درخت، پتھر یا کسی بھی دستیاب چیز کے پیچھے بنائی جا سکتی ہے جو عموماً اپنی حفاظت مہیا کرتی ہے اور دشمن کے براہ راست یا بالواسطہ فائر سے سنائپر بچا رہتا ہے۔ البتہ اس میں محنت زیادہ کرنا پڑتی ہے اور کھدائی وغیرہ کو اوزار کی ضرورت بھی پڑتی ہے)

یقیناً اس کا ارادہ گھر والوں سے بیلچہ، کدال وغیرہ مانگنے کا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "رکاوٹ کم ہو جانے کا علاوہ رائفل کا سائلنسر ہمارے پاس موجود ہے اس لیے فکر نہ کرو مچان پر ہمارے دیکھے جانے کے امکان کم ہیں۔"

وہ متفق ہوا۔ "سامان لے آؤں۔"

"اکٹھے چلتے ہیں۔" میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ مکان ہم سے تیس چالیس گز شمال کی طرف پڑ رہا تھا۔ اوپر چڑھتے ہوئے ہم مکان کے پاس جا کر اس طرف مڑے تھے۔ ان درختوں کے پاس پہنچ کر مکان کے پاس سے گزرنا ضروری تھا۔ کتوں نے ہمیں دیکھ کر ایک بار پھر اپنی موجودگی کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ البتہ اب ان کے بھونکنے میں پہلے جیسی شدت نہیں تھی۔ سامان لانے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔

چھوٹے دستے کی تیز پھل والی کلہاڑی میری جانب بڑھاتے ہوئے سردار اطمینان سے بولا۔ "راجا صاحب! بسم اللہ کرو۔"

"تم بھی پکڑ لو یہ والا تو ضرب۔" میں بڑی بڑی جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے کئی مضبوط شاخیں کاٹ ڈالیں۔ سردار ان شاخوں کو درخت کے پیچھے ڈھیر کرتا رہا۔ مچان بنانے کے کئی طریقے ہیں۔ ان کا انحصار دستیاب وسائل، درخت کی قسم اور وقت پر ہوتا ہے۔ اگر لکڑی کے پھٹے، رسیاں وغیرہ میسر ہوں تو مچان کو آرام دہ بنایا جا سکتا ہے۔ مچان کی تیاری میں درخت کے چناؤ کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ درخت اکیلا اور نمایاں نہ ہو، درختوں کے جھنڈ سے الگ نہ ہو، کھوکھلا نہ ہو، اس پر پرندوں کے گھونسلے نہ ہوں، کیڑے مکوڑے نہ ہوں، اس پر چڑھنا اترنا آسان ہو، اطراف سے بھرپور شاخیں ہوں، شاخیں اتنی مضبوط ہوں کہ سنائپر جوڑی کا وزن سہار سکیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ صرف پڑھنے کی حد تک ہے۔ عملی زندگی میں بہت ساری باتیں نظر انداز کرنا پڑتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ان خصوصیات کے حامل درخت میسر ہوں۔ سو جہاں سنائپر کے پاس انتخاب کا چناؤ نہیں ہوتا، ایسے حالات میں خطرہ مول لینا مجبوری بن جاتا ہے جس سے سنائپر کی زندگی خطرات کی عملی تصویر ہی ہوتی ہے۔

اس وقت بھی وہیں سب سے بہتر وہی درخت لگے تھے۔ البتہ ہماری خوش قسمتی کہ وہ بالکل ویسے ہی اور اونچے بھی تھے، گھنے بھی تھے۔ وزیرستان میں شاہ بلوط کے درختوں کی بہتات ہے اور ہم نے شاہ بلوط ہی کے درختوں کا چناؤ کیا تھا۔ مقامی زبان میں اسے "سپیرا نے" کہتے ہیں۔ اس کی دو تین اقسام ہیں جن میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اس درخت کانٹے تو نہیں ہوتے جنگلی پتوں کے کنارے سے نوکیلے ہوتے ہیں جو ننگی جلد پر چبھ سکتے ہیں۔ البتہ لکڑی انتہائی مضبوط ہوتی ہے۔ مقامی لوگ اس کی لکڑی کوئلہ بنانے میں استعمال کرتے ہیں۔ جس سے انگلو (Igloo) نما قد آدم بھٹیاں بنا کر ان میں درخت کی لکڑیاں چھت تک بھر دیتے ہیں۔ پھر اسے دھیمی آنچ پر سلگنے کو چھوڑ دیتے ہیں، چند دنوں میں عمدہ کوئلہ تیار ہو جاتا ہے۔ وزیرستان میں کافی لوگ اس کاروبار سے وابستہ ہیں۔

درخت پر چڑھنے سے پہلے ہم نے فجر کی نماز پڑھی اور پھر کلہاڑی نیفے میں اڑس کر میں درخت پر چڑھ گیا۔
صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ اب ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ مناسب بلندی پر پہنچ کر میں نے سردار کو شاخیں پکڑانے کا اشارہ کیا۔ وہ شاخیں دیتا گیا اور میں ترتیب سے رکھتا گیا۔ پہلے مرحلے میں میں نے مچان کا فرش بنایا تھا۔ سردار نے رسی کو ادھیڑ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیے تھے۔ میں شاخوں کو مہارت سے باندھنے لگا۔ طلوع آفتاب تک ہم نے مچان تیار کر لیا تھا۔ مزید تھوڑا وقت لگا کر ہم نے مچان کے چھپاؤ (کیموفلاج) کی ضروریات کو پورا کیا اور سارا سامان مچان پر منتقل کر دیا۔ فارغ ہو کر میں کنٹرول سے رابطہ کرنے لگا۔ کیپٹن حنیف کو اپنی جگہ کے بارے بتا کر آگے کا لائحہ عمل پوچھا۔

"ہم صبح تین بجے باہر جائیں گے، تب ملاقات ہوگی۔ تم سے بات چیت کو 13 دوست آ رہے ہیں۔ سنگل پر دیتا آؤٹ۔" (مطلب یہی تھا کہ وہ آنے والی صبح تین بجے نکلیں گے اور میں چینل 13 پر مزید احکامات کا منتظر رہوں)
"ہم منتظر ہیں۔" کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔
"یار! بھوک لگی ہے۔" سردار نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔
"بسکٹ ہی پر گزارا کرنا پڑے گا۔" میں نے چنوں سے بنے ہوئے مخصوص بسکٹ جھولے سے نکال کر درمیان میں رکھ لیے۔

سردار منہ بنا کر بسکٹ چبانے لگا۔ ان بسکٹوں سے بھوک تو مٹ جاتی ہے مگر گندم کی روٹی اور سالن کا بدل یہ کیسے ہو سکتے۔ اور بدقسمتی سے سنائپر کا مقصد کی خاطر اٹھنے والا پہلا قدم اس کے پیٹ پر پڑتا ہے۔
اسے بے دلی سے بسکٹ چباتے دیکھ کر میں نے چوٹ کی۔ "یہ خوراک ہے، دوائی نہیں۔"
سردار نے کہا۔ "میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ فقرہ ہی غلط ہے، پٹھان سوچا نہیں کرتے۔"
وہ چیخ اٹھا۔ "سنو تو سہی۔"
میں نے منہ بنایا۔ "نہیں بابا، پٹھان بننا مجھے قبول نہیں ہے۔"
وہ مصر ہوا۔ "کھانے کے پیسے دے دیں گے۔"
"گھر میں صرف عورتیں ہیں۔ جو آسانی سے ہم پر اعتبار نہیں کریں گی۔"
"دروازے پر دستک دیں گے، کوئی رد عمل ملا تو بہتر ورنہ چنوں کے بسکٹ تو کہیں نہیں گئے۔"
میں نے فلسفہ جھاڑا۔ "جو بسکٹ بے عزت ہو کر کھانے ہیں، انھیں عزت سے چبا لو۔"
اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ "بے عزتی، عزت والوں کی ہوتی ہے۔"

میں سنائپر کورس کے بعد میری موجودگی میں وہ ہمیشہ سپاٹر کی ذمہ داریاں نبھاتا تھا۔

تیار ہو کر میں نے پوچھا۔ ”کوئی حرکت نظر آ رہی ہے؟“

”سامنے بڑے پتھر کا دایاں کنارا، دو بجے کی لائن، پہاڑ کی دیوار میں اپنی وکیل ٹولی پائی گئی ہے۔“ اس نے پیشہ ورانہ انداز میں سمت دکھائی۔ (دو بجے کا مطلب یہی تھا کہ سامنے بڑے پتھر کے دائیں کنارے پر اگر سوئیوں والی گھڑی رکھ دی جائے تو گھنٹے والی سوئی دو پر پہنچ کر جس جانب اشارہ کرے وہ سمت)

میں نے لیوپولڈ سائیٹ میں اس جانب دیکھا، پاک آرمی کی وردی میں چند افراد محتاط انداز میں ایک جانب بڑھتے نظر آئے۔

”ہدف نشان بڑا پتھر دس بجے کی لائن، دوسری ٹولی بھی ظاہر ہو گئی ہے۔“

ادھر شست پھیرنے پر مجھے دس بارہ فوجی نظر آئے۔ دونوں ٹولیاں علیحدہ علیحدہ ہدف کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان کی حرکت سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس ہدف پر حملے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ دشمن کے ٹھکانے ہمارے بائیں رخ تھے۔ دشمن کے چار ٹھکانے ہمیں نظر آ رہے تھے۔ اگر ایک ترتیب سے بتانا شروع کروں تو پہلا ٹھکانہ شمال کی جانب تھا۔ اسے ہدف اول کہوں تو اس کے ساتھ جنوب کی جانب ہدف دوم اور اسی رخ آگے بڑھتے ہوئے ہدف سوم اور ہدف چہارم۔ پانچواں ہدف ہماری حد سے باہر تھا اور ہماری جگہ سے نظر بھی نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے جن دو جتھوں کی حرکات دیکھی تھیں ان میں ایک چیتا ذل اور دوسرا طوفان ذل تھا۔ پہلے مرحلے میں چیتا ذل ہدف سوم پر حملہ کر رہا تھا اور طوفان ذل نے ہدف اول پر حملہ بولنا تھا۔

”ایس ایس فار چیتا ذل اوور۔“ میں وائرلیس سے رابطہ کرنے لگا۔

فوراً ہی جواب آ گیا تھا۔ ”چیتا ذل ریڈنگ یو سرتیج اوور۔“

”چیتا ذل، دشمن کے دو پہرے دار نظر آ رہے ہیں، جیسے ہی آپ گھیرا مکمل کر لیتے ہیں میں انھیں ناکارہ کر دوں گا اوور۔“

”ایس ایس، کیا ہم انھیں دور سے نظر آ سکتے ہیں اوور۔“

”چیتا ذل، دائیں مڑتے ہی تمھیں رینگ کر جانا پڑے گا۔ شمالی جانب چند جھاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ راجر سو فار۔“ میں نے تصدیق چاہی۔

”یس اوور۔“ چیتا ذل نے سمجھ جانے کا عندیہ دے کر مزید پیغام کا تقاضا کیا۔

”تمھاری ٹولی اس جانب آڑ لے کر ہدف کے قریب پہنچ سکتی ہے۔ اپنے تمام افراد کو وہاں اکٹھا کرو جونہی تمام پہنچ جائیں مجھے مطلع کرو اوور۔“

چیتا ذل کے ”راجر“ کہنے پر میری بات جاری رہی۔

”تمھارے اکٹھے ہوتے ہی میں پہرے داروں کو ناکارہ کر دوں گا، میرا اشارہ ملتے ہی تم ہدف پر حملہ بول سکتے ہو اوور۔“

چیتا ذل نے ”راجر“ کہا اور میں نے ”آؤٹ“ کہہ کر بات ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

سرمد بات چیت ختم ہونے کا منتظر تھا۔ ”فاصلہ تیرہ سو پچاس میٹر، ہوا چند ہ کلومیٹر فی گھنٹہ۔“ اس نے فاصلہ اور ہوا کی رفتار بتائی۔ (سنائپر کو فائر کرنے سے پہلے ہوا کی رفتار معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہوا فائر پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر ہوا کی اقسام کی بات کی جائے تو سات کلومیٹر فی گھنٹہ چلنے والی ہوا کو ہلکی ہوا کہتے ہیں جو فائر پر خاص

اثر انداز نہیں ہوتی۔ البتہ سنائپر اس کا بھی حساب رکھتے ہیں۔ اس کے بعد درمیانی ہوا جس کی رفتار تقریباً سے سولہ کلومیٹر فی گھنٹہ۔ پھر تیز ہوا اور سے جو بیس کلومیٹر فی گھنٹہ تیز ہوا چوبیس سے تیس کلومیٹر فی گھنٹہ اور بہت زیادہ تیز ہوا جو تیس کلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے)

میں ہوا کا فرق ذہن میں رکھ کر ذہن میں اب حساب لگانے لگا۔ اسی اثناء میں سردار نے ہدف کی ڈگری معلوم کی۔ (ڈگری سے مراد بلندی سے نشیب کی ڈگری سے ہے۔ چونکہ ہدف ہم سے گہرائی میں تھا اس لیے میں براہ راست رینج نہیں لگا سکتا تھا۔ (اس بارے میں سنائپر ناول میں تفصیل سے بحث کر چکا ہوں جسے شوق ہو وہاں دیکھ لے) ڈگری کا فرق نکال کر میں نے رینج تبدیل کی۔ میں نے اپنی پوزیشن اب پر مطلوبہ کلک لگانے کے بعد ہینڈل کاک کی اور بٹ کندھے میں پھنسا لیا۔

''چیتا ذل'' کے افراد مٹی کے ڈھیلے کنارے کی آڑ لے کر جھاڑیوں کے شمالی جھنڈ میں اکٹھا ہو رہے تھے۔ میں نے وائرلیس سیٹ سردار کی طرف بڑھایا۔

''طوفان ذل، کی رہنمائی کرو اور انھیں کہو ہدف کا گھیراؤ کر کے تین سو میٹر کے دائرے تک جمع ہیں اور اس کے بعد منتظر رہیں۔ جونہی چیتا ذل کا سردار کارروائی کرے گا فائرنگ کی آواز سن کر دشمن ضرور آڑ سے باہر آئیں گے تب وہ انھیں نشانہ بنا سکیں گے۔''

سردار دوربین کے ذریعے ہدف اول کا جائزہ لے کر ''طوفان ذل'' کی رہنمائی کرنے لگا۔ وہ ہدف لگ بھگ ساڑھے نو سو میٹر کی دوری پر تھا۔

اسی اثناء میں چیتا ذل ہمیں جگہ پر پہنچ جانے کی اطلاع دے چکا۔

میں سردار کو مخاطب ہوا۔ ''چیتا ذل کو کہو کہ تیس سیکنڈ میں پیش قدمی کو تیار رہے۔''

طوفان ذل کو انتظار کرا کر وہ چیتا ذل کو میرا پیغام پہنچانے لگا۔ جبکہ میری توجہ پہرے داروں پر تھی۔ اس علاقے میں عام لوگوں کے مکانوں پر بھی مورچے بنے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مکان پختہ اینٹوں سے تعمیر تھا کہ اس کی چھت پر اب تک مورچے نہیں بنے تھے۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ وہ کسی دوسرے کا مکان تھا یا وہ خود ہی تعمیر کر رہے تھے۔ غالب گمان یہی تھا کہ کسی غریب کے مکان پر وہ زبردستی قابض ہوئے تھے۔

مکان کے دروازے پر ایک پہرے دار کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ دوسرا ساتھی اس کی جانب پیٹھ موڑے چند قدم دور کھڑا تھا۔ کھڑا ہوا فرد آسان ہدف تھا کہ اس کا مکمل جسم نظر آ رہا تھا جبکہ بیٹھے ہوئے آدمی کا صرف سر نظر آ رہا تھا باقی جسم کرسی نے چھپا لیا تھا۔ بلاشبہ کرسی سنائپر رائفل کی گولی کے خلاف آڑ نہیں بن سکتی تھی لیکن کرسی میں لوہے کی چادر لگی ہوتی تو گولی کی رفتار کو کم کر کے ہدف کے بچاؤ میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ لڑائی کا بنیادی اصول یہی ہے کہ پہلے آسان ہدف کو نشانہ بنایا جائے تاکہ یقینی کامیابی حاصل ہو۔ لیکن میں آسان ہدف کو پہلے نشانہ بناتا تو کرسی پر بیٹھا ہوا شخص چوکنا ہو جاتا کیوں کہ اس کا رخ اپنے ساتھی کی طرف تھا۔ اس کے برعکس کھڑے ہوئے آدمی کی ساتھی کی جانب پیٹھ تھی۔ اس کے چوکنا ہونے تک میں اسے بھی شکار کر سکتا تھا۔

میں نے فیصلہ کرنے میں جو دیر کی تھی کہ سنائپر یہ فیصلہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں کر چکا ہوتا ہے۔ کرسی پر بیٹھے دشمن کے سر پر نشانہ سادھ کر میں نے سانس روکا اور لبلبی دبا دی۔

عمدہ سائلنسر کی بدولت صرف ''ٹھک'' کی آواز ابھری ..... اور گولی نے اس کے سر کا بالائی حصہ اڑا دیا تھا۔ وہ مدھم سی کر گرا۔ میں نتیجہ دیکھنے کو نہیں رکا تھا۔ رائفل کو دوبارہ کاک کر کے میں نے کھڑے ہوئے شخص پر نشست لی۔ ساتھی کے گرنے پر اس نے مڑ کر دیکھا اور پھر کو وہ ساکن ہو گیا تھا۔ اس کا اتنا وقت مجھے کافی تھا۔ دوسری ''ٹھک'' نے اسے

بھی زد میں آ رہا تھا۔ بیشتر نکلی گولی جاتے ہوئے سیدھا چور حرکت کر دیتا ہے، پہلی گولی کے نشانے پر لگتے ہی باقی گولیاں ہدف پر
مارنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ کیوں کہ یوں اس کا حوصلہ بڑھنے کے ساتھ اپنے حساب کتاب کی درستی کا یقین بھی ہو جاتا
ہے۔ حساب کتاب سے میری مراد ہوا کی رفتار، ہدف کا فاصلہ جانچ کر درست رینج لگانے سے ہے۔
طوفان زل کی رہنمائی کرنے کے سردار اس جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ میرے اراروں کے سمجھتے ہی اس نے چیتاؤں کو
اطلاع پہنچا دی تھی۔

تربیت یافتہ سپاہیوں نے پیشہ وارانہ مہارت سے حرکت شروع کر دی۔ اچانک ایک شخص چھت پر نمودار ہوا۔ اس
نے ہاتھ میں موبائل فون پکڑا ہوا تھا۔ شاید موبائل فون کے سگنل کی تلاش اسے چھت پر لے آئی تھی۔ وہ چیتاؤں کے افراد کو
دیکھ لیتا تو شور مچا کر اپنے ساتھیوں کو چوکنا کر سکتا تھا۔
"خطرہ۔" سردار نے اسے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے ہی میں رینج ماسٹر کے ٹریگر کو دبانے کو اس
جانب موڑ چکا تھا۔ اس کی نگاہیں موبائل سکرین پر جمی تھیں، جونہی وہ چھت کے درمیان میں پہنچا میری انگلی نے لبلبی کو پیچھے
کھینچ لیا۔ اس کا رخ میری جانب تھا، کسی طاقت ور گولی نے اسے پیٹھ کے بل نیچے گرا دیا تھا۔
چیتاؤں کے "دو دستے" یعنی چار چار آدمیوں کی دو ٹولیاں داخلی دروازے پر پہنچ گئی تھیں، جبکہ باقی نے مکان کو باہر
سے گھیر لیا تھا۔ دروازے پر لمحہ بھر ٹھہر کر وہ مخصوص انداز میں مکان میں گھس کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، لیکن اس دوران
فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگی۔ میرے خیال میں چیتاؤں کے حالات قابو میں تھے۔
"فاصلہ بتاؤ۔" طوفان زل کی جانب رخ موڑتے ہوئے میں سردار کو مخاطب ہوا۔
میرے کہنے سے پہلے ہی اس نے لیزر رینج فائنڈر کو آنکھوں سے لگا لیا تھا۔ فاصلہ ماپ کر اس نے اونچائی کا فرق
نکالا۔ "ساڑھے چھ سو میٹر، ہوا کی رفتار روی ہے۔"
میں نے ایلی ویشن ناب کو مطلوبہ مقدار میں گھمایا اور ونڈ ایڈجسٹمنٹ ناب کو چھیڑے بغیر ہدف کی جانب متوجہ ہو
گیا۔ کافی دور سے بھی فائرنگ کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ یقیناً باقی ٹولیوں نے بھی کارروائی شروع کر دی تھی۔
طوفان زل کا ہدف زیادہ مشکل نظر آ رہا تھا کیوں کہ مکان کے دو کونوں پر مضبوط مورچے بنے تھے۔ ایک مورچے کا
دروازہ ہماری نظر سے اوجھل تھا، اس کا صرف گول سوراخ نظر آ رہا تھا جہاں سے نگرانی یا فائرنگ کی جا سکتی تھی۔ البتہ دوسرے
مورچے کا دروازہ ہمارے سامنے تھا۔ مورچوں سے باہر ایک آدمی دوربین تھامے فائرنگ کی جانب دیکھنے کی کوشش کر رہا
تھا اور دوسرا عقب میں کھڑا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وزیرستان میں گھر عموماً یوں بنائے جاتے ہیں کہ مکان کی دیواریں
کمروں سے کافی بلند ہوتی ہیں۔ کمروں کی زیادہ سے زیادہ اونچائی دس فٹ ہوتی ہے جبکہ بیرونی دیواریں بیس بیس فٹ
اونچی ہوتی ہیں۔ اور ساری تعمیر کچی مٹی سے کی جاتی ہے۔ دیواروں کی موٹائی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ چھوٹے ہتھیار تو
کجا، راکٹ لانچر کا گولہ بھی دیوار سے نہیں گزر سکتا۔ مگر وہ عمارت اس کے برعکس تھی کیوں کہ چھت پر کھڑے دونوں افراد
مکمل نظر آ رہے تھے۔ اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا کہ عمارت میں یا تو دو منزلہ کمرے بنے تھے یا پھر کمروں اور عمارت کی
دیواروں کی بلندی یکساں تھی۔
گولا بارود کا تبادلہ یہاں کی روزمرہ ہے اور کوئی اس کی سن گن بھی نہیں لیتا، لیکن بارش کی طرح موسلا دھار فائرنگ ہر
کسی کو متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ دونوں بھی تیز فائرنگ کا جائزہ لینے کو چھت پر چڑھے تھے۔ قضا بھی انسان کو رفتار کر اس مقام
تک لے آتی ہے جہاں اس نے روح کی امانت سیدنا عزرائیل کو واپس کرنا ہوتی ہے۔
میں نے پہلے شخص پر نشست سادھی، لبلبی دباتے ہی وہ پہلو کے بل گرا، آواز سن کر دوربین والے نے مڑ کر

میں تعلق کی مدد مانگنے کے قابل رہا تھا۔

اب چھروں کے تعاقب میں چار آدمی پیچھے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو نشانہ بنتے دیکھ کر وہ بالکل ہی دبک گئے تھے۔ البتہ ان کے ہتھیاروں نے آگ اگلنا شروع کر دی تھی۔ ہتھیاروں کا رخ اس ٹیکری کی طرف تھا جہاں ہم چھپے تھے مگر ہم کلاشن کوف کی رینج سے باہر تھے۔ وہ بس ہمیں "ٹخ ٹخ" ہی سنا سکتے تھے۔ ان کی فائرنگ بھونکنے والے کتے کی طرح تھی جو کاٹنا نہ جانتا ہو۔

سردار نے مجھے مطلع کیا۔ "میا زل اور طوفان زل نے اپنے اہداف پر قبضہ جما لیا ہے۔" اسے چھر لے پہلے ہی "سب اچھا" کی رپورٹ مل گئی تھی لیکن مجھے یکسوئی مہیا کرنے کو وہ خاموش رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "طوفان زل کو ان چار افراد کے بارے بتا دو۔"

وہ طوفان زل کو باخبر کرنے لگا۔ میں دہشت گردوں کے چوتھے ٹھکانے یعنی ہدف چہارم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بھی نسبتاً ہموار جگہ پر ایک قلعہ نما عمارت تھی۔ دیواریں اتنی بلند تھیں کہ اونچائی سے بھی صحن نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمارت کے شمال مغربی اور جنوب مشرقی کونے میں مورچے بنے تھے۔ مکان کی چھتیں مقامی رواج کے مطابق دیواروں سے اتنی نیچی تھیں کہ چھت پر کھڑا کوئی آدمی نظر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن چھت پر چڑھ کر وہ کھڑے ہوتے تو یہ نقصان بھی تھا کہ وہاں سے وہ علاقے کا جائزہ بھی نہیں لے سکتے تھے۔ اس مقصد کو وہ مورچے استعمال کر سکتے تھے۔ مورچوں کے سوکھے مکان کی دیوار سے فٹ بھر اونچے بنے تھے۔ باقی مورچہ دیوار سے نیچے تھا۔ ہر مورچہ دو جانب کی نگرانی کو بنایا گیا تھا۔ اس لیے جنوب مشرقی مورچے کی جنوبی اور شرقی دیوار میں دیکھ بھال اور فائرنگ کو سوکھا بنا تھا جبکہ شمال مغربی مورچے کی شمالی اور غربی دیوار میں سوکھا بنا تھا۔ جنوبی مغربی مورچے کا دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ مورچوں میں داخلی رستہ نیچے سے بنا تھا۔ چودہ سو میٹر پر ہونے والی دو ساتھیوں کی فائرنگ سننے کے بعد بعید تھا کہ وہ جائزہ لینے کی کوشش نہ کرتے۔

شمال مغربی مورچے کا شمالی سوکھا تو میری نظر سے اوجھل تھا لیکن وہاں دیوار سے آگے بڑھا ہوا ایک شخص کا سر نظر آ رہا تھا۔ یقیناً وہ سر باہر نکال کر اچھی طرح جائزہ لینے کی کوشش میں تھا۔ میرے جیسے سنائپر کو ایسا موقع گنوانا گناہ کرنے کے مترادف تھا۔ سردار بھی دوربین سے ادھر ہی متوجہ تھا۔ مرد کہتے ہی "لیزر رینج فائنڈر" اٹھایا اور فاصلہ وغیرہ ناپ کر اعلان کیا۔ "سترہ سو چودہ، ہوا ساکن۔"

ایلیویشن ڈرم کو سرعت سے گھما کر میں نے مطلوبہ سیٹنگ لگائی۔ اگلے ہی لمحے مورچے سے باہر نکلا ہوا سر غائب ہو گیا مگر بے چارہ سلامت سر واپس نہیں لے جا سکا تھا۔ رینج ماسٹر کی سنگل بول کی گولی آدھا سر تو ساتھ لے جاتی ہے۔

سردار نے پوچھا۔ "اس ٹھکانے والے اپنے ساتھیوں کی مدد کو نہیں نکلے۔ کیا انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ ٹھکانہ چھوڑنا انھیں ابدی نیند سلا دے گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "بھول گئے، مغربی جانب کمانڈر رحیل جان اور سردار فیروز خان کا لشکر موجود ہے۔ پہلے تینوں ٹھکانے کسی ایک کمانڈر کے تھے اور لازماً ان کا آپس میں رابطہ ہو گا۔ اس عمارت میں دوسرے کمانڈر کے لشکری ہیں انھیں ابھی صورت حال معلوم نہیں ہے۔ امید ہے پانچواں ٹھکانہ جو ہماری ذمہ داری میں لیکن رینج سے باہر ہے وہاں بھی دوسرے کمانڈر کے لشکری ہوں گے۔"

سردار نے تجزیہ کیا۔ "میرا خیال ہے مغرب کی جانب موجود دہشت گردوں میں سب سے شمال میں گل بدین کے لشکری تھے جنھیں ہم پہلے ہی کافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ درمیان میں کمانڈر رحیل جان کے لشکری ہیں اور ان سے مزید دائیں یعنی جنوب کی سمت کمانڈر فیروز خان کے آدمی ہوں گے۔ فیروز خان کا پہلا آدمی بھی راہی عدم ہو چکا ہے امید

"بھاگو۔" تنبیہ کرتے ہوئے میں واپس مڑ گیا۔ ہم دونوں کے پاس وزن زیادہ تھا جسے اٹھا کر بھاگنا بہت مشکل تھا۔ البتہ ایک سہولت حاصل تھی کہ ہم نشیب میں اتر رہے تھے۔ آدھی اترائی کے بعد گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

سردار پھولے ہوئے سانسوں سے بولا۔ "جھولوں سے پیچھا چھڑانا پڑے گا۔"

میں چونکا۔ "اپنا ہتھیار کیسے پھینک سکتے ہیں۔"

سردار مصر ہوا۔ "جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔ امید ہے ہمارے بھاگنے پر وہ جھاڑیوں کی تلاش سے باز رہیں گے۔"

میں نے قدم آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی گھنی جھاڑی دیکھو جو کہ سامان دور سے نظر نہ آئے۔"

مگر ہماری خوش قسمتی کہ گھنی جھاڑی سے پہلے ہی ہماری نظر پانی کی تنگ گزرگاہ پر پڑ گئی۔ بارشی پانی نے اس جگہ کو کافی گہرا کر دیا تھا۔ پہاڑی علاقے میں بارش کے بعد پانی نشیب کی طرف تیز رفتاری سے بہتا ہے جس کی وجہ سے چھوٹے بڑے نالے وجود میں آتے ہیں۔ کوہستان کے باسی اور وہ لوگ جنھیں پہاڑوں پر رہنے کا تجربہ ہوا اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہاڑ مختلف اور متعدد پرتوں سے وجود میں آتے ہیں۔ کچھ خالص پتھریلی چٹانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کہیں پتھر، ریت اور مٹی کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ کچھ جگہوں پر چکنی مٹی ہوتی۔ کچھ پر بھربھری مٹی ہوتی ہے۔ پانی ہر قسم کی زمین پر رستہ بناتا ہے، لیکن جہاں بھربھری مٹی کی تہیں ہوں وہاں بننے والے نالے بہت گہرے اور تنگ ہوتے ہیں۔ اور وہ بھی ایک ایسا ہی نالہ تھا۔ ہمارے جھولے "واٹر پروف" تھے۔ پانی ہتھیار یا سازو سامان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ پانی کی گزرگاہ دو فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ دونوں جھولے اندر رکھ کر ہم نے کناروں کی مٹی ٹھوکریں مار مار کر جھولوں پر گرا دی۔ پانچ منٹ ضائع کر کے ہم نے دونوں جھولوں کو دفن کر دیا تھا۔ اب مستقل طور پر تو نہیں البتہ عارضی طور پر جھولے محفوظ ہو چکے تھے۔ کیوں کہ زیادہ بارش جھولوں پر سے مٹی بہا کر لے جاتی۔ لیکن ہمارا مقصد عارضی طور جھولوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔ طویل عرصے تک سامان کو وہاں چھوڑنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔

ایک آئی کام سیٹ اور ایک کیمرہ ہم نے پاس رکھے تھے تاکہ دشمن کی بات چیت بھی سن سکیں اور اپنوں سے رابطہ بھی بحال رہے۔ جھاڑیوں کا سلسلہ نشیب تک چلا گیا تھا، لیکن جھاڑیاں زیادہ گھنی نہیں تھیں۔ چوڑائی میں ایک پٹی کی طرح تھیں۔ جھاڑیوں میں بھاگنے کا فائدہ تو یہ تھا کہ ہم دور سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اور نقصان یہ تھا کہ ہماری نظریں بھی دور دور تک دیکھ بھال کے قابل نہیں رہی تھیں۔

سورج آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اور مسلسل حرکت میں ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی گرمی محسوس ہونے لگی تھی۔ ڈھلان اترتے ہوئے زور تو نہیں لگتا لیکن پھسلنے، پاؤں رپٹنے اور موچ آنے کا خطرہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پختہ سڑک یا ہموار پگڈنڈی تو تھی نہیں کہ بس جسم ڈھیلا چھوڑ کر بھاگتا جائے۔ یہاں تو ہر قدم پر گڑھوں، پتھروں اور ناہموار زمین سے واسطہ تھا۔ پیچھے دیکھے بغیر آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں تھا۔

ہم خاموشی، احتیاط اور تیز رفتاری سے نشیب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ہر وقت بک بک کرنے والے سردار کی زبان پر تالے لگے تھے۔ کیوں کہ پیشہ ور سنائپر ہونے کے ناتے وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ بولنے سے جہاں چھپاؤ خطرے میں پڑتا ہے وہیں سماعتوں کی کارکردگی بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ خاموش ہونے کی صورت میں انسان کانوں سے بھی آنکھوں کا کام لے سکتا ہے۔ دور سے ہونے والی بات چیت اور پاؤں کی آہٹ تک کانوں کی رسائی آنکھوں کے نظارے سے پہلے ہو جاتی ہے۔ دشمن کی آہٹ سننے کو ہم نے دونوں آئی کام سیٹ بھی بند کر دیے تھے۔

سائلنسر لگی رائفل میں نے تیاری کی حالت میں پکڑی ہوئی تھی۔ سردار نے بھی ڈریگنوف کاک کی ہوئی تھی۔ سردار دو تین قدم

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کب کا تمہارے ہاتھوں کی بنی روٹی کو ترس رہا ہوں۔"

"وہ فوراً بولی۔ "ابھی میں گرم گرم روٹی بناتی ہوں۔"

"چلو۔" اسے ساتھ لیے میں باہر نکل آیا۔ کھانا تیار ہونے تک ہم اکٹھے بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ ردا نے تازہ روٹیاں بنا کر لے آئی تھی۔ اتفاق سے کدو گوشت بنا تھا جو میرا پسندیدہ کھانا ہے۔ اور پھر محبت کرنے والی بیوی کے ہاتھ کی بنی گرم گرم روٹیاں، میں ضرورت سے چند لقمے زیادہ ہی کھا گیا تھا۔

کھانا کھا کر میں ابو جان کی ٹانگیں دبانے لگا۔ دو تین منٹ بعد وہ شفقت سے بولے۔ "بیٹا مجھے نیند آ رہی ہے تم بھی آرام کرو۔"

"جی ابو جان۔" کہہ کر میں اٹھ گیا۔

ردا عبداللہ کو چھاتی سے لگائے بیٹھی تھی۔ میں خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ عبداللہ کو سیر کروا کر اس نے بلوشہ کے حوالے کیا اور میرے پیچھے خواب گاہ میں آ گئی۔ عبداللہ کو بلوشہ نے سنبھالنا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ پہلی رات زبردستی ردا کو میرے پاس بھیجا کرتی تھی۔ گو میری پہلی بیوی ہونے کی خصوصیت اسے حاصل تھی مگر وہ ردا کو مقدم رکھتی تھی۔ البتہ ردا کی باری ہو یا اس کی، گھر میں آخری رات وہی میرے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ پہلے بھی ردا کا اس کا چھوٹی بہنوں کی طرح خیال رکھتی تھی۔ وہ کشمیری حسینہ بہت باظرف اور کشادہ دل کی مالک تھی۔ نرم گفتار، خوش اخلاق، خدمتی اور گلے شکووں سے عاری مزاج کی مالک اللہ پاک کی طرف سے میرے لیے بہت بڑا انعام تھی۔ میں بھی اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ وہ مجھے بہت زیادہ پیاری بھی تھی۔ لیکن بلوشہ کی بات اور تھی۔ اس کے بغیر تو میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ردا کافی دیر گھر کے متعلق رہی، جدائی کے دنوں کی سختیاں جو کبھی کال پر نہیں بتا سکی تھی، دوسروں کو تسلی اور دلاسے دے کر خود کو مضبوط و حوصلہ مند ثابت کرنے والی ذاتی بھی حقیقت جان نہیں تھی کہ کیسے میں نہ رو دی۔ بے کیف دنوں اور جاگتی مسلسل راتوں کی کہانی سناتے ہوئے وہ سسک پڑی تھی۔ بلا شک و شبہ وہ مجھے بہت زیادہ چاہتی تھی اور یہی وجہ تو تھی کہ ماں باپ، بھائی، رشتہ دار اور گھر بار چھوڑ کر تنہا میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ گزشتہ شب بلوشہ اور ردا کے دیدار کی خوشی نے مجھے سونے نہیں دیا تھا تو آج ردا کی وارفتگی اور چاہت آنکھیں بند کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اسے بہت کچھ کہنا، بہت کچھ سننا، بہت کچھ کرنا، بہت کچھ بانٹنا اور بہت کچھ منوانا تھا۔ اسے اپنے بھولے ماہی سے پیار تھا، اس کی ضرورت و حاجت تھی۔ اتنی طویل جدائی کے بعد وہ مجھے سونے کی اجازت کیسے دے سکتی تھی۔ صبح کی اذان کے ساتھ یاقوتی ہونٹوں پر دل فریب تبسم اور کالی سیاہ آنکھوں میں آسودگی و خمار کی فراوانی لیے وہ میری پیشانی پر جھکی۔ "آپ کے شہزادے کے کاٹنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔"

میں نے منہ بنایا۔ "بیٹے کا تو بڑا خیال ہے کہ ساری رات جگائے رکھا، اور شوہر غریب کا کیا جو گزشتہ رات بھی سو نہیں سکا اور آج بھی تم نے پلک جھپکنے کی اجازت نہ دی۔"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "آج رات کو سو جانا۔"

میں مظلومانہ انداز میں بولا۔ "وعدہ ہو... جیسی ہو۔"

میرے گال پر چٹکی بھر کر وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

نماز پڑھ کر میں سو گیا تھا لیکن نیند کی عیاشی میری قسمت میں نہیں تھی۔ دو تین گھنٹوں بعد ہی بلوشہ نے زبردستی جگا کر تیار ہونے کو کہا کہ اسے شاپنگ کرنے جانا تھا۔

"ایک آپ کے نوکری چھوڑنے سے فوج کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ کی جگہ فوج کو کئی جوان مل جائیں گے۔" وہ پھر اپنا راگ الاپنے لگی۔

میں نے کہا۔ "اگر ہر ایک نے یہی سوچنا شروع کر دیا تو؟"

وہ چلائی۔ "فلسفوں سے نہ بہلائیں۔"

"اچھی طرح جانتی ہوں میں ایسی باتوں کو، مگر تو انہیں کیوں خارج کر لیتے ہو۔" چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر میں اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "میں کچھ نہیں جانتی آپ ابھی فون کر کے ایک ہفتے کی چھٹی مانگیں۔"

"پلیز! پاگل نہیں بنتے۔"

وہ مصر ہوئی۔ "ہاں یا ناں۔"

"دیکھیں۔"

"ہاں یا ناں۔" وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔

"بہت بری اور گندی ہو۔" ترشی سے کہہ کر میں قصور صاحب کا نمبر ملانے لگا۔ اس لاڈلی کا اتنی سخت بات ہضم کر جانا آسان نہیں تھا، لیکن مجھے کال کرتے دیکھ کر احتجاج کیے بغیر مجھے تکتی رہی۔

"شکر ہے اللہ پاک نے تمھیں بھی توفیق دے دی۔" سلام کا جواب دیتے ہی قصور صاحب نے پھبتی کسی۔

خفیف سی ہنسی کے ساتھ میں نے تکلف بگھارا۔ "جناب! دل کی یاد مسئلے یا مصائب کے بعد ہی آتی ہے۔"

وہ بولے۔ "کمانڈنگ آفیسر کافی بے چینی سے تمھارے منتظر ہیں۔"

میرے دل میں بدگمانی کی لہر اٹھی کہ شاید میرے مسئلے کا سن کر وہ جان چھڑانا چاہتے ہیں، لیکن فوراً ہی سر جھٹک کر یہ خیال کو دور پھینکا کیوں کہ قصور صاحب ایسے کمزور کردار کے بالکل بھی نہیں تھے۔

میں مطلب پر آیا۔ "ان کے انکار میں ہفتے بھر کا اضافہ کرنے کے بارے کیا خیال ہے۔"

وہ حیرانی سے مستفسر ہوئے۔ "کیا ہوا؟"

میں صاف گوئی سے بولا۔ "منہ بولی بہن کی شادی ہے۔ شامل نہ ہوا تو رشتے میں دراڑیں پڑنے کا خدشہ ہے۔"

"جوابی کال کرتا ہوں۔" انھوں نے انتظار کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

"کیا ہوا؟" کال ختم ہوتے ہی وہ بے تابی سے مستفسر ہوئی۔

"اپنے سینئر کو بتا دیا ہے وہ کمانڈنگ آفیسر سے معلوم کر کے تھوڑی دیر تک بتا دیں گے۔"

"میں صلوٰۃ الحاجت پڑھ لوں۔" وہ سرعت سے مصلے کی طرف بڑھ گئی۔ بلا شک و شبہ حاجت روا اور مشکل کشا وہ مالک ہے۔ اور وہ اسی کی بارگاہ میں مانگنے بھاگی تھی۔ میری چند دن کی چھٹی کی خاطر بھاگی جانے والی نہ جانے میری سلامتی کے لیے کتنی مناجات کرتی ہوگی۔

بہت سے ایسے مواقع جب میری سماعتیں موت کے قدموں کی چاپ واضح انداز میں سن رہی تھیں تب اس صورت حال سے میں اتنے عجیب انداز میں بچا جو کسی چاہنے والے کی مناجاتوں ہی کے مرہون منت ہو سکتا تھا۔ یقیناً ماں جان، ابو جان، بہن بھائی بھی میرے لیے دعا گو رہتے تھے، لیکن اس ضمن میں میری شریک حیات بھی کسی سے پیچھے نہیں تھی۔

—•—

"اتنی جرأت کہاں۔"

"رزوا لوگوں کو اپنی آمد سے آگاہ کر دیا ہے۔" اس نے موضوع تبدیل کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو ان بند جا رہی ہے۔"

وہ مصنوعی خفگی لیے بولی۔ "کافی لاابالی تھی ہے۔"

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "اس کا گلہ بجا ہے۔ میں وعدہ کر کے بھی نہ جا سکا۔ سچ میں مجھے آج کل تو تمہارے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے میرے پیٹ میں انگلی چبھوئی۔ "جھوٹے، میں نے تو آپ کے ساتھ ہی آنا تھا۔"

میں نے بات بنائی۔ "جب تمہارے علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے تو وعدہ کیسے یاد رہتا۔"

میرا بازو کھینچتے ہوئے وہ سامنے آئی اور میری چھاتی پر ٹیکتے ہوئے گلوگیر ہوئی۔ "راجو! بار بار اقرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں جانتی ہوں آپ کے لیے کیا ہوں۔"

میں نے چھیڑا۔ "بہتر ہی! خود ہی تو پوچھتی رہتی ہو، بتاؤ کتنی پیاری ہوں، کیسی لگتی ہوں، کتنا یاد آتی ہوں۔ اور اب اقرار کی ضرورت نہیں۔"

ہونٹوں پر خفیف ہنسی لیے اس نے سنجیدہ ہو کر آگے قدم بڑھائے۔ "رزوا کی شادی کہاں ہو رہی ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پتا نہیں۔"

وہ کرید کرید کر پلوشہ بڑے کے گھنے سے متعلق تفصیل پوچھتی رہی۔ گلگارے کے بارے میں اسے پہلے بھی تفصیل بتا چکا تھا اب دوبارہ سب کچھ دہرانے لگا۔ دوپہر کو ایک چشمے کے کنارے رک کر کھانا کھایا اور پھر چل پڑے۔ رات ہم نے ایک غار میں گزاری۔ جنگ کی گرمی سے جھلسے اجسام کو وزیرستان کی سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ لحاف، کمبل وغیرہ تو تھا نہیں، سردی سے بچنے کو آگ جلانا پڑی۔ پلوشہ تو آرام سے میری گود میں سر رکھ کر رضائی اوڑھ کر لیٹ گئی تھی۔ میں غار کی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھتا رہا۔ اگلے روز طلوع آفتاب سے پہلے ہی ہم روانہ ہوئے سیدھی راہ جس پر کبھی برف باری اور سرد ہواؤں سے ٹھٹھرتا ہوا میں گلگارے کے دروازے پر جا گرا تھا۔ آج موسم صاف تھا۔ سہ پہر ڈھلے ہم آخری ڈھلان پر چڑھ رہے تھے۔ ڈھلان کے خاتمے پر چچا شیر جان کے گھر کا دروازہ تھا۔

قریب جا کر میں نے دستک دی۔ دروازہ قمر خان نے کھولا تھا۔

"لالا جان!" مجھے دیکھتے ہی وہ چیخ کر لپٹ گیا تھا۔

"پلوشہ باجی کیا حال ہے۔" مجھ سے علیحدہ ہو کر اس نے پلوشہ کے سامنے سر جھکایا۔

"ارے، تم مجھے جانتے ہو۔" وہ حیران رہ گئی تھی۔

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "اگر آپ لالا جان کے ساتھ نہ آئی ہوتیں تب بھی پہچان لیتا۔"

ہم اندر داخل ہوئے، رزوا باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ شاید قمر کے چلانے کی آواز نے اسے باہر جھانکنے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ "لالا جان!" کہتے ہوئے بھاگی، لیکن قریب آتے ہی جھجک کر رکی اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے سر جھکا دیا۔ پہلے وہ لپٹ جایا کرتی تھی۔ لیکن تب اس کا بچپنا تھا۔ اور اب وہ بھرپور جوان نظر آ رہی تھی۔

اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے میں نے شفقت سے پوچھا۔ "کیسی ہے میری بہادر بہن۔"

"بالکل ٹھیک۔" میرا ہاتھ چھوڑ کر وہ پلوشہ سے لپٹ کر بولی۔ "شکر ہے لالا نے آپ کی تو یاد سے گھر دکھا دیا۔ ورنہ اب تو ہمیں لگنے لگا تھا کہ پلوشہ باجی کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔"

میں نے اسے چڑایا۔ "تمہارے لیے نہیں آیا، میری گڑیا بہن کی شادی ہے۔"

"آپ نے تو کہا تھا چھٹی ختم ہو گئی ہے۔"

میں صاف گوئی سے بولا۔ "رزنا کی شادی کو اور چھٹی مانگی ہے۔"

وہ شاکی ہوئی۔ "اور میرے اصرار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔"

میری نظر پلوشے کی جانب اٹھی وہ مجھے گھور رہی تھی۔ یقیناً گلگارے کے گلے شکوے اسے پسند نہیں آئے تھے۔ کھنکارتے ہوئے میں نے موضوع تبدیل کیا۔ "ننھی پلوشہ کدھر ہے؟" گلگارے نے بیٹی کا نام پلوشہ رکھا تھا۔

"یہ لیں لالا جان!" رزنا نے بچی میرے جانب بڑھائی۔

میں اس کے گال چومتا ہوا بولا۔ "ارے واہ، یہ تو میری پلوشہ سے بھی زیادہ پیاری اور خوب صورت ہے۔"

گلگارے طنزیہ لہجے میں بولی۔ "یہ کیا، آپ کی پلوشہ سے اس کی ماں بھی خوب صورت نہیں ہے۔"

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ گپ شپ کرو، میں شمریز چچا سے چند ضروری باتیں کرلوں۔" پلوشے کی تیز نظریں مجھے ہراساں کر رہی تھیں۔

گلگارے برہمی سے بولی۔ "تھوڑی دیر میرے پاس بھی بیٹھ جائیں اتنی رات کو جھک مارنے نہیں آئی۔"

"صبح سے کونین کی گولیاں چبا رہی ہو۔ آ تو گیا ہوں، پھر ناراض ہونے کا مطلب۔"

اس نے آنکھیں نکالیں۔ "اپنی بہن کی شادی پر آئے ہیں میرے لیے نہیں۔"

میں چڑ کر بولا۔ "اچھا اگلی چھٹی پر تمہارے لیے آجاؤں گا، اب خوش۔"

"احسان نہیں کریں گے۔" وہ منہ بناتے ہوئے پلوشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اور میری پیاری بہن کو لالا نے بھلا ... پلوشہ کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کھلے مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

گل شاید توجہ نہیں دے پائی تھی یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ وہ پلوشے کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔ "... آپ کو ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور راجا اتنے کٹھور ہیں کہ ذرا بھی پروا نہیں ہے۔"

پلوشہ ناگواری چھپاتے ہوئے بولی۔ "آ تو گئی ہوں۔"

وہ شوخی سے بولی۔ "آپ نہیں جانتیں کتنے عرصے سے راجو ترسا رہے ہیں۔ پچھلی ملاقات میں درخواست ... کی۔ نجانے ڈرتے تھے کہ ان کی پلوشہ کو چھین لوں گی۔"

"گل! میں چچا شمریز سے تھوڑی گپ شپ کرلوں۔" لجاجت سے کہتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بھاگنے ...

وہ بادل نخواستہ بولی۔ "ٹھیک ہے جائیں۔"

میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے آواز دی۔ "اور ہاں، میں نے بہت سا ... ہے، وعدہ یاد ہے ناں۔" آخری ملاقات میں میں نے کہا تھا: "اگر پلوشہ کی فکر نہ ہوتی تو کم از کم شہد ختم ہونے ... ٹھہرتا۔" یقیناً اس نے کچھ نہیں بھلایا تھا۔

"جو بچ گیا ساتھ لے جائیں گے۔" اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں دوسرے کمرے میں گھس گیا ... گلگارے جانے ان جانے میں اتنی بے تکلفی سے پیش آ رہی تھی جو میری بیوی کو کسی بھی صورت برداشت نہ ... ۔ مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اتنی اپنائیت کا اظہار کرے گی تو شاید پلوشہ کو ساتھ ہی نہ لاتا۔ چچا شمریز ... ئے تھے۔ میں ان سے گپ شپ کرنے لگا۔ دوران گفتگو پوچھا۔ "گل کے بعد رزنا بھی اپنے گھر کی ہو ...

میں نے اسے چڑایا۔ "تمہارے لیے نہیں آیا، میری گڑیا بہن کی شادی ہے۔"
"آپ نے تو کہا تھا بھوک ختم ہو گئی ہے۔"
میں صاف گوئی سے بولا۔ "رزوا کی شادی کو دو رہ بھوک باقی ہے۔"
وہ شاکی ہوئی۔ "اور میرے اصرار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔"
میری نظر پلوشے کی جانب اٹھی وہ مجھے گھور رہی تھی۔ یقیناً گلگارے کے گلے شکوے اسے پسند نہیں آئے تھے۔ کو
کنکارتے ہوئے میں نے موضوع تبدیل کیا۔ "ننھی پلوشہ کدھر ہے؟" گلگارے نے بچی کا نام پلوشہ رکھا تھا۔
"پلیس لالا جان" رزوا نے بچی میرے جانب بڑھائی۔
میں اس کے گال چومتا ہوا بولا۔ "ارے واہ، یہ تو میری پلوشہ سے بھی زیادہ پیاری اور خوب صورت ہے۔"
گلگارے طنزیہ لہجے میں بولی۔ "یہ کیا، آپ کی پلوشہ سے اس کی ماں بھی خوب صورت نہیں ہے۔"
میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "آپ گپ شپ کرو، میں شمریز بچا سے چند ضروری باتیں کرلوں۔" پلوشے کی تیز نظریں
مجھے ہراساں کر رہی تھیں۔
گلگارے برہمی سے بولی۔ "تھوڑی دیر میرے پاس بھی بیٹھ جائیں اتنی رات کو جھک مارنے نہیں آئی۔"
"صبح سے کونین کی گولیاں چبا رہی ہو۔ آ تو گیا ہوں، پھر ناراض ہونے کا مطلب۔"
اس نے آنکھیں نکالیں۔ "اپنی بہن کی شادی پر آئے ہیں میرے لیے نہیں۔"
میں چڑ کر بولا۔ "اچھا اگلی چھٹی پر تمہارے لیے آجاؤں گا، اب خوش۔"
"احسان نہیں کریں گے۔" وہ منہ بناتے ہوئے پلوشہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اور میری پیاری بہن کو لالہ مطلوب
پلوشہ کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں کھلے مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔
گل شاید توجہ نہیں دے پائی تھی یا تجاہل عارفانہ سے کام لے رہی تھی۔ وہ پلوشے کا ہاتھ تھام کر سہلانے لگی۔ "آ
آپ کو ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور راجو اتنے کٹھور ہیں کہ ذرا بھی پروا نہیں ہے۔"
پلوشہ ناگواری چھپاتے ہوئے بولی۔ "آ تو گئی ہوں۔"
وہ شوخی سے بولی۔ "آپ نہیں جانتیں کتنے عرصے سے راجو ترس رہے ہیں۔ پہلی ملاقات میں دکھانا
نی۔ نجانے ڈرتے تھے کہ ان کی پلوشہ کو چھین لوں گی۔"
"گل! میں چچا شمریز سے تھوڑی گپ شپ کرلوں۔" لجاجت سے کہتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بھاگنے کی
ا۔

وہ بادل نخواستہ بولی۔ "ٹھیک ہے جائیں۔"
میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے آواز دی۔ "اور ہاں، میں نے بہت سنا تھا!
ہے، وعدہ یاد ہے ناں۔" آخری ملاقات میں میں نے کہا تھا: "اگر پلوشہ کی فکر نہ ہوتی تو کم از کم تمہارے
ٹھہرتا۔" یقیناً اس نے کچھ نہیں بھلایا تھا۔
"جو بچ گیا ساتھ لے جائیں گے۔" اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے میں دوسرے کمرے میں گھس
گلگارے جانے ان جانے میں اتنی بے تکلفی سے پیش آرہی تھی جو میری بیوی کو کسی بھی صورت برداشت نہ
۔ مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اتنی اپنائیت کا اظہار کرے گی تو شاید پلوشہ کو ساتھ ہی نہ لاتا۔ چچا شمریز
نے تھے۔ میں ان سے گپ شپ کرنے لگا۔ دوران گفتگو پوچھا۔ "گل کے بعد رزوا بھی اپنے گھر کی ہو

کوشش کروں گی، مگر راجو میں شرکت گوارا نہیں ہے۔"
میں نے صفائی دی۔"وہ شادی شدہ ہے یار!"
"تو شوہر کی وفادار رہے۔"
"پلوشے! یادرکھنا وہ اعلیٰ کردار کی مالک ہے۔"
وہ ترکی بہ ترکی بولی۔"اس کے کردار پر شک نہیں، انداز سے چڑ ہے۔"
میں بے بسی سے بولا۔"تم ناقابلِ علاج ہو۔"
"تو.....'' اس نے طنزیہ نظروں سے گھورا۔"گولی ماردیں نشانہ آپ کا یوں بھی خطا نہیں جاتا۔"
میں جھلاتے ہوئے بولا۔"پلوشے پٹو گی۔"
"ہاتھ تو لگاؤ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں گی۔"
"یار! مجھے نیند آرہی ہے۔"میں نے تنگ آکر آنکھیں بند کر لی تھیں۔
"پہلے کبھی خفا ہو کر سونے کی اجازت دی ہے۔"اس کے ہونٹوں پر دل آویز تبسم ابھرا اور وہ میرے چہرے پر جھک
ی۔
اس کی پیش قدمی کا جواب دیتے ہوئے میں نے وارفتگی سے پوچھا۔"کیا کوئی تمھاری جگہ لے سکتا ہے؟"
اس نے منہ بنایا۔"خوف جگہ چھننے کا نہیں ہے، آپ کی بے راہ روی سے تنگ ہوں۔"
میں بے بسی سے مسکرادیا تھا۔ مجھے سیدھے اور کرارے جواب دینا اسے اچھی طرح آتا تھا۔ بیوی بن کر بھی وہ محبو
رجے پر فائز تھی۔ اور ایسی بیوی کو جو محبوبہ بھی ہو، شوہر کو تگنی کا ناچ نچانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔
"بس یہ افسوس ہے کہ تم مجھے اتنی پیاری کیوں ہو۔"
"یہ فقط جھوٹا دعوا ہے۔"وہ کروٹ لے کر نزدیک سمٹی۔ مجھے گردن پر حلاوت آمیز اور گرم لمس محسوس ہوا جو اعلان کر
لہ اسے میری بات پر سو فیصد یقین تھا۔ بس غصے میں ہونے کی وجہ سے اقرار نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔
"جانتی ہو تمھارے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟"
ہ ناز سے بولی۔"یہی کہ میرے بن رہنا مشکل لگتا ہے۔"
نہیں بلکہ تم چوہوں سے بھی نہیں ڈرتی ہو۔"
نے وارفتگی سے اعتراف کیا۔"آپ کی جدائی سے ڈرتی ہوں۔"
بے ساختہ بولا۔"میں بھی۔"

—●—

دن شادی کے ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ شادی ہو اور ہلا گلا نہ ہو ایسا وزیرستان میں نہیں ہو سکتا۔ گو وہ علاقہ
حدود میں داخل تھا، لیکن وہاں رواج وزیرستان والے ہی تھے۔ پلوشے شور و غل اور ہلہلے کی ویسے ہی متوالی
رقص و سرود میں مشغول رہتی۔ گھر میں چونکہ غیر عورتوں کا بھی اکٹھ ہوتا اس لیے ناشتے کے بعد میں بیٹھک
خری دن عصر کے وقت دلھن لے جانے والوں کے لیے لکڑی کا چند انچ لمبا کھونٹا قریباً تین ساڑھے تین
پر گاڑا گیا۔ رواج کے مطابق جب تک دولھے والے کھونٹے کو گرا نہ دیتے دلھن کو نہیں لے جاتے
کے لیے وہ پوری رات ہی کوشش کرتے رہتے۔
اس کے ساتھیوں کو فائر کی دعوت دی گئی۔ چونکہ یہ تقریب چچا شیریز کی حویلی سے متصل میدان ہی میں

[illegible] چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھ رہی تھیں۔ میرے اندازے میں ہدف کا فاصلہ کلاشن کوف کی کارگر رینج
[illegible] کے دوست باری باری نشانہ آزما رہے تھے۔ مگر کامیابی کسی کے نصیب میں نہیں تھی۔ عموماً
[illegible] کھونٹا زمین میں دبا دیتے ہیں کہ ذرا سا گولی قریب کی لگی اور کھونٹا گر گیا۔ اسی طرح وہ زیادہ سے
[illegible] معمولی سا کھونٹا گاڑتے ہیں تاکہ جلدی ہی جان چھوٹ جائے۔ مگر وہ کھونٹا کچھ زیادہ ہی گہرائی میں
[illegible] زمین سے نہیں نکل سکتا تھا۔ فاصلہ بھی زیادہ تھا۔ مجھے یہ کسی کی شرارت
[illegible] گل نے ہی کی تھی۔
[illegible] پیچھے چوشکار تھا [illegible]۔ لیکن کھونٹا اس کا منہ چڑاتا ہوا قائم دائم تھا۔ کئی میگزین خالی
[illegible] دوست قسمت آزمائی کر چکے تھے۔
[illegible] دوست نشانہ سادھنے سے کترانے لگے تھے۔
[illegible] میں نہیں ہوئی تھی۔ اب تو وہ [illegible] دوست نشانہ سادھنے سے کترانے لگے تھے۔
[illegible] بیٹھ دلچسپی سے ان کی کوششوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں موجود لوگوں میں فقط چچا شیرزی ہی
[illegible] چچا شیرزے پہلو میں [illegible] اور میرا تعارف کرانے یا اپنی نشانہ بازی سے انھیں متاثر کرنے کا کوئی
[illegible] ثمرخان قریب آ کر میرے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔
[illegible] کھونٹا کافی گہرائی تک ٹھونکا گیا ہے۔ اس لیے ٹوٹ سکتا ہے گر نہیں سکتا۔"
[illegible]
میں مسکرایا۔ "تو؟"
ثمرخان بولا۔ "جلدی ہی آپ کو فائر کرنا ہوگا۔"
میں نے مسکرا کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ؟"
ثمرخان نے حویلی کی چھت کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کھڑی ہیں، پلوشہ باجی بھی ان کے ہمراہ ہیں۔"
میں نے منہ بنایا۔ "پہلے سے شک تھا یہ کچھ ایسی ہی کریں گی۔"
ثمرخان نے مزید انکشاف کیا۔ "گل باجی کہہ رہی ہیں تین گولیوں ہی میں کھونٹا گرانا ہوگا۔"
چچا شیرزے بھی ہماری باتوں پر کان دھرے تھے۔ میری طرف جھک کر دبے لہجے میں بولے۔
"بہت خوشی ہو رہی ہے۔ مجھے چاہوتا پلوشہ بیٹی اور گل یہ شرارت کریں گی تو انھیں کبھی کھونٹا لگانے نہ بھیجتا۔"
شیرزچچا کی درخواست نما حکم پر مجھے اٹھنا پڑا۔
تین سو میٹر کے فاصلہ پر نشانہ لگانا میرے لیے مذاق ہی تھا لیکن اس صورت میں جب میرے پاس
سنائپر گن ہوتی۔ کلاشن کوف، یورشی رائفل (اسالٹ رائفل) ہے اور صفر ہونے کے باوجود اس سے اتنی باریکی میں نشانہ
نہیں سادھا جا سکتا۔ قارئین کی معلومات کو عرض کرتا چلوں کہ ہر ہتھیار کی گولی میں بارود کی مخصوص مقدار ہوتی ہے، لیکن پھر
بھی بارود جانچنے والے پیمانے کو وزن کی ایک بریکٹ بتائی جاتی ہے جیسے جی تھری کی ہر گولی میں 382 گرین (گرین
وزن کا پیمانہ ہے) سے لے کر 394 گرین تک کا بارود معیاری تصور کیا جاتا ہے۔ اور ایسا یورشی رائفلوں میں ہوتا ہے۔
بارود کی مقدار کا ذرا سا فرق گولی کو ہدف سے اوپر نیچے کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس سنائپر رائفلوں میں ہر گولی کے اندر مقرر
مقدار ہی میں بارود پڑتا ہے۔ اس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں ہوتا۔ البتہ ایک ہی ہتھیار کے ایمونیشن کو جب مختلف کمپنیاں
بناتی ہیں تو ہر کمپنی ایمونیشن میں اپنے حساب سے بارود ڈالتی ہے۔ اور فائرر کی آسانی کو ہر کمپنی اپنے تیار کردہ ایمونیشن کے
ساتھ فائرنگ ٹیبل بھی جاری کرتی ہے تاکہ فائرر ایمونیشن جانچنے کے جھنجھٹ سے بچ جائے۔
میں یہ معلومات حاضرین کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اور نہ یہ ان کے مطلب کی بات تھی۔ ان کے لیے فقط ایک ہی دلیل تھی
کہ "یہ گز اور یہ میدان۔" کھونٹا گر گیا تو واہ واہ۔ نشانہ خطا ہو گیا تو استہزائی نعرے۔

البتہ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ وہاں مجھے جاننے والا کوئی نہیں تھا کہ نام کو بٹا لگتا۔ چچا شمریز کے کہنے پر پلوشے کو سمجھانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ البتہ گل نے دوسری خواتین کے سامنے کوئی لاف زنی (ڈینگیں مارنا) کی تو گل یقیناً اس کی سبکی ہوتی۔ بہرحال سر پر پڑی مصیبت کو گلے لگانا مجبوری بن جاتی ہے۔

فائر کرنے کی مخصوص جگہ پر جا کر میں ترچھا بیٹھ گیا۔ حاضرین کا بار بار قہقہہ ابھرا کیوں کہ ہدف کی جانب میرا بایاں بازو آرہا تھا۔ اگر فائرنگ پوزیشن کی بات کی جائے تو ایک فائرر بارہ مختلف حالتوں سے فائر کرسکتا ہے۔ تفصیل بتانا تو باعث طوالت ہوگا البتہ یہ عرض کرتا جاؤں کہ فائر کرنے کو سب سے بہترین لیٹی حالت ہوتی ہے۔ اور سنائپر عموماً اسی حالت میں فائر کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد آرام دہ اور پرسکون بیٹھی پوزیشن ہوتی ہے۔ عام فائرر تو بیٹھی پوزیشن میں اپنا رخ ہدف کی جانب ہی رکھتے ہیں مگر سنائپرز کا انداز تھوڑا جدا ہوتا ہے۔

میں نے آرام دہ حالت میں بیٹھ کر گھٹنے کھڑے کیے اور دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک دیں، کلاشن کوف کا فرنٹ ہینڈ گارڈ بائیں کہنی پر رکھ کر میں نے بایاں ہاتھ ریئر سائیٹ کے پیچھے لا کر رائفل کو مضبوطی سے جکڑ لیا تھا۔ دایاں ہاتھ پسٹل گرپ کے گرد لپیٹتے ہوئے میں نے شہادت والی انگلی ٹریگر پر رکھی، دایاں گال بائیں ہاتھ کے ساتھ رسیور کور پر ٹیک کر بائیں آنکھ بند کر دی۔ دائیں آنکھ سے ریئر سائیٹ کے کٹاؤ میں سے دیکھتے ہوئے میں نے فرنٹ سائیٹ کی ٹپ کا اوپری کنارہ کھونٹے کے پیندے سے ملایا اور سانس روک کر لبلبی دبا دی۔ کلاشن کوف کی گولی کھونٹے کا ایک حصہ اڑا کر لے گئی تھی۔ حاضرین کا تحسین آمیز نعرہ بلند ہوا تھا۔ میں نے شست تبدیل کیے بغیر دوبارہ نشانہ سادھا، اب ہدف کا حجم پہلے سے کم رہ گیا تھا۔ چند سیکنڈز کے وقفے سے میں نے دوبارہ لبلبی دبا دی۔ کھونٹے کا زمین سے اوپر نظر آنے والا حصہ غائب ہوگیا تھا۔ خشک لکڑی کے تین چار انچ چوڑے ٹکڑے کی کلاشن کوف کی گولی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مجھ سے پہلے فائر کرنے والے اگر براہ راست کھونٹے کو نشانہ بنا لیتے تو کامیاب ہوگئے ہوتے۔

گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے میگزین اتاری، رائفل کاک کی، چیمبر سے گولی نکال کر میگزین میں بھری اور میگزین چڑھا کر سیفٹی لگا دی۔

سب سے پہلے دولھے صاحب نے مجھے چھاتی سے لگاتے ہوئے پیٹھ تھپتھپائی تھی۔ اس کے بعد دولھے کے دوستوں نے باری باری معانقہ کر کے تعریفی جملے کہے تھے۔ ملنے ملانے سے فارغ ہو کر میں چچا شمریز کے پہلو میں جا بیٹھا۔ میری جانب جھکتے ہوئے وہ تحسین آمیز انداز میں بولے۔

''ان بے چاروں کو کیا پتا کہ جس نشانے بازی کو یہ کارنامہ گردان رہے ہیں وہ ایس ایس کے لیے معمولی بات ہے۔''

میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے بعد ڈھول وشہنائی کے ساتھ مردوں کا رقص شروع ہوگیا تھا۔ مغرب کی اذان سے تھوڑا پہلے عارضی طور پر ہنگامہ سرد ہوا تھا۔ اسی رات انھوں نے دلھن کو لے جانا تھا۔

نماز کے بعد کھانا کھایا گیا۔ اس کا سارا خرچ اور بندوبست دولھے کے گھر والوں کی ذمہ داری تھی۔

کھانا میں نے ثمر خان اور چچا شمریز کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ثمر خان نے انکشاف کیا۔ ''آج گل باجی اور پلوشہ باجی نے رقص کا مقابلہ کیا اور گل باجی ہار گئیں۔''

میں ہنسا۔ ''گل بے چاری کا کیا قصور، پلوشے سے پیشہ ور رقاصہ بھی ہار جائے گی۔''

عشاء کے بعد پھر ہنگامہ شروع ہوگیا تھا۔ کلاشن کوفوں کے دہانے کھل گئے تھے۔ مسلسل ہوائی فائرنگ کر کے جانے وہ کسی جذبے کا اظہار کر رہے تھے۔ شادیوں میں سیکڑوں، ہزاروں گولیاں ہوا میں اڑانا پٹھانوں ہی کا خاصہ ہے۔ گو میرا ہتھیار اور فائر سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ دوران تربیت جانے میں کتنی گولیاں پھونک چکا ہوں، لیکن وہ

اس طرح بے ہنگم اور فضول کیوں ہوتا۔ گر [illegible] تصور صاحب دیکھ لیتے تو [illegible] دل [illegible] جاتا ہوا
سرور کرنے لگا تھا۔ میں بیٹھک میں آ گیا۔ اندر لوگ بھی سو چکے نہیں تھا۔ اس [illegible] نظر [illegible] ہوا آیا۔

''دادا جان! پلوشہ باجی پھر ناچ رہی ہیں۔''

میرے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا اور دل اپنی الجھن [illegible] دیکھنے کا [illegible] ثمر خان کے ساتھ
بیٹھک سے گھر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں شاید دروازے پر تھا، رہا گر ثمر خان میرا ہاتھ پکڑ
کھینچتے ہوئے بولا۔

''دادا! یہاں سے خاک نظر آئے گا، میرے ساتھ آئیں۔'' وہ مجھے بیٹھک سے ملحق کمرے میں لے گیا، وہاں سے
کمروں کے اندر ہی اندر سفر کرتے ہوئے ہم سیڑھی والے کمرے میں پہنچا اور چھت پر چڑھ گئے۔ [illegible] منظر تھا وہ
وجود میری پیاسی نظروں کے سامنے تھا۔ گھر میں میں نے اس کی کئی بار منت کی تھی مگر وہ میرے سامنے رقص کرتے ہوئے
شرماتی تھی۔ اس مرتبہ بھی پر آ کر اس کا [illegible] دیکھنا ہوگا مگر مجھے دیکھ کر اسے رقص بھول گیا تھا۔ اور بعد میں اس نے یہ
کہتے ہوئے کھلا انکار کر دیا تھا کہ ''بھول گئے کہ دادی نے ناچنے سے منع کیا تھا۔''

چچا ثمریز نے گھر کے صحن میں سورج کی روشنی سے براہ راست چارج ہونے والی دو بڑی بتیاں لگائی تھیں جن کی وجہ
سے اچھی خاصی روشنی پھیلی تھی۔ اتنی کہ مجھے پلوشہ کے ماتھے میں اٹکے ہوئے ٹیکے کے [illegible] نظر آ رہے تھے۔ اس
کے گرد لڑکیوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا اور وہ تالیاں بجاتے ہوئے شور مچا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے
کہ گہری نیلی آنکھوں والی گل والہانہ انداز میں لہراتے ہوئے پلوشہ کا ساتھ دینے لگی۔ مجھے پرائی لڑکی کو اس کی بے خبری
میں دیکھنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''چلتے ہیں۔'' میں نے ثمر خان کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

ثمر خان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکشاف کیا۔ ''گل باجی جانتی ہیں آپ انھیں دیکھ رہے ہیں۔''

''کیا؟'' میں متعجب ہوا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''انھوں نے ہی آپ کو یہاں لانے کا کہا تھا کہ ان کے اور پلوشہ باجی کے درمیان ہار جیت کا
فیصلہ آپ کریں گے۔''

میری نظریں خوش بدن دوشیزہ کی جانب اٹھیں جس کا جسم خوب صورت انداز میں بل کھاتے ہوئے لہرا رہا تھا۔ ثمر
خان کے انکشاف نے مجھے حیران کے ساتھ پریشان بھی کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ گل خود مجھے اپنا رقص دکھانے کی
خواہاں تھی میں اس نظارے سے لطف اندوز نہیں ہو پایا تھا۔

''چلو ثمر خان! اگر کسی نے ہمیں یہاں دیکھ لیا تو بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔'' ثمر خان کو زبردستی کھینچتے ہوئے میں سیڑھی
سے نیچے اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم بیٹھک میں پہنچ گئے تھے۔

رات کے دس بجنے کو تھے جب چچا ثمریز میرے پاس آیا۔ رنڑا کو رخصت کرنے وقت ہو گیا تھا۔
انھوں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''ذیشان بیٹا! ثمر خان کے ساتھ جا کر اپنی بہن کو رخصت کر دو۔''

میں نے اعتراض کرنا چاہا۔ ''چچا جان!''

انھوں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اسے بہن نہیں سمجھتے یا کوئی اور مسئلہ ہے۔''
''چلو ثمر خان۔'' میں کھڑا ہو گیا۔ ثمریز چچا نے اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔
ثمر خان اور میں اندر پہنچے، عورتوں نے رنڑا کو گھیرا ہوا تھا۔ انھوں نے ادھر اُدھر ہو کر ہمیں راستہ دیا۔ پلوشہ اور گل

رنڑا کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔
''کتنی پیاری لگ رہی ہے میری گڑیا بہن۔'' رنڑا کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میں نے اس کا سر بلند کیا۔
تیز سسکی بھرتے ہوئے اس نے میری چھاتی پر سر رکھ دیا تھا۔ شفقت و عقیدت بھری پاکیزہ محبت کے احساس نے مجھے لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں بہن کے رشتے سے تہی دامن ہوں۔ رنڑا ایسی لڑکی تھی کہ پہلے دن سے مجھے لالا جان کہا تھا۔ اسے اپنے لالا پر بھروسہ، اعتماد و فخر تھا، وہ اپنے لالا کو دنیا کا سب سے بہادر فرد گردانتی تھی، وہ چھوٹی موٹی اور ذرا سی لڑکی مجھے سگی بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ اس کے رونے نے مجھے بھی جذباتی کر دیا تھا۔ منہ بولی بہن کو رخصت کرتے وقت میری یہ حالت تھی تو سگی بہنوں کو رخصت کرنے والوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ یقیناً ماں کے بعد بہن بہت ہی پیارا، خوب صورت اور دلکش رشتہ ہے۔ اپنے بھائیوں کے لیے ہمیشہ قربانیاں دینے والیاں، بھائی کے لیے اپنے حق سے دست بردار ہونے والیاں، بہ ظاہر نرم و نازک مگر درحقیقت چٹانی ارادوں کی مالک بہنیں اللہ پاک کا بہترین تحفہ ہیں۔
میں اس کے لیے تین قیمتی سوٹ، خوب صورت جوتے، اور ایک موبائل فون لے کر آیا تھا۔ یہ تحائف میں نے آتے ساتھ اس کے حوالے کیے تھے۔ اس وقت وہ میرے ہی لائے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تھی۔
میرے بعد وہ ثمر خان کو بھی چمٹ گئی تھی۔ وہ اس سے چھوٹا تھا، لیکن بھائی چھوٹا ہو یا بڑا بہنوں کا محافظ در کھوالا ہوتا ہے۔
''بہادر بہنیں تو نہیں روتیں۔'' اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے بہ ظاہر مزاحیہ انداز اپنایا مگر میرے حلق سے رندھی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔
''چلو ثمر خان۔'' رنڑا کا دایاں بازو تھامتے ہوئے میں نے ثمر خان کو اشارہ کیا۔ اور ہم دونوں اسے گھر سے باہر لے آئے۔ وہاں بار برداری کو زیادہ تر گھوڑے، خچر، اونٹ اور گدھے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ ایک اونٹ پر ڈولی باندھے ہوئے تھے۔ ویسے تو وزیرستان میں دلھن لے جانے کو گاڑیوں کا رواج ہے لیکن جن علاقوں میں گاڑیوں کی آمدورفت نہیں ہو سکتی وہاں آج بھی اونٹ اور گھوڑے وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔
رنڑا کے سر پر بوسہ دے کر اسے میں نے بازوؤں میں بھر کر سجی ہوئی ڈولی میں بٹھا دیا۔ گل بھی اس کے ہمراہ بیٹھ گئی تھی۔ اونٹ کو اٹھایا گیا۔ پانی کے دو قطرے میرے گالوں پر لڑھکے اور زبان سے بے ساختہ نکلا۔
''اللہ پاک تمھارا نصیب اچھا کرے میری گڑیا بہن۔''
اپنے بازو پر ہلکی سی گرفت کا احساس ہوا۔ میں چونکتے ہوئے متوجہ ہوا۔ وہ پلوشے تھی۔
''چلیں۔'' اس کے لہجے میں بھی اداسی گھلی تھی۔ میں اس کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ گیا۔ ثمر خان اور شیر یز چاچا بیٹھک گاہ میں گھس گئے تھے۔ قریبی رشتہ داروں کی چہل پہل جاری تھی لیکن ایک رنڑا کے جانے سے گھر ویران لگنے لگا تھا۔ رنڑا'' پشتو میں روشنی کو کہتے ہیں۔ اور اس وقت لگ رہا تھا اس گھر کی روشنی حقیقت میں رخصت ہوگئی ہو۔
''راجو! پریشان نہیں ہوتے۔'' پلوشہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگی۔ وہ نٹ کھٹ ...کی میرے متعلق نہایت حساس تھی۔
میں دل گرفتہ ہوا۔ ''پلوشے مجھے آج محسوس ہو رہا ہے کہ سپوگمائے کی جدائی پر تمھیں کتنا دکھ ہوا ہوگا۔''
''اچھا سچ بتائیں، میرا رقص اچھا لگا یا گلگارے کا۔'' اس نے ایک دم موضوع تبدیل کر دیا تھا۔
...ں متحیر ہوا۔ ''تمھیں کیسے پتا میں دیکھ رہا تھا۔''
...اطمینان سے بولی۔ ''گلگارے نے بتایا تھا۔''

مجھے لوگارے کے فعل پر کوفت ہوئی تھی۔ جانے وہ کیا ثابت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ایک بات یقینی تھی کہ وہ مضبوط کردار کی مالک تھی۔ گو مجھ سے گفتگو کرتے وقت وہ کچھ زیادہ ہی حق جتانے لگتی تھی، مگر کبھی اکیلے میں بھی اس نے اخلاق سے گری ہوئی بات یا حرکت نہیں کی تھی۔ میں خود بھی اس کے ساتھ کسی رشتے کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ شروع دن سے میرے بہن کہنے کو اس نے ناپسندیدہ گردانا تھا۔ وہ خطوط اور موبائل فون کے پیغامات میں بھی خود کو "آپ کی گڑیا بہن رنڑا" کی بجائے لکھا کرتی۔" براہ راست اس نے کبھی مجھے بھائی تسلیم نہیں کیا تھا۔ اپنی شادی سے پہلے تک تو اس کا یہ فعل قابل اعتراض نہیں تھا۔ مگر اب وہ میرے بارے دل میں کوئی لطیف جذبات رکھتی بھی تھی تو اسے دل کی بات چھپانا چاہیے تھی۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔" پلوشے نے میری ٹھوڑی سے پکڑ کر ہلایا۔

میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی، اسے حقیقت بتائے بغیر دھیرے سے بولا۔ "میں صرف اپنی پلوشے کا رقص دیکھنے آیا تھا۔ جب گل شروع ہوئی تو میں چلا گیا تھا۔"

"اچھا۔" طمانیت سے کہتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

اگلے دن طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی گلکارے کو اس کا شوہر وہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ چند منٹ چچا شمریز کے ساتھ بیٹھی رہی۔ مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے اس نے پرخلوص انداز میں شکریہ ادا کیا تھا۔ نشانہ بازی کی صلاحیت نے پٹھانوں کے درمیان مجھے ہمیشہ سرخ روئی رکھا ہے۔ ہتھیار سے لگاؤ پٹھانوں کے خون میں شامل ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عربوں میں نیزہ بازی اور تیر اندازی کا شوق ہوتا تھا۔ نبی پاک ﷺ نے بھی اس شوق کو پسند فرمایا ہے۔ بلاشبہ ایک جنگجو قوم ہی اسلام کی اشاعت، حفاظت اور ترقی کا ضامن ہو سکتی ہے۔ زیادہ دور نہ جائیں 1948 کی پاک بھارت جنگ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ، جب ریاست کشمیر میں ہندوؤں، سکھوں اور ریاستی افواج کی قتل و غارت کی کارروائیاں حد سے بڑھیں تو کشمیر کے انقلابی لیڈروں نے شمال مغربی سرحد کے قبائلی سرداروں سے رابطہ کر لیا۔ قبائلی سرداروں نے کشمیری مسلمانوں کی آواز پر لبیک کہا اور پٹھانوں کے جتھے جنگ آزادی میں شامل ہونے کو کشمیر کی طرف چل پڑے۔ اس وقت پاکستانی فوج کے بکھرے ہوئے غیر منظم یونٹ یا تو پنجاب میں تقسیم ملک سے پیدا شدہ حالات سے برسرپیکار تھے، یا مہاجرین کے قافلوں کو حفاظت مہیا کر رہے تھے کہ ان قافلوں پر ہندو اور سکھ بلوائی حملے کر رہے تھے۔ قبائلیوں کی کشمیر میں آمد سے ہی آزادی کی تحریک کو چار چاند لگ گئے اور مہاراجہ کی فوج کو ہر جگہ شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان آرمی کی کشمیر آمد تک ہندوؤں کو ہر جگہ انھی پٹھانوں نے شکست و ہزیمت سے دوچار کیا تھا۔ اور ان کا راستہ روکا، ورنہ ہندو اس وقت گلگت تک پہنچ چکا ہوتا۔ گو بعد میں پاک آرمی نے حالات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، کہ قبائلی پٹھان کوئی منظم فوج نہیں تھے۔ وہ دشمن کے خلاف چھاپہ مار کارروائی تو کامیابی سے کر گزرتے لیکن دشمن کی شکست کے بعد زمین پر قبضہ جمانے کے بجائے کسی اور سمت کا رخ کر لیتے تھے۔

پلوشے تھوڑی دیر پہلے ہی شمر خان کے ساتھ گھر سے باہر نکل گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی کلاشن کوف اور شمر خان کے ہاتھ میں خالی بوتلیں دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ جلد ہی کلاشن کوف کے فائر کی آواز سنائی دینے لگی۔

گل بی بی کو سلا کر ہمارے پاس آ بیٹھی تھی۔

نشست سنبھالتے ہی وہ شوخی سے بولی۔ ''شکریہ۔''

''کس بات پر؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے انکشاف کیا۔ ''اگر کل آپ کھونٹے کو نہ گراتے تو میری ہتک ہو جاتی۔ میں نے تماشا دیکھنے والی لڑکیوں کے سامنے اعلان کیا تھا کہ رزا کا۔۔۔ لالا جان تین گولیوں میں ہدف گرا دے گا۔''

میں معنی خیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''رزا کا لالا جان، تمھارا کیا لگتا ہے؟''

شمریز چچا نے اونچا قہقہہ بلند کیا تھا۔ گل کے جواب دینے سے پہلے دروازے پر دستک ہوئی اور چچا شمریز اس جانب

جواب گول کرتے ہوئے اس نے موضوع تبدیل کیا۔ "پلوشہ کا رقص اچھا تھا یا میرا؟" ظاہر ہے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور جو موضوع اس نے چھیڑ دیا تھا اس بارے میں متردد تھا۔ گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے میں نے انکشاف کیا۔ "کل ہم واپس جائیں گے۔"

وہ شاکی ہوئی۔ "کیوں... کیوں... کیوں؟"

میں لجاجت سے بولا۔ "گل! اچھی کے پانچ دن بتا دیے اور تین دن گھر تک پہنچنے میں لگیں گے۔"

وہ سرعت سے بولی۔ "خواگا ووبے سے پانچ کلومیٹر شمال کی طرف ترنگ نیل ہے اب ادال سے انگور اڈے تک گاڑی مل جاتی ہے۔ اگر یہاں سے صبح کو چلیں تو سہ پہر تک انگور اڈے پہنچ جائیں گے۔"

میں نے چڑچڑا ہوا۔ "تو؟"

وہ اطمینان سے بولی۔ "دو دن مزید رہنا پڑے گا۔"

میں تنگ ہوا۔ "گل! سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ برہمی سے بولی۔ "یہ کوشش آپ کیوں نہیں کرتے۔"

میں سٹپٹاتے ہوئے بولا۔ "یہاں چار دن تو گزار لیے ہیں۔"

وہ بے نیازی سے بولی۔ "اپنی گڑیا بہن کے لیے گزارے ہیں۔"

"شاید ضد ہٹ دھرمی تمہارا مذہب ہے۔" میں جھلا گیا تھا۔

"تو جائیں، آپ کو پکڑا تو نہیں ہے۔" وہ بگڑ گئی تھی۔

گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے سر پکڑ لیا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اپنی اہمیت جتانا چاہ رہی تھی۔ مجھے دو دن رکنے میں اتنا تردد نہ ہوتا اگر گزشتہ رات پلوشہ سختی سے واپسی کا اعلان نہ کر چکی ہوتی۔ تب میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اب میرے رکنے پر وہ بدک سکتی تھی۔ یوں بھی گل کارے اور میرے تعلق کو وہ ناپسندیدگی کی سند سے نواز چکی تھی۔ اس کے نزدیک کسی شادی شدہ لڑکی کا مجھ سے بے تکلف ہونا نہ صرف غلط بلکہ بہت بے ہودہ تھا۔ گوزرا بھی نہایت دلکش، جاذب نظر اور پرکشش لڑکی تھی، لیکن اس کی زبان مجھے لالا جان کہتے نہیں تھکتی تھی۔ میں بھی اسے گڑیا بہن کہتا تھا۔ لیکن گل کی گفتگو میں نہ تو بہن بھائی کا سابقہ، لاحقہ شامل ہوتا اور نہ غیروں کی سی جھجک تھی۔ وہ بے تکلفی اور اپنائیت سے مخاطب ہوتی۔ مجھے گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں میں وارفتگی پوشیدہ ہوتی جو پلوشہ کو بالکل ناقابل قبول تھی۔

اچانک پلوشہ چہکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "راجو! دو تین گولیوں سے گل جتنے فاصلے پر میں نے بوتل کو نشانہ بنالیا ہے۔ آپ بے شک ثمر خان سے پوچھ لیں۔" وہ دروازے کو رخ کرکے ثمر خان کو آواز دینے لگی۔

گل ایک جھٹکے سے اٹھ کر بغلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"جی باجی!" ثمر خان اندر آیا۔

"اسے کیا ہوا؟" پلوشہ نے گل کی پشت کو گھورا۔

میں نے سرعت سے بہانہ گھڑا۔ "شاید ننھی پلوشہ جاگ گئی ہے۔"

منہ بناتے ہوئے اس نے کندھے اچکائے اور ثمر خان کی جانب متوجہ ہوئی۔ "ثمر خان! راجو کو بتاؤ ناں میں نے دو ... کتنے ... ہدف کو نشانہ بنایا ہے۔"

بالکل سچ کہہ رہی ہیں۔"

وہ سعادت مندی سے بولا۔"جی لالا جان، باجی سچ کہہ رہی ہیں۔"

پلوشے ہر قسم کے ہتھیار چلا لیتی تھی مگر اس کا نشانہ بالکل واجبی سا تھا۔ ایسے لڑاکے قریبی لڑائی میں تو کارگر فائر کر لیتے ہیں لیکن سنائپنگ ان کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ میں نے سر جھٹک کر متبسم ہوا۔

"ثمر خان سچ بتاؤ، پلوشے نے کتنی گولیاں فائر کی ہیں؟" چونکہ کلاشن کوف کی "ٹھ ٹھ" کافی دیر تک سنائی دی تھی اس لیے پلوشے کی دو تین گولیوں والی بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ہکلایا۔"دو ... دو ہی کی ہیں لالا جان!"

میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔"تمھارے بابا جان جھوٹ کے بارے کیا کہتے ہیں۔"

وہ سرعت سے بولا۔"یہی کہ جھوٹ مذاق میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔"

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے اشارہ کیا۔"اب سچ اگلو۔"

پلوشہ نے جلدی سے لقمہ دیا۔"زیادہ سے زیادہ پانچ، چھے گولیاں چلائی ہوں گی۔ کیوں ثمر خان۔"

"ثمر خان سر جھکاتے ہوئے بولا۔"لالا جان! صرف دو ہی چلائی ہیں۔"

میں نے آنکھیں نکالیں۔"ثمر خان "

وہ گھبرا کر بولا۔"سس ... سچ کہہ رہا ہوں لالا جان صرف دو میگزین خالی کی ہیں۔"

پلوشہ تلملاتے ہوئے بولی۔"میرا موبائل فون فوراً واپس کرو۔"

وہ لجاجت سے بولا۔"بب ... باجی! لالا جان نے زبردستی اگلوایا ہے۔"

اس نے برہمی ظاہر کی۔"میں کچھ نہیں جانتی، جو معاہدہ ہوا تھا تم اس پر پورے نہیں اترے۔"

ثمر خان نے ملتجی نگاہوں سے مجھے گھورا، میں متبسم ہوا۔"بھاگ جاؤ، اسے میں پکڑ لیتا ہوں۔"

وہ فوراً مڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ پلوشہ کے قدم اٹھانے سے پہلے میں نے اسے تھام لیا اور اس کی ہلکی نیلی آنکھوں کو باری باری ہونٹوں سے چھوتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔"جب ان رائفلوں کا نشانہ رینج ماسٹر سے کئی گنا زیادہ کارگر اور درست ہے تو تمھیں کسی اور ہتھیار سے خود کو اچھا نشانہ باز ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"دروازہ کھلا ہے کوئی آ جائے گا۔" حیا آلود لہجے میں کہتے ہوئے وہ کسمساتے ہوئے میری گرفت سے نکل گئی۔

میں نے ہنستے ہوئے کلاشن کوف اٹھالی تا کہ صفائی کر سکوں۔ فائر ہونے کے بعد جتنا جلدی ہتھیار کو صاف کیا جائے بہتر ہوتا ہے۔ دیر ہونے کی صورت میں بارود کے ذرات اور بُلٹ کی رگڑ سے چھٹنے والے سیسے سے بیرل کی اندرونی سطح رفتہ رفتہ خراب ہونے لگتی ہے۔ زیادہ عرصہ گزرنے پر بیرل کے اندر گڑھے بن جاتے ہیں اور ہتھیار فائر کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ذاتی ہتھیار کی صفائی کے بارے سنائپر تو کچھ زیادہ ہی وہمی ہوتے ہیں۔ خاص کر راؤ تصور صاحب جیسے استاد تو اپنے چہرے کی صفائی سے زیادہ توجہ اپنے ہتھیار کی صفائی پر دیتے ہیں۔

●

رات کے کھانے پر چچا شمریز نے جانے کی بابت دریافت کیا تھا۔ یقیناً اس کی منشا یہی تھی کہ ہم چند دن مزید رہیں۔ میرے بولنے سے پہلے گل نے اطمینان سے کہا۔"بابا جان! یہ دو دن مزید ٹھہریں گے۔"

چچا شمریز مسرت سے بولے۔"سچ؟" اسی وقت پلوشہ نے مجھے گھورا، لیکن کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

میں نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔"چچا جان! آپ ثمر خان کو پڑھنے شہر کیوں نہیں بھیجتے۔"

میرے جواب دینے سے اعراض برتنے کو جانے انھوں نے کیا سمجھا تھا، مگر دوبارہ اس موضوع پر زبان

کمولی۔ میں پلوشے کی موجودی میں گل کو نہیں سمجھا سکتا تھا اور نہ میرا الحاجت بھرا لہجہ ن کر پلوشے بھر جاتی۔ گل وہ طال،
ناجائز نہیں تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں میری محسنہ تھی اور اتنا حق جتا سکتی تھی کہ وہ دن رکنے کو کہہ رے، لیکن اپنی جان جان
پلوشے کی مرضی کے خلاف کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اسے ناراض کرنے کا حوصلہ کرنا کم از کم میرے بس سے باہر
تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ گل کو اکیلے میں اپنی مجبوری کا بتا کر اور اگلی چھٹی پر آنے کا وعدہ کر کے منالوں گا۔ وہ نہایت سمجھدار لڑکی
تھی، یقیناً میری حالت کا ادراک اسے آسانی سے ہو جاتا۔

شمریز چچا بولے۔ ''گل تو کب کا زور دے رہی ہے، یہ بے شرم خود ہی شوق نہیں رکھتا۔''

وہ معصومیت سے بولا۔ ''لالا جان! اسکول جانے کا کیا فائدہ، جبکہ میں آپ کی طرح نشانے باز بننا چاہتا ہوں۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''یہی تمھاری بے وقوفی ہے۔ کیا بغیر تعلیم کے اچھا نشانے باز بننا ممکن ہے۔''

وہ معترض ہوا۔ ''نشانے بازی کا تعلیم سے کیا تعلق۔''

''ایک گولی فائر کرتے وقت ہوا کی رفتار، بلندی پستی کا زاویہ، ہدف کا فاصلہ، ایمونیشن کی قسم اور کئی ایسی باتوں کا
جاننا ضروری ہوتا ہے جو بغیر تعلیم کے ممکن نہیں اور یہ سب کچھ میں تب سکھا سکتا ہوں جب تم اچھی تعلیم حاصل کرلو۔'' میرے
لبوں پر شرارتی مسکراہٹ ابھری۔ ''تمھاری پلوشہ باجی کو میں کوشش کر کے بھی اچھا نشانے باز نہ بنا سکا۔ اگر پڑھی لکھی
ہوتی تو ایک بوتل پر دو میگزین ایمونیشن نہ پھونکتی۔''

چچا شمریز اور گل کا قہقہہ بلند ہوا، پلوشے برہمی سے مجھے گھورنے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے میں پڑھائی کرنے شہر جاؤں گا مگر آپ وعدہ کریں جب میں تعلیم مکمل کرلوں گا تو مجھے اپنے جیسا
نشانے باز بنائیں گے۔''

''ان شاءاللہ میں تمھیں ضرور سکھاؤں گا۔'' میں نے وعدہ کرنے تساہل نہیں برتا تھا۔

کھانے کے بعد ہم عشاء تک وہیں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گل کو کس طرح اکیلا کر
کے سمجھاؤں۔ ایک دو بار آنکھیں چار ہونے پر جبکہ پلوشہ کسی اور جانب متوجہ تھی میں نے اشارے میں اجازت مانگی مگر
اس نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

عشاء کی نماز پڑھ کر میں موقعے کا متلاشی ہوا مگر پلوشے مجھے کمرے میں لے گئی۔

''راجو! سوتے ہیں، کل کا دن سفر میں گزرے گا اور مجھے سخت نیند آئی ہوئی ہے۔''

''جیسی سرکار کی مرضی۔'' میں نے سرِ تسلیم خم کیا۔

وہ طمانیت سے مسکرا دی تھی۔ ہم سونے لیٹ گئے مگر میری نظروں سے نیند غائب تھی۔ میں کسی طرح گل کو قائل کرنا
چاہ رہا تھا۔ ورنہ صبح ہمارے چلے جانے کو وہ اپنی ہتک خیال کرتی، اس کا مان ٹوٹ جاتا، وہ پکی ناراضی گانٹھ لیتی۔ اور یہ مجھے
منظور نہیں تھا۔ اسے منانا اتنا بھی دشوار نہیں تھا بس پلوشہ کی غیر موجودی میں اسے ملنے کی ضرورت تھی۔ ارادہ تھا کہ پلوشہ
کے سو جانے پر اس کے پاس جاؤں گا۔ یقیناً اس نے چچا شمریز اور شمر خان کے کمرے ہی میں سونا تھا۔ اور چچا شمریز کی
موجودی مجھے تقویت دیتی۔

پلوشے تھوڑی دیر اٹھکیلیاں کر کے سو گئی تھی۔ وہ کافی گہری نیند سوتی تھی۔ شادی ہو جانے کے باوجود اس کی نیند الھڑ
نادان لڑکیوں کی طرح بے فکری والی تھی۔ لیکن میں اس کے گہرے سانس سن کر بھی نہ اٹھ سکا کہ وہ میرے بازو پر سر رکھے
لیٹی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میری چھاتی پر دھرا تھا۔ میں چاہت بھری نظروں سے اس کا معصوم چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ میری
شریکِ حیات تھی، میرے دکھ سکھ کا ساتھی، ہنسی خوشی کی حصے دار، درد و غم بانٹنے والی، میری عزت، میرا مان، میری

محبت، چاہت، الفت۔ اس کے دم سے میری زندگی میں بہاریں تھیں، وہی میرے قہقہوں کی ضامن تھی، اس کی وا
میرے گھر کی رونقیں تھیں، بلاشک وشبہ وہ بہت قیمتی، اصول اور بہترین بیوی تھی۔ اس کی وجہ سے میری آنکھیں بوجھل
ہوئی تھیں۔ اسے تکتے تکتے پتا ہی نہ چلا اور میں نیند کی میٹھی وادیوں میں کھو گیا تھا۔ میری آنکھ بلوشہ کی آواز سے کھلی
تھی۔ ہلکے سے بڑبڑا کر اس نے کروٹ تبدیل کی اور مخالف جانب رخ موڑ لیا۔ جمائی لیتے ہوئے میری نگاہ گھڑی
پڑی۔ سوئیاں دو کا ہندسہ عبور کر چکی تھیں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا گل کو قائل کرنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا تھا۔ اتنی رات گئے
گل سے بات چیت کرنا مجھے عجیب لگ رہا تھا۔ گو چچا شریز کے کمرے میں موجود ہونے کی وجہ سے مجھے جھجک محسوس ہو
ہو رہی تھی لیکن پھر بھی رات کے دو بجے گفتگو مناسب نہ رہتی۔ میں دوبارہ لیٹ گیا لیکن گل کی ناراضی کا خیال آتے ہی میں
نے کمر ہمت باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے کمرے سے متصل گھر کا سٹور تھا اور اس کے ساتھ چچا شریز کی خواب گاہ تھی۔ گل کی شادی کے بعد ثمر خان
اور رنزا ابھی باپ کے کمرے ہی میں سوتے تھے۔ البتہ گل جب وہاں آتی تو دونوں بہنیں علیحدہ کمرے میں سوتی تھیں جو
باورچی خانے سے ملحق تھا۔ آج رنزا کی غیر موجودی میں گل کو باپ کے کمرے ہی میں سونا چاہیے تھا۔ یہی سوچ مجھے چچا
شریز کی خواب گاہ میں لے گئی، دروازہ بھیڑا ہوا تھا مگر اندر سے کنڈی نہیں تھا۔ میں بے تکلفی سے دروازہ دھکیل کر اندر
داخل ہوا۔ ہلکی چرچراہٹ ابھری جو خاموشی کے ماحول میں صور اسرافیل محسوس ہوئی تھی۔ وہاں گل موجود نہیں تھی۔ یقیناً وہ
آج اکیلے کمرے میں لیٹی تھی۔ چچا شریز اور ثمر خان دروازے کی چرچراہٹ سے نہیں جاگے تھے۔ میں الٹے قدموں
واپس مڑا اور دروازے کو بھیڑتا ہوا باہر نکل گیا، دوسری بار بھی دروازے نے ''چوں چوں'' کر کے گہرا احتجاج کیا
تھا۔

گل کے پاس اکیلے کمرے میں جانے کی ہمت خود میں مفقود پاتا تھا۔ گو میرا غلط ارادہ نہیں تھا، نہ گل کمزور کردار کی
مالک تھی لیکن پھر بھی رات کے اس وقت ہمارے گفتگو کرنے کو کسی صورت مناسب خیال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اپنے
کمرے کی طرف مڑا۔ دو قدم لیتے ہی میری سماعتوں میں دھماکا ہوا۔

''راجو!'' گل کی مدہم آواز نے بھی مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ خواب گاہ کے دروازے پر کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' چند قدم لے کر اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''وہ ... م ... میں ...'' میں گڑبڑا گیا تھا۔ میری چور نظریں چچا شریز کی خواب گاہ کی جانب اٹھیں اور پھر میں نے
مڑ کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا۔ بلوشے یا چچا شریز کسی کے جاگنے کی صورت میں بھی بھاری ندامت میرا نصیب بن سکتی
تھی۔

''مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔'' گل کی آواز میں ذرا بھی جھجک اور ہکلاہٹ شامل نہیں تھی۔

''ہا ... ہاں، مگر فی الحال تم سو جاؤ صبح بات کریں گے۔'' میں نے ہاتھ اس کی ملائم و گرم گرفت سے چھڑانا چاہا۔
اس نے گرفت سخت کرتے ہوئے برہمی ظاہر کی۔ ''خود پر بھروسہ نہیں ہے یا میرے کردار پر شبہ ہے۔''
میں چڑچڑا ہوا۔ ''گل فضول باتیں نہ کرو۔''

وہ بدتمیزی سے بولی۔ ''اور آپ کا کیا، میرا مطلب آپ کو مکمل اجازت ہے فضول باتوں کی۔''

''آرام کرو۔'' میں نے اپنے کمرے کی طرف مڑنا چاہا کہ وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔

''ٹھہریں۔'' میرے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہوئی۔ ''پہلے یہ بتائیں کیا کہنا چاہتے تھے۔''

''گل سو جاؤ۔'' میں نے دبے لہجے میں جھڑکا۔ ''کوئی اٹھ گیا تو الگ تماشا بن جائے گا۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''ارجا کون ہے۔''

''مجھے کیا معلوم کہ وہ کون ہے؟'' میں جھلا گیا تھا۔

''بیٹھئے نا آپ۔'' اس نے مجھے چارپائی کی طرف دھکیلا۔

''میں بیٹھنے نہیں آیا ہوں۔'' میں بھڑک گیا تھا۔

''گل تم نہیں جانتی ہو۔ آپ نے ضروری بات کرنا تھی۔ اب وقت ہے۔ اب یہاں سے بھاگ نہیں آئے۔''

''راجا میں جانتی ہوں آپ کو میرے کردار پر شک نہیں کرنا چاہئے۔''

''کم از کم آپ کو میرے کردار پر شک نہیں کرنا چاہئے۔''

''گل میں شک...''

''چلیں۔'' اللہ کلامی کرتے ہوئے اس نے مجھے دروازے کی جانب دھکیلا اور ہاتھ پکڑا تو میں ہاتھ چھڑا بولی۔

''بیٹھو۔'' اس نے مجھے خالی چارپائی پر دھکیلا اور دوسری چارپائی پر نشست سنبھال کر بولی۔ ''آپ کس طرف اشارے کر رہے تھے۔''

میں شاکی ہوا۔ ''تمہیں نہیں معلوم۔''

اس نے منہ بچلایا۔ ''راجو میرا اتنا حق بھی نہیں ہے کہ آپ کو دوسروں کے گلے کا ہار بنوں۔''

میں بغیر کوئی لگی لپٹی رکھے بولا۔ ''میں آج تک تمہارے ساتھ رشتے کا تعین نہیں کر سکا۔ تمہاری ماں نے دام دے کر اسے اچھی دوستی کا نام دے سکتا ہوں، مگر عورت مرد کی دوستی کی نہ شریعت اجازت دیتی ہے اور نہ ہی معاشرہ۔ تمہارے شوہر کو پسند ہوگا نہ میری بیوی ہی اس کی اجازت دے گی۔ پلوشہ بہت فراخ دل بیوی اور اعلیٰ ظرف لڑکی ہے۔ لیکن یقین مانو پہلے دن سے میرے ساتھ تمہاری بے تکلفی کو نہ صرف شدت سے محسوس کیا ہے بلکہ ناپسندیدگی کی نظر سے نوازا ہے۔ حالانکہ وہ بھی تمہاری طرح خوب صورت، معصوم اور پیاری ہے مگر اس کی بے تکلفی پلوشہ پر... نہیں گزری کہ وہ مجھے لالا جان کہتی ہی نہیں بلکہ سمجھتی بھی ہے۔''

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ ''آپ کو بھائی سمجھتی ہوں اور نہ بہن بننے پر تیار ہوں۔''

''یہی تو جاننا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جانتی۔''

''کیا چاہتی ہو؟'' میں کھل کر سامنے آ گیا تھا کہ جب تک اس کی غرض معلوم نہ ہوتی سمجھانا دشوار تھا۔

ارزق چشم (نیلی آنکھیں) میرے چہرے پر مرکوز ہوئیں۔ ان میں گلہ، شکوہ اور اذیت ہویدا تھی۔

''کبھی تنہائی میں بھی میری قابل گرفت حرکت دیکھی ہو۔ سب کے سامنے بھی آپ کا ہاتھ پکڑ لیتی ہوں اور اب بھی صرف ہاتھ چھونے کی گستاخی کی ہے۔ اور قسم کھاتی ہوں اگر جذبات سے مغلوب ہو کر آپ مجھے ناز یبا چھونے کی کوشش کرتے تو تھپڑ مارنے میں تامل نہ برتتی۔ شوہر کی امانت میں خیانت کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ البتہ دل میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اور امید ہے بے اختیاری کو کراما کاتبین بھی قلم بند کرنے سے گریز فرمائیں گے۔''

میں نے دہائی دی۔ ''گل! میں کیا کروں، تم میری محسنہ ہو۔ تمہیں خفا نہیں کر سکتا۔ تمہارا حق جتانا یا فرمائشیں کرنا بھی مجھے گراں نہیں گزرتا، مگر میری شریک حیات اس کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ صرف میری بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی ہے۔ اسے ناراض کرنے یا دکھ دینے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہمارے الجھے ہوئے رشتے کی زد میں آ کر دونوں کی خانگی زندگی کسی بھی بڑے حادثے کا شکار ہو سکتی ہے۔''

وہ بے نیازی سے بولی۔ ''پروا کسے ہے۔''

میں معترف ہوا۔ ''مجھے۔''
اس کے ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ ابھری۔ ''تو یہ آپ کا مسئلہ ہے۔''
میں جز بز ہوا۔ ''مجھے تنگ نہ کرو سمجھیں۔''
''یہی درخواست آپ سے بھی ہے۔'' وہ کچھ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔
میں تلملاتے ہوئے بولا۔ ''چاہتی کیا ہو؟''
اس نے منہ بنایا۔ ''کچھ بھی نہیں۔''
''صبح ہم واپس جائیں گے۔'' میں نے لاحاصل بحث کا خاتمہ کیا۔
لبوں پر مدھم تبسم بکھیرتے وہ مخمور لہجے میں بولی۔ ''صرف اتنی سی بات منوانے کو آپ رات کے دو بجے مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''
''تو کیا کرتا، پلوشے صبح جانے پر بہ ضد تھی اور تمھاری سوئی مجھے روکنے پر اٹکی تھی۔''
وہ خوش دلی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے چلے جانا۔''
''شکر ہے۔'' میرے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔
وہ کھل کھلائی۔ ''آپ پوچھ رہے تھے نا مجھے کیا چاہیے؟''
''تو...'' بے ربط ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے میں نے نظریں چرائیں۔
وہ وارفتگی سے بولی۔ ''بس اتنا مان رکھ لیا کریں۔ یہ مجھے کافی سے بھی زیادہ ہے۔ اور یقین کریں میں نے آج ایک لحظے کو بھی آنکھیں نہیں جھپکیں، مسلسل جاگ کر آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آپ سے بات چیت کی غرض ہی سے میں علیحدہ ہوئی ہوں۔ جونہی ابو جان کے کمرے کا دروازہ چرچرایا مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ تشریف لے آئے ہیں۔''
''اجازت ہے۔'' میں نے اٹھنے کو پر تولے۔
''ایک بات پوچھوں؟''
''تمھیں اجازت مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
وہ شاکی ہوئی۔ ''اتنا برا رقص تو نہیں کرتی کہ آپ نے تھوڑی دیر دیکھنا بھی پسند نہ کیا۔''
رقص کو اعضاء کی شاعری کہتے ہیں اور اس نسبت سے اس کے مصرعے، تشبیہات و استعارات، قافیے و ردیف اور بندشیں ایسی تھیں کہ سننے والے، میرا مطلب دیکھنے والے عقل و خرد سے بے گانہ ہو جاتے۔ وہ خوش شکل ہی نہیں خوش ...ن بھی تھی۔ شادی کے بعد اس کا چھریرا بدن فربہی مائل ہوگیا تھا جو پہلے سے زیادہ جاذب نظر اور پر کشش لگتا تھا۔ میں ...ب کچھ سوچ کر رہ گیا تھا کہ کہنے کا حوصلہ مفقود پاتا تھا۔ وہ میرے لیے قابلِ احترام و معزز تھی اور جن کی عزت کی جاتی ہے ...ا پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں نہ حیا سوز گفتگو کی جاتی ہے۔
بدقت تمام بولا۔ ''تمھیں ناچتے ہوئے دیکھنے کا مجھے قانونی اختیار نہیں تھا۔''
وہ مصر ہوئی۔ ''میں نے خود بلایا تھا۔''
میں صاف گوئی سے بولا۔ ''ہاں، مگر تمھارے پاس بھی یہ اختیار نہیں ہے۔''
میرے روبرو آتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے میری آنکھوں میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔
''راجو! اپنی گڑیا بہن کی باجی کو مجبور سمجھ کر معاف کر دینا۔''
میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری۔ ''اپنا خیال رکھنا گل!'' اور دروازے کی طرف مڑ گیا کہ وہاں میں نے اڑ

دیوانگی تھی جو بدنامی سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ گل سے اپنا رشتہ میں اب بھی نہیں سلجھا۔ سکا تھا، لیکن کم از کم یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ وہ بے راہروی پر آمادہ نہیں تھی۔ محبت اور عزت و عصمت میں چناؤ کا مرحلہ آتا تو اس کا انتخاب عصمت ہوتی۔ اسے بس ذرا سی توجہ درکار تھی۔ میں نے ابتدا ہی سے اسے بہت زیادہ اہمیت اور مان دیا تھا اور اب اسے اپنا حق چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

بھوک و دست بردار ہونے کے دروازہ کھولتے ہوئے میں نے باہر قدم رکھا اور میرے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ پلوشے کمرے کے دہرے سے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے میں نے باہر قدم رکھا اور میرے سر پر جیسے بم پھٹا تھا۔ پلوشہ کمرے کے چوں بیچ کھڑی اسی جانب متوجہ تھی۔ میں سن ہی تو رہ گیا تھا۔ پورے جسم سے جان جیسے رخصت ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً خود کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ غیر ہوتی حالت مجھے مجرم ثابت کر دیتی، جبکہ میرا فعل غلط ہونے کے باوجود میں ضمیر کی عدالت میں پاک صاف تھا۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو اندر آ جاتیں۔'' کوشش کے باوجود میں لہجے کی لرزش پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ لگ رہا تھا کوئی انہونی ہو گئی ہے۔ پلوشہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ گہرے سانس لیتے ہوئے وہ بار بار یا توتی لبوں کو باہم بھینچ کر زکر رہی تھی۔

اس نے ماضی کریدا۔ ''آپ نے تو خواب گاہ میں اس لیے قدم رکھا تھا کہ آپ کے پاس ماہین کو قتل کرنے اور طلاق دینے کا اختیار تھا۔ مظلوم حوا زادی کے بس میں کیا ہے۔ میں تو صحن میں کھڑی خوش فہمیاں پال رہی تھی، کمرے میں جھانک کر دل خراش منظر دیکھنے کی تاب مجھ میں کہاں تھی۔''

''اے..... ایسا کچھ نہیں ہے پلوشے! میں قسم کھاتا ہوں ہم صرف بات کر رہے تھے۔ میں بس اسے سمجھا رہا تھا۔''

وہ زہر خند ہوئی۔ ''جیسے ماہین، طاہر کو سمجھا رہی تھی ہے نا۔''

اسے بازوؤں سے تھامتے ہوئے ملتجی ہوا۔ ''تت..... تم..... تم غلط سمجھ رہی ہو پلوشے! کیا اپنے راجو پر اعتماد نہیں ہے۔''

وہ کراہی۔ ''کوئی دوسرا بتاتا تو اس کا گریبان تھام لیتی۔''

''میں نے پوچھا۔ ''کیا اپنے راجو پر اعتماد نہیں ہے؟''

وہ ایک جھٹکے سے خود کو چھڑاتے ہوئے سسکی۔ ''تھا، اسی کا نتیجہ تو بھگت رہی ہوں۔''

''جانتی تو ہو گل ہمارے جانے کے حق میں نہیں تھی اور تم واپسی کی خواہاں تھیں، میں بس اسے سمجھانے گیا تھا کہ اپنی بیوی کی بات نہیں ٹال سکتا۔ میرا مقصد فقط اسے دل آزاری سے بچانا تھا۔''

وہ تلخی سی بولی۔ ''اگر اس کا شوہر تمنا کرتا کہ میں دو دن مزید یہاں قیام کروں تو کیا سمجھانے کو مجھے اس کے ساتھ اکیلے کمرے میں بند ہونے کی اجازت دے دیتے۔''

میرا ہاتھ گھوما، تھپڑ اکھا کر وہ نیچے گر گئی تھی۔

آنکھیں برساتے ہوئے وہ لرزتے ہوئے اٹھی۔ ''کاش یہ اختیار عورت کے پاس بھی ہوتا۔''

''پلوشے میری جان!'' میں نے اسے بانہوں میں بھرنے کی کوشش کی، مگر دونوں ہاتھ سینے پر ٹکتے ہوئے اس نے مجھے پیچھے دھکیلا اور کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

میں فوراً گل کی خواب کی طرف بڑھا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ شاید مجھے خواب گاہ کی طرف آتے دیکھ کر وہ دروازے سے ہٹی تھی۔ اور اس نے سارا تماشا دیکھ لیا تھا۔ ''گل چلو میرے ساتھ، پلوشہ کو بتاؤ کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی۔''

ہوئی تھی ... وہ مجھے مخاطب نہیں ہوئی تھی۔

روما نے چھوٹتے ہی پوچھا۔''اجنبی! آپ جھوٹ بولنا کب چھوڑیں گے۔''

''روما! اس کی عقل چھوٹے بچوں جتنی ہے، فضول بات پر ہوا بنایا ہوا ہے۔ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔''

روما نے منہ بسورا۔''وہ بھی کچھ نہیں بتا رہی اور آپ بھی چھپا رہے ہیں۔''

''اسے گلہ ہے کہ میں گل کو اہمیت دیتا ہوں، حالاں کہ وہ شادی شدہ ہے اور مضبوط کردار کی لڑکی ہے۔ اس کی بے تکلفی برداشت کرتا ہوں کہ اس نے میری جان بچائی ہے، اپنی محسنہ سمجھ کر اگر ہنس کر بات کر لیتا ہوں تو اسے ناگوار گزرتا ہے۔ بتاؤ یہ کوئی خفا ہونے کی بات ہے۔''

''آج اپنی خواب گاہ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ میرے کریدنے پر بھی کچھ بتانے کو تیار نہ ہوئی۔ اور آپ جو تفصیل بتا رہے ہیں وہ میرے ذہن کو نہیں لگ رہی۔''

میں دکھی لہجے میں بولا۔''میرے کردار پر شک کر رہی ہے۔''

''کک ... کیا، مگر کیوں؟'' روما ہکلا گئی تھی۔

مجبوراً مجھے تفصیل دہرانا پڑی کہ روما جیسی مخلص شریک حیات سے کچھ چھپانا نہایت معیوب تھا ممکن تھا۔ پلوشے سے معلوم ہونے پر وہ بھی خفا جاتی تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جاتا۔

''جھوٹا اجنبی!'' تفصیل سن کر، میرے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے وہ متبسم ہوئی۔

میں گلو گیر ہوا۔''پلوشے زیادتی کر رہی ہے۔''

''میرے اجنبی!'' روما نے تڑپ کر مجھے بھینچ لیا تھا۔''پریشان کیوں ہوتے ہیں میں اسے سمجھاؤں گی۔ وقتی ابال ہے ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں متفکر ہوا۔''ڈر لگ رہا ہے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے۔''

''آپ کی روما کس لیے ہے۔'' پر اعتماد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے مجھے وقتی طور پر مطمئن کر دیا تھا۔

صبح کی نماز پڑھ کر میں دوبارہ سو جاتا تھا۔ گو یہ کوئی اچھا عمل نہیں ہے لیکن بس عادت بنی تھی۔ دن چڑھے اٹھ کر ناشتا کرتا۔ ابو جان زمینوں کی طرف نکل جاتے اور دوپہر کو لوٹتے تھے۔ میں تھوڑی دیر امی جان اور پھوپھو جان سے گپ شپ کرتا عبداللہ سے کھیلتا اور پھر لیٹ جاتا۔ پلوشے یا روما میں سے کوئی ایک میرا ساتھ دینے آ جاتی۔

انگور اڈے سے لوٹے تین دن ہو گئے تھے پلوشہ نے سیدھے منہ بات کرنا تو درکنار دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ ناممکن ہے کہ گھر کے بڑوں کو ہماری خفگی کا پتا نہ چلتا مگر انھوں نے استفسار نہیں کیا تھا۔

وہ گھر میں میرا آخری دن تھا۔ ناشتا کر کے میں نے روما سے پلوشہ کا پوچھا۔

وہ شوخی سے مسکرائی۔''اپنے کمرے میں گھسی ہے، آپ منانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

میں نے امید ظاہر کی۔''ہاں، آخری دن ہے، شاید مان جائے۔''

وہ پر خلوص لہجے میں بولی۔''ان شاء اللہ مان جائے گی۔''

دل میں پیا جوت جلائے میں اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ عموماً وہ اس وقت پھوپھو جان اور عدیل کے کمرے میں گھسی ہوتی تھی، مگر آج میری چھٹی کا آخری دن تھا شاید وہ مجھے منانے کا موقع فراہم کرنے کو اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔

دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹا کر داخل ہوا۔ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ نپے تلے قدم رکھتے

میں قریب پہنچا ہلکے سے کھنکار کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے بدن میں جنبش نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس نے آنکھیں کھولنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔
پھر بیٹھ کر میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھاما اور ہولے ہولے سہلانے لگا۔
''معافی نہیں ملے گی؟'' میں نے تمہید باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔
''کل واپسی ہے۔ اور تم فوجیوں کی ہنگامہ خیز زندگی سے اچھی طرح واقف ہو، کیا معلوم موت لوٹنے کی مہلت نہ دے۔'' میں نے جذباتی دھونس جمانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
''مجھ سے غلطی سرزد ہوئی، حماقت کر بیٹھا، بے وقوفی ہو گئی، گناہ کیا ہے، جہالت کا مظاہرہ کیا ہے، جو کچھ میں سمجھی ہو، مجھے قبول ہے بس راضی ہو جاؤ تمھاری خفگی برداشت نہیں ہو رہی پلیز صرف ایک بار معاف کر دو، آخری بار معاف کر دو۔''
''ایک شرط پر......'' اس کی جذبات سے عاری آواز ابھری۔ میں خوشی سے اچھل پڑا تھا۔
''قبول ہے...... ہر شرط قبول ہے، بغیر سنے منظور کرتا ہوں۔''
اس نے اطمینان بھرے انداز میں میرے سر پر ڈنڈا رسید کیا۔ ''مجھے طلاق چاہیے۔''
''ک......کیا......ہوش میں تو ہو۔'' میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر متوحش انداز میں جھنجوڑا۔
ایک جھٹکے سے خود کو آزاد کراتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ ''طلاق نہیں دو گے تو میں خلع لے لوں گی۔''
''شاید مار کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' درشتی سے کہتے ہوئے میں جارحانہ انداز میں اس کی جانب بڑھا۔
''کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔'' میرے قریب پہنچنے سے پہلے وہ تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔
میں اپنی جگہ منجمد ہو کر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ جذبات سے عاری چہرہ لیے وہ بے نیازی سے کھڑی تھی۔
''پلوشے......'' دو تین لمحوں بعد میرے حلق سے رندھی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔
''چند دن کی مہلت دیتی ہوں خوب اچھی طرح سوچ لو نہیں تو مجھے پھوپھو جان اور بابا جان کو ساری بات بتا کر عدالت سے رجوع کرنا پڑے۔'' یہ کہتے ہی وہ لمبے ڈگ بھرتی دروازے کی جانب چل دی۔
میں نڈھال سا بیڈ پر گر گیا تھا۔ وہ میرے تصور سے زیادہ خفا تھی۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک چلی جائے گی۔ میں کافی دیر تنہا لیٹا سوچتا رہا۔ اور آخر یہی فیصلہ کیا کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا بہتر رہے گا۔ یقیناً دو تین ماہ کی جدائی اس کا غصہ کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی۔ البتہ یہ اطمینان ضرور تھا کہ امی جان اور ابو جان اسے کبھی ایسا قدم اٹھانے کی اجازت نہ دیتے۔

''آپ کو زحمت ہوگی۔''میں نے رسمی جھجک ظاہر کی کہ ویسٹرج سے چکلالہ کینٹ کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا لیکن راولپنڈی کی سڑکوں پر جو ٹریفک کا اژدحام ہوتا ہے وہ مختصر فاصلے کو طوالت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

''اس بہانے انصاری صاحب کو مل لوں گا۔''میرے استفسار کو رضامندی جانتے ہوئے وہ کھڑے ہوگئے۔راستے میں وہ سنجیدگی سے بولے۔

''برخوردار! یاد رکھنا انصاری صاحب پاکستان کے ہیرو ہیں۔ایک ایسے شخص جنھوں نے اپنی جوانی وطن عزیز پر قربان کر دی۔مزید تفصیل ان سے گپ شپ کرتے ہوئے پتا چل جائے گی۔''

''جی سر۔''میں نے بہ ظاہر سعادت مندی سے سر ہلایا مگر ان کی یاد دہانی عجیب لگی تھی۔کیوں کہ بریگیڈیئر کے عہدے تک سروس کرنے والے کے بارے ایسی یقین دہانی کرانے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔بلاشبہ تیس سال سروس کرنے والے کو وطن کے لیے پسینہ و خون بہانے کے کئی مواقع ملے ہوں گے۔

چکلالہ کینٹ تک ہمیں گھنٹا ایک لگ گیا تھا۔داخلے پر اپنی شناخت کرا کر وسیم صاحب چھاؤنی کی کشادہ اور ہموار سڑکوں پر کار دوڑانے لگے۔دس پندرہ منٹ بعد کار ایک درمیانے حجم کے بنگلے کے سامنے روک کر ہم تعارف کراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔تھوڑی دیر بعد ہم انصاری صاحب کے سامنے بیٹھے تھے۔انصاری صاحب پر رعب شخصیت کے مالک تھے،نفاست سے ترشی ہوئی چھوٹی داڑھی جس میں نصف سے زیادہ بال سفید نظر آ رہے تھے۔گھنی سو مونچھیں،کھلتی ہوئی سفید دودھیا رنگت۔گہری سیاہ آنکھیں جو مقابل کا ایکسرے کرتی نظر آتیں۔ان کے ہمراہ تیس،بتیس سال کی جوان طرح دار خاتون بھی موجود تھی۔اس سے پہلے کہ انصاری صاحب کے ساتھ اس کے رشتے کا تعین کرنے کو ذہن کے گھوڑے دوڑاتا،انصاری انھیں مخاطب ہوئے۔

''شہناز بیگم! ہمیں چائے پلا کر آپ آرام کر سکتی ہیں۔''

''جی ضرور۔''وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے خادمہ کو آواز دینے لگیں۔

چائے آنے تک انصاری صاحب،کرنل وسیم سے رسمی گفتگو کرتے رہے۔ہمیں چائے پلا کر شہناز بیگم خواب گاہ کی طرف بڑھ گئیں۔انصاری صاحب،کرنل وسیم کی طرف متوجہ ہوئے۔

''تمھیں جانا چاہیے کیوں کہ ہم کافی دیر تک گپ شپ کرنے والے ہیں۔''

''شکریہ سر!''اجازت ملتے ہی وسیم صاحب رخصت ہوگئے۔

''تو آج کل کیا چل رہا ذیشان میاں۔''کرنل صاحب کے جاتے ہی وہ بے تکلفی سے مخاطب ہوئے۔

میں ادب سے بولا۔''چھٹی سے آج ہی لوٹا ہوں سر! پہلے پاک،افغان سرحد پر تعینات تھا۔''

''گھر میں خیریت ہے؟.....اگر مزید چھٹی چاہیے ہو تو بتاؤ،کیوں کہ میں نہیں چاہتا دوران مشن تمھیں گھر کے مسائل ستاتے رہیں۔''

''الحمد للہ سر بالکل خیریت ہے۔آپ بے فکر ہو کر کام بتا سکتے ہیں۔''

وہ صاف گوئی سے بولے۔''گو ایک پاکستانی سنائپر کو موت سے ڈرانا عجیب بلکہ احمقانہ لگتا ہے،لیکن تمھیں خطرے سے آگاہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔چوں کہ یہ میرا ذاتی کام ہے اور تمھاری ذمہ داری وطن کی خدمت و حفاظت ہے اس لیے تمھارے پاس انکار کا انتخاب موجود ہے۔''

میں محتاط انداز میں بولا۔''میرا نہیں خیال اتنے بڑے عہدے کا آفیسر کوئی غیر قانونی کام لینا چاہے گا۔باقی اہل پاکستان کی خدمت بھی دراصل وطن ہی کی خدمت ہے۔''

دیکھ کر میں محجوب ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے تسلی دوں۔ ایک سپاہی اور بریگیڈیئر کو دلاسا دے... حوصلہ کر کے اٹھا اور قریب بیٹھ کر ان کا ہاتھ سہلانے لگا۔

"سر! دکھوں کا مقابلہ کرنا مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں ہے۔ اللہ پاک کی ذات پر توکل کرنا ہی ... کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ امید کا دامن پکڑے رکھنا کامیابی کی نوید لاتا ہے اور جب تک آس زندہ ہوتی ہے مایوسی کے ... ہوتے رہتے ہیں۔"

گہرا سانس لیتے ہوئے انھوں نے رومال آنکھوں پر پھیرا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ "شکریہ بیٹا"

میں خاموشی سے ان کے مزید بولنے کا منتظر رہا اور دو تین لمحے سوچنے کے بعد انھوں نے انکشاف کیا۔

"پرمالہوترا میری بیٹی ہے، میری ننھی شہزادی، جان سے پیاری پری ہے۔"

"کیا ؟" میں ہکا بکا رہ گیا تھا۔

میری حیرانی کو درخورِ اعتنا نہ جانتے ہوئے ان کی بات جاری رہی۔ "اس وقت میں کیپٹن تھا۔ تین ماہ دورانیہ کے انٹیلی جنس کورس میں نمایاں کارکردگی نے میرے لیے ایک ایسی راہ کا تعین کر دیا تھا جسے اختیار کرنے کی صورت میرے لیے وطن کی آب و ہوا بھی شجرِ ممنوعہ بن جاتی۔ غیر شادی شدہ ہونا میرا انتخاب کرنے والوں کے پیشِ نظر تھا۔ مجھے اپنا پیارا وطن چھوڑ کر غیر معینہ مدت تک بھارت میں رہنا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ والدہ صاحبہ حیات نہیں تھیں ورنہ یہ فیصلہ آسانی سے نہ کر سکتا۔ والد صاحب ریٹائرڈ کرنل تھے اور انھیں وطن کی محبت کا درس دینا ان کی خدمات کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے میرے فیصلے کو ... دی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم شخص تھے۔ آج اپنی اولاد سے جدا ہونے کے بعد مجھے ان کے دکھ کا ادراک ہو رہا ہے۔ گو مجھ سے بڑا بھائی انھیں سنبھالنے کو موجود تھا پر ان کا اپنا مقام تھا وہ میری جگہ کبھی پر نہیں کر سکتے تھے۔ ابو جان کی شفقت پدری پر وطن کی محبت غالب آ گئی اور انھوں نے اپنے دکھ کو بہ ظاہر ہنستے ہوئے گلے سے لگا لیا تھا۔ پھر میری رضامندی اور ... اجازت ملنے کے بعد میری تربیت نئے سرے سے شروع ہوئی۔ جو سال بھر جاری رہی۔ جب پتا چلا کہ تین ماہ ... میں میری سکھلائی ابجد سے آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔ اس بار مجھے ہندی اور بھارت میں بولی جانے والی دوسری مشہور زبانیں مراٹھی، تامل وغیرہ سکھائی گئیں، ہندی رسم الخط سکھایا گیا اور میری تربیت اس نہج پر ہوئی کہ میں سوچتا بھی ہندی میں تھا۔ (بے شک ہندی، اردو کی اصل ایک ہے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ اردو میں سنسکرت کے مشکل ... فہم الفاظ متروک ہو گئے اور ان کی جگہ عربی و فارسی کے سہل و خوش نما الفاظ کثیر تعداد میں در آئے اور اردو نے رسم الخط بھی عربی، فارسی سے مستعار لے کر ایک علیحدہ شناخت بنائی جبکہ ہندی سنسکرت سے جڑی رہی) مجھے نئی شناخت ملی ... پارتیش ملہوترا رکھا گیا۔ انبالہ کے ایک مضافاتی گاؤں کی شہریت ملی۔ حقیقی والدین ملے۔ لیکن ان بے چاروں کی نظر میں ان کا ... کا بیٹا ہی تھا۔ اس معاملے میں ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لیا گیا تھا۔ موہن ملہوترا کا بڑا بیٹا قریباً تین ... غائب ہو گیا تھا۔ اس کی تلاش میں کافی سرگرمی دکھائی گئی مگر بیٹا واپس نہ مل سکا۔ آخر رو دھو کر انھیں چپ سادھنا پڑی۔ ماں کسی بھی مذہب، کسی بھی مسلک، کسی بھی قوم کی ہو ماں ہی ہوتی ہے۔ اولاد کو بھول جانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ رادھا ملہوترا بھی اپنے بیٹے کو بھلا نہیں پائی تھی۔ پاکستان میں جونہی میری تربیت شروع ہوئی، انبالہ میں موجود مخصوص افراد نے موہن ملہوترا کے گرد دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ بڑی چابک دستی اور منصوبہ بندی سے اس تک بیٹے کی زندگی کی نوید پہنچائی گئی۔ بلکہ ماں کی تو نیندیں ہی حرام ہو گئیں۔ اپنی بے چینی و بے قراری پر جو دبیز پردے ڈالے تھے وہ تارِ عنکبوت کی طرح بکھر گئے۔ میری ناگفتہ بہ حالت کی تصویر دکھا کر ان کے سکون و آرام کو تہ و بالا کیا گیا۔ یہاں تک کہ موہن ملہوترا نے بیٹے کی

ناکامی کی رپورٹ تحریر کرکے میں نے مخصوص ذریعے سے اس شخص تک پہنچادی جس سے مجھے ہدایات ملا کرتی تھیں۔ وہ رات آنکھوں ہی میں بیتی تھی۔ پاروتی کے ساتھ مختصر لمحات گزار کر اتنی بے چینی تھی تو اس کا مستقل ساتھ مجھے کام ہی سے نکال دیتا۔

اگلے دن واپس انبالہ روانہ ہوا تاکہ بقیہ چھٹی گھر گزار سکوں۔ البتہ گھر واپس آ کر محسوس ہوا کہ میں صرف جسمانی دوری پیدا کرنے میں کامیاب ہوا تھا دل و دماغ سے اسے نہیں جھٹک پایا تھا۔

دوسرے دن مجھے اپنی رپورٹ کا جواب موصول ہوا تھا۔

"اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اصل ہدف کوئی اور ہے۔ وہ صرف درمیانی کڑی ہے۔ تم اسے شریک حیات بنا سکتے ہو۔"

میں کافی بے چینی و بے سکونی محسوس کر رہا تھا۔ اسے نقصان نہ پہنچنے کی خبر نے مجھے اسی دن آگرہ لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ انبالہ سے آگرہ تک قریباً ساڑھے چار پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ میں نے راستے میں رکے بغیر طے کیا تھا۔ رات ہوٹل میں گزار کر میں اگلی صبح سویرے ہی یونیورسٹی پہنچ گیا تھا۔ اس کی روزمرہ معلوم تھی۔ ڈرائیور اسے چھوڑ کر واپس لوٹ جاتا تھا۔ وہ پیریڈ شروع ہونے سے ادھ پون گھنٹا پہلے آتی اور فالتو وقت یونیورسٹی کی لائبریری میں گزارتی تھی۔ خالی پیریڈ کے دوران وہ سہیلیوں سے گپ شپ کرتی، کیفے میں جا کر کھانے پینے کا شغل کرتی، چھٹی کے وقت دوبارہ تھوڑی دیر لائبریری میں گزارتی، یہاں تک کہ ڈرائیور لینے پہنچ جاتا۔

اس کی آمد سے پہلے میں یونیورسٹی لائبریری کے مخصوص گوشے میں موجود تھا جہاں وہ بیٹھا کرتی تھی۔ ایک کتاب کھول کر بظاہر صفحات پر نظر دوڑا رہا تھا مگر میرا رواں رواں اس کی آمد کا منتظر تھا۔ اور پھر وہ پہنچ گئی۔ کتابوں کی الماری کا رخ کرنے سے پہلے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ساکن کھڑی مجھے گھورنے لگی۔ دو تین لمحے بعد جانے کے ارادے سے مڑی، تبھی میں نے آواز دی۔

"مس شکلا" گومگو کی کیفیت میں وہ رک گئی تھی۔ بلاشبہ سخت خفا تھی۔ اور چھوٹی سی ملاقات کے بعد ناراضی کا اظہار بتا رہا تھا کہ میں اس کے لیے کتنا اہم تھا۔

کتاب بند کر کے میں قریب ہوا، غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیرے سے بولا۔ "شما کر دو۔"

اس نے سرد مہری سے پوچھا۔ "کیا ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔"

"پتا نہیں۔" میں نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"لڑکیوں کو چھیڑنے کا نتیجہ جانتے ہیں۔"

میں اداسی سے بولا۔ "شاید۔"

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "یقیناً جس لڑکی کے لیے مکالمے یاد کر رکھے تھے، اس نے دھتکار دیا ہے جو دوبارہ میری ضرورت پڑ گئی ہے۔"

میں بے بسی سے بولا۔ "مجھے اظہار کرنا نہیں آتا، نہ روٹھوں کو منانا جانتا ہوں اور نہ یہ پتا ہے کہ جو پیارا لگے اس سے کیسے جان چھڑائی جاتی ہے۔ کوشش کی تھی ناکام رہا، مجبوراً واپس آنا پڑا۔"

"میں سکھا دیتی ہوں اظہار کیسے کرتے ہیں۔" یاقوتی لبوں پر مدھر تبسم ابھرا جو اس کا سب سے بڑا ہتھیار تھا، میرے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنے کندھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ "اب بولیں، پاروتی! مجھے بہت اچھی لگتی ہو، تم سے پریم کرنے لگا ہوں، کیا میری بے رونق زندگی میں بہار بن کر آ سکتی ہو۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں بے موت مارا جاؤں گا میری آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر روہانوی لہجے میں بول دیں۔ چلیں شاباش۔"
اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں دل کی گہرائی سے بولا۔"شادی کرو گی۔"
اس نے شرما کر آنکھیں جھکالی تھیں۔"انصاری صاحب نے خاموشی سادھ لی۔ میں بھی چپ چاپ ان کے منتظر رہا۔ تھوڑی دیر گہری سوچوں میں کھوئے رہنے کے بعد وہ دھیرے سے مسکرائے۔"جانتے ہو، پاروتی سے ملاقات میں نے اتنی تفصیل سے کیوں بیان کی۔"
میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ ورنہ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ پیار کی باتیں کرنے سے کبھی سیری نہیں ہوتی، خاص کر پہلی ملاقات یادداشت میں یوں محفوظ رہتی ہے جیسے کل ہی ہوئی ہو۔ مجھے بھی تو اپنی پلوشے کی پہلی دید ازبر تھی۔ گو ہماری ملاقات دشمنوں کے انداز میں ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ سہانا لمحہ یادداشت میں ثبت ہو گیا تھا۔
انھوں نے قہقہہ لگایا۔"تمھیں شاید کبھی محبت نہیں ہوئی۔"
میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ انھوں نے ملازمہ کو چائے کا کہا کر بات جاری رکھی۔
"یار! وہ مجھے بہت پیاری تھی۔ اس کی رضامندی پا کر میں نے بغیر تاخیر کے والدین کو انبالہ سے بلا لیا تھا۔ چھوٹی بہن اور بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ والدین کافی عرصے سے مجھے زور دے رہے تھے ایسے عالم میں جب میں نے اپنی خواہش ان تک پہنچائی تو وہ بھاگے چلے آئے۔
اگلے دن ہم پاروتی شکلا کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اس دن یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ جب اس کے والد سے تعارف ہوا میرا ماتھا ٹھنکا۔ لمبے تڑنگے کرنل دھیریندر شکلا کی شخصیت میرے لیے انجانی سہی مگر اس کا ریک باور کرانے کو کافی تھا۔ پاروتی شکلا کے ذریعے مجھے کس کڑی سے جوڑا جا رہا تھا۔
میرا خاندانی پس منظر، فوج کی نوکری اور پاروتی کی مرضی، ان عوامل کے ہوتے ہوئے مجھے ٹھکرانا آسان نہ تھا۔ خرانٹ شکل کے دھیریندر شکلا نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے خشونت بھرے چہرے پر کرختگی، بے رحمی، کھرا پن اور درشتی گویا ابل رہی تھی۔ پاروتی جیسی ملائم، دلکش اور پیاری لڑکی کا والد مجھے دل کی گہرائیوں سے ناپسند آیا تھا۔
دونوں طرف رضامندی کے بعد پاروتی کی تعلیم مکمل ہونے تک شادی موخر کی گئی۔ اس کا آخری سمیسٹر شروع تھا۔ تین ماہ بعد وہ میری زندگی میں باقاعدہ دلھن بن کر داخل ہوئی۔
وہ مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔ اور میں بھی بغیر کسی لالچ، غرض اور مطلب کے اس پر فدا تھا۔ شادی کے ایک ماہ بعد ہی پاکستان کے ساتھ حالات خراب ہوئے اور مجھے کشمیر کے محاذ پر جانا پڑا۔ بہت مشکل اور کڑا وقت تھا، مختصر کہ اللہ کے فضل و کرم سے اپنے کسی بھائی کی گولی کا نشانہ نہ بنا اور چھے سات ماہ بعد چھٹی آ گیا۔ گھر آ کر پتنی کو دیکھا تو خوف و گھبراہٹ سے چکرا گئے تھے۔ وہ چھے سات ماہ کی حاملہ تھی۔ میں کسی صورت بچہ نہیں چاہتا تھا، لیکن اب پاروتی کو حمل گرانے پر راضی کرنا ناممکن تھا۔ یوں بھی جس جی کو اللہ پاک دنیا میں بھیجنا چاہے اس کی راہ میں کوئی دنیاوی طاقت رکاوٹ نہیں ڈال سکتی۔ مجبوراً چپ سادھنا پڑی۔ اللہ پاک نے مجھے ایک خوب صورت بچی کا باپ بنا دیا۔ جیسے پرما کی دنیا میں آمد میری منشا کے خلاف ہوئی تھی یونھی میرے دل پر اس کے قابض ہونے میں بھی میرے ارادے یا خواہش کا عمل دخل نہیں تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی روز بہ روز میرے دل میں اس کی محبت بڑھتی گئی۔ البتہ ایک دھیان میں نے ضرور رکھا کہ پاروتی دوبارہ ماں نہ بن سکے۔ اگر بے احتیاطی سے حمل ہو بھی گیا تو میں نے پاروتی کی بے خبری میں اسے ایسی دوائیاں کھلا دیں جس سے حمل ضائع ہونا پڑا۔ تین چار حمل ضائع ہونے کے بعد اس نے میری مسلسل نصیحتوں کو قابل عمل جانتے ہوئے

''ان لوگوں کو جانا نہیں کر سکتا کہ تلاش کر سب سے پہلے اس نے پھر اگر یہاں [illegible]
بار؛ علی، ظالم، خود غرض اور بچا لے گیا تھا [illegible] مجھے امید کر یوں ملک کر دی تھی [illegible]
جانتا تھا کہ جدائی کی گھڑی سر پر آگئی ہے۔ پاروتی نے بھی زندگی گزارنے کا تصور ایسا ہی تھا [illegible]
رہنا۔ اگر وہاں رہنے کی کوئی صورت [illegible] یا بھی احتمال ہوتا تو میں نہ جا سکتا مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ مجھے [illegible]
فوجوں پر بار اور پاروتی کو واپس جانا پڑا [illegible] وہ ہو، ان کی نہیں تھی۔ چونکہ میں جانتا تھا [illegible]
تھا اس لیے پاروتی مجھے [illegible] چھوڑ کر جانا [illegible] گئی۔ [illegible] مجھے چھوڑ کے اجازت آئی۔ میں نے [illegible]
لے جانے کی بڑی کوشش کی پر وہ نہ مانی کہ اس کے وطن کی محبت [illegible] گہری تھی [illegible]
مجھے اور اپنے دھرم [illegible] کوئی دلچسپی باقی نہیں تھی۔ اسی وجہ سے تو میں اسلام کی محبت نہیں [illegible]
بہرحال وہ مجھے اجازت چھوڑ کر [illegible] جاتے ہوئے واپس لوٹ گئی۔ میں کس طرح بھارت سے نکلا [illegible]
پاکستان پہنچنے میں پورا مہینہ لگا تھا۔ یہاں آتے ہی سب سے پہلے میں نے پاروتی اور پرما کی خبر [illegible]
کی زبانی [illegible] پہنچی کہ پاروتی [illegible] گھر نہیں پہنچ پائی تھی۔ راستے ہی میں حادثے کا شکار ہو کر [illegible]
تھی۔ یقینا میری جدائی کا دکھ اس سے برداشت نہیں ہو پایا تھا۔ اور میں بے وفا آج بھی زندہ سلامت
ہوں۔'' انصاری صاحب کی آنکھوں میں نمی نمودار ہوئی، ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے انھوں نے آنکھوں پر رومال [illegible]
ان کی بات جاری رہی۔

''یہاں میری ریگولر ریجمنٹ تک ترقی ہو چکی تھی اور سروس نے اختتامی دو تین ماہ ہی باقی تھے۔ ناگفتہ بہ [illegible]
کی بدولت میں سروس جاری رکھنے سے قاصر تھا۔ میجر جنرل نے عہدے کی پیش کش ہوئی لیکن مجھے انکار کرنا
پڑا۔ پاکستان آتے ہی میرے لیے اہمیت کا حامل کوئی کام تھا تو وہ اپنی پری کی بازیابی تھی۔ اور میں اسی کوشش
میں لگ گیا۔ بھارت میں کافی خیر خواہ موجود تھے۔ ریاست کے مخالف، علیحدگی پسند تنظیمیں، جاسوس، ساتھی [illegible]
لوگ، بالکل جیسے پاکستان میں یہ عناصر کثیر تعداد میں بھرے پڑے ہیں یہی صورت حال اپنے پڑوسی بھارت میں بھی
ہے۔
جنرل دھیریندر سنگھ اپنی پوتی کو ساتھ لے گیا تھا۔ کیوں کہ میرے فرار سے دو تین سال پہلے ہی میرے سسر کا بیٹا
وفات ہو چکی تھی اور پرما اس کی ذمہ داری میں آئی تھی، اگر میرے والدین زندہ ہوتے تب بھی وہ پرما کو ان کے حوالے
کرنے پر تیار نہ ہوتا کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے میں پری کو کس قدر چاہتا ہوں۔ خاص کر اپنی بیٹی کو میں کافروں کے
پاس پرورش پانے نہیں چھوڑ سکتا۔ میری غیرت کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ میری بیٹی کسی ہندو کے بچے پیدا کرے۔ اب یہ میری
بے صبری سمجھو یا حماقت کہ میں نے پہلی فرصت میں پرما کو حاصل کرنا چاہا۔ اور تیزی میں درستی بھول گیا۔ جس کی وجہ سے
پہلی کوشش ناکام ہوئی اور جنرل دھیریندر سنگھ نہ صرف ہوشیار ہو گیا بلکہ اس نے پرما کی حفاظت کا بھی خاطر خواہ بندوبست کر
دیا۔ پہلی کوشش کی ناکامی سے بھی میں نے کوئی خاص سبق نہ سیکھا اور جلد بازی میں دوسری کوشش بھی کر ڈالی۔ اب نامعلوم
میرے مقرر کیے ہوئے آدمی نالائق تھے یا وہ پرما کے حصول کی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہے تھے کہ دوسری کوشش بھی ناکام
چلی گئی۔ بلکہ اس دفعہ میرے دو آدمی بھی کام آگئے تھے۔ تنگ آکر میں نے سسر کو کال کی، اس کی منت زاری کی کہ وہ پری
کو میرے پاس بھیج دے۔ لیکن اس نے کھری کھری سنا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پری کا فون نمبر اس نے شروع ہی دن سے
تبدیل کر دیا تھا تا کہ میں اسے کال نہ کر سکوں۔ چند ماہ ہوئے وہ ریٹائرڈ ہو گیا ہے اس کے پاس ظلم، بددیانتی اور ناجائز

...کچھ سے کمائی ہوئی بے بہا دولت ہے۔ دہشت گرد تنظیموں کو اسلحہ فراہم کرنے کی اجازت تو بھارتی ۔ دوسری طرف ۔
...میں بھی اس اجازت نامے کو اس ظالم نے پیسے کے حصول کا مستقل ذریعہ بنا لیا تھا۔ افغانستان میں بھی اس کی آمد و رفت
لگی ہے۔ مختلف جتھوں کو اسلحہ کی فراہمی کے ساتھ وہ پوست کی ... کاکنگ میں بھی ... رہا ہے۔ افغانستان کی جانب سے جو
... یا دراندازی کر رہا ہے اس کے پیچھے بھی ... کا ... ہاتھ ... ہی ہے۔ اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے انڈیا کے مختلف
شہروں میں اس نے اپنی کوٹھیاں بنا رکھی ہیں۔"

وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔" پھر پتہ چلا؟"

اب میری سمجھ میں آیا تھا کہ وسیم صاحب انہیں ہیرو کیوں کہہ رہے تھے۔ واقعی وہ پاکستان کے اصل ہیرو
تھے۔ انھوں نے پاکستان کی خاطر اپنی خواہشات، جوانی، محبت اور اولاد تک قربان کی تھی۔ میں عقیدت سے بولا۔" سب
سمجھ، سوائے اس کے سنائپر کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔"

"کیوں کہ پرماکی واپسی میں سب سے بڑی رکاوٹ دھیر ندر شکلا کی ذات ہے۔ گو میں مانتا ہوں کہ دونوں ممالک
کی سرحدوں کی حفاظت کرنے والوں کے خلاف شہر میں جا کر کوئی کارروائی کرنا اصولاً غلط اور ناروا ہے۔ ہر سرحد کا سپاہی
ملک کی حفاظت کی خاطر جان دیتا بھی ہے اور لیتا بھی ہے۔ انڈیا نے ہمارے سیکڑوں بیٹے شہید کیے، ہم نے بھی ان کے کئی
سورماؤں کو ہلاک کیا۔ دونوں جانب سے حساب برابر رہا۔ آگے بھی ہم لڑیں گے۔ مریں گے بھی اور ماریں گے بھی، لیکن
سرحد کی لڑائی کو سرحد تک محدود رہنا چاہیے۔ البتہ ظلم، سفاکی اور دہشت گردی کا بدلہ لینا ہر حال میں جائز ہے۔ اس سنگ دل
نے جانے کشمیر کی کتنے بچوں کو یتیم کیا، کتنی بیٹیوں کو بیوہ کیا، کتنے بوڑھوں کے سامنے ان کے بیٹوں کو ذبح کرایا، کتنی شریف
زادیوں کی عزت خراب کی۔ کتنے بچوں کا گلا کاٹا اس کا شمار ہی نہیں ہے۔ وزیرستان میں سیکڑوں دھماکے کروائے، دہشت
گردوں کو پناہ گاہ اور اسلحہ و بارود مہیا کیا۔ میری نظر میں اسے قتل کرنے کو صرف یہ وجہ ہی کافی تھی کہ اس نے ایک باپ سے
بیٹی چھینی ہوئی ہے۔ مگر اسے قتل کرنے کو تو اور بھی سیکڑوں وجوہات موجود ہیں۔ بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو وہ انڈیا کے
قانون کا بھی مجرم ہے، کیوں کہ اس کے کافی کام انڈیا سرکار کی اجازت کے بغیر تکمیل پاتے ہیں، لیکن وہاں بھی قانون کی
بالادستی کی صورت حال وطن عزیز سے مختلف نہیں کہ قانون بڑوں کے گھر کی لونڈی بن جاتا ہے۔"

میں ندامت سے بولا۔" معذرت خواہ ہوں سر! میرا سوال ہنوز جواب طلب ہے۔"

"دھیر ندر شکلا کو نہ صرف بھارتی سرکار کی جانب سے محافظ میسر ہیں بلکہ اس کے پاس زرخرید لڑاکوں کی بھی کثرت
ہے۔ اس کی ہوس ولالچ پہلے سے کئی گنا بڑھ چکی ہے۔ دہشت گردوں کو اسلحہ سپلائی کرنے کا ٹھیکا اب تک اسی کے پاس
ہے۔ یونہی بھارتی سپاہ کے لیے اسلحہ ساز کمپنیوں سے ہتھیاروں کی خریداری کے معاہدوں میں بھی وہ پیش پیش ہے۔ حاضر
سروس جرنیلوں کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لینا اس کے لیے بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسے افراد مل کر ایک مافیا بنا لیتے ہیں جو
محب وطن افسران کو آگے آنے سے روک کر اپنے ہم خیال و اپنے جیسے افراد کو سامنے لاتے ہیں۔ اسلحے کے معیار پر بے
شک سمجھوتہ نہ کیا جائے لیکن دس کی چیز پچاس میں خریدنے سے بھی کروڑوں، اربوں کا منافع ہاتھ لگتا ہے۔ جس میں سے
نصف تک متعلقہ عہدہ داران کو ہڈی ڈال کر بقیہ سے اپنے اکاؤنٹ بھر لیے جاتے ہیں۔ اور جس کے پاس دولت کی فراوانی
ہو اس کے دشمن بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اور جس کے دشمن زیادہ ہوں وہ اپنی حفاظت کے بندوبست میں بھی کوئی دقیقہ
فروگزاشت نہیں کرتا۔ ایسے آدمی کے خاتمے کو تم جیسا نشانہ باز ہی کام آ سکتا ہے۔"

میں ہنسا۔" ایسے آدمی کا خاتمہ تو پاک آرمی کا نقصان کرتا ہوا۔"

"شاید۔" اس نے تردید نہ کی۔" لیکن میں بھارت سرکار کے فائدے کے بجائے اپنا الو سیدھا کر رہا ہوں۔ یوں

بھی اس کی جگہ لینے کو کئی طلب گار موجود ہیں، بدی کے درخت کی جڑیں انسان کی رسائی سے دور ہیں۔ ہم صرف اس کی تراش ہی کر سکتے ہیں، بدی کو فنا کرنا قادرِ مطلق کے بس میں ہے اور اس نے مہلت دی ہوئی ہے۔ کس میں طاقت ہے کہ اس سے چھین سکے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔"جانا کب ہے؟"

وہ مسکرائے۔"پہلے رضامندی تو ظاہر کرو۔"

میں عقیدت سے بولا۔"اپنے ہیرو کے کام آنا میرے لیے باعث سعادت ہوگا۔"

"شکریہ بیٹا۔"شفقت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے انھوں نے مجھے لپٹا لیا تھا۔"تمھارے ساتھ ایک اور جوان بھی جا رہا ہے۔ چند دنوں میں تمھارے شناختی کاغذات تیار ہو جائیں گے۔ ہفتے کو تمھاری خصوصی تربیت شروع ہوگی جو کہ تین دن جاری رہے گی تب تمھیں مزید تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔"

"پھر اجازت دیں سر!"میں نے گھڑی کو دیکھا سوئیاں تین کے ہندسے کو چھو رہی تھیں۔

انھوں نے میری دل لگتی بات کہی۔"بہتر ہوگا دو تین دن گھر گزار لو، ہفتے کی شام تمھاری یونٹ میں میٹنگ ہوگی وہاں تک پہنچ جانا۔"

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔"وسیم صاحب سے اجازت لینا پڑے گی۔"

میری ہچکچاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔"ڈرائیونگ جانتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چابی بڑھاتے ہوئے وہ اطمینان سے بولے۔"گیراج میں سوزکی کار کھڑی ہے، لے جاؤ۔ وسیم کو میں بتا دوں گا۔ اب تم میرے حوالے ہو چکے ہو۔"

"شکریہ سر۔"مسرت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ان سے الوداعی مصافحہ کیا اور باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد چکلالہ کینٹ کی حدود سے نکل کر راولپنڈی کی کشادہ سڑکوں پر رواں دواں تھا۔ مجھے انصاری صاحب کی پری اور پارٹی بھول چکی تھیں، کچھ یاد تھا تو اپنی پلوشے اور اس کی ناراضی۔

صبح کی نماز تک میں گھر پہنچ گیا تھا۔ میری آمد پر روما کھل اٹھی تھی، مگر پلوشے کا موڈ پہلے ہی کی طرح تھا۔ اسے اکیلے میں گھیر کر میں نے انڈیا مشن کے بارے آگاہ کیا، یہ بھی کہا کہ زندگی موت کا کچھ پتا نہیں واپس آ سکوں گا یا نہیں اس لیے ہو سکے تو مجھے معاف کر دے۔ مگر میرے سچ کو سفید جھوٹ خیال کرتے ہوئے اس نے اتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی کہ میری جانب دیکھ ہی لیتی۔ منت سماجت سے اس کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی تھی۔ جب تھک کر باہر جانے لگا تب اس کی جذبات سے عاری آواز ابھری۔

"بہتر ہوتا اگر طلاق کے بارے کوئی فیصلہ کر کے آتے، کیوں کہ میں نہیں چاہتی میرے عدالت سے رجوع کرنے تمھارا مذاق بن جائے۔"

میں بپھر کر مڑا۔"دماغ جگہ پر ہے۔ اور تم کسے کہا؟"

بے پروائی سے بولی۔"تمھیں۔"

میں آزردہ ہوا۔"پلوشے! سچ میں انڈیا جا رہا ہوں، ہو سکتا چھے ماہ میں لوٹوں، ہو سکتا ہے سال لگ جائے، یہ بھی ممکن لوٹ ہی نہ پاؤں۔"

وہ بےگانے پن سے بولی۔"اسے بتاؤ، جسے تمھاری پروا ہو۔"

اللہ ڈینو کا تعلق سندھ سے تھا۔ گہرا سانولا رنگ، میانہ قامت، چھریرا بدن، عام شکل وصورت کہ دیکھنے والوں کو کوئی کشش محسوس نہ ہو۔ بظاہر یوں لگتا جیسے سیدھا سادا دھاڑی لگانے والا مزدور، مزارع یا پریشان حال بے روزگار ہو۔ لہجہ بھی گنواروں کا سا اور پھر سندھیوں کی بول چال سے تو فوراً ان کی پہچان ہو جاتی ہے، مگر بہ باطن : بے ضرر دکھائی دینے والا جوان چست و چالاک، چاق و چوبند اور ہر دم چوکنا و تیار ایسا کمانڈو تھا جس کی نظریں عقاب کی طرح تیز تھیں۔ دست بدست لڑائی میں طاق، اسلحے کا شناور، بارودی پھندوں اور آئی ای ڈیز لگانے میں ماہر، بھیس بدلنے میں مشاق، تجربے کار و منجھا ہوا کمانڈو تھا۔ اس میں مشکلیں جھیلنے اور مصائب کا سامنا کرنے کی قوت برداشت عام آدمی سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سنیچر کی شام ہماری طویل بیٹھک ہوئی۔ اللہ ڈینو دیر سے پہنچا تھا اور تب تک انصاری صاحب اس کے بارے تفصیل سے بتا چکے تھے۔

اس کی آمد پر رسمی تعارف کے بعد کام کی بات شروع ہوئی۔ بہت سی خبریں زیر بحث لائی گئیں، لائحہ عمل طے ہوئے، ڈھیر ساری تجاویز پر غور ہوا، ممکنہ خطرات سے نپٹنے کے منصوبے بنائے گئے، ہمدردوں اور کام آنے والوں کی شناخت اور پتے ذہن نشین کیے گئے، ایسے افراد جن سے عارضی طور پر کام لیا جاسکتا تھا ان کے بارے ہدایات ملیں۔ ان کے علاوہ بھی انصاری صاحب نے اپنے تجربات کا نچوڑ اور انڈیا میں کام کرنے کے طریقوں سے واقفیت دلائی۔ ساری رات ہمارا سبق شروع رہا۔ صبح نماز پڑھ کر سونے کا موقع ملا تھا۔ اور یہ بے ضابطہ تربیت اگلے دو روز تسلسل سے جاری رہی۔ انصاری صاحب محبت، شفقت اور جاں فشانی سے ہمیں سکھاتے رہے۔ انھوں نے ضروری مشورے اور نصیحتیں بیسیوں بار دہرائیں۔ ہم اپنے ساتھ لکھا ہوا مواد نہیں لے جاسکتے تھے اس لیے متعلقہ لوگوں کے نام پتے اور فون نمبر یاد داشت میں محفوظ کرنا تھے۔ اس ضمن میں مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انصاری صاحب کے ایک بار بتانے ہی پر مجھے ضروری معلومات ذہن نشین کر لی تھیں۔ اللہ ڈینو بھی تربیت یافتہ کمانڈو تھا تین دن کی مسلسل دہرائی کے بعد اسے بھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ اس دوران ہمارے شناختی کاغذات بن گئے تھے۔

اور پھر ایک دن ہم جانے کو تیار تھے۔ بدھ کو عمان کی پرواز تھی۔ ہم اپنے اصل پاسپورٹ پر عمان پہنچے تھے۔ وہاں دن گزار کر ہم نے انڈیا کا رخ کرنا تھا۔ اس دوران ہمارے جعلی پاسپورٹوں پر دو مختلف تواریخ درج کی گئیں۔ میرے پاسپورٹ پر ایک سال پہلے انڈیا سے عمان آمد کا اندراج ہوا، جبکہ اللہ ڈینو کے پاسپورٹ میں ڈیڑھ سال پہلے کی تاریخ ڈالی گئی۔ ہفتے کو ہم ممبئی روانہ ہوئے۔ پاکستانی پاسپورٹ اور شناختی کارڈز وغیرہ ہم نے عمان ہی میں اپنے خاص آدمی کے پاس چھوڑ دیے تھے۔ اب ہم راجا ذیشان حیدر اور اللہ ڈینو کے بجائے سندیپ چوپڑا اور گوپال چند تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہماری سیٹیں بھی علیحدہ علیحدہ تھیں۔ جہاز نے مسقط ہوائی اڈے سے پرواز بھری۔ اور کوئی گھنٹے بعد ممبئی جا اترا۔ ممبئی کی حیثیت انڈیا کے لیے ایسی ہی ہے جیسے پاکستان کے لیے کراچی ہے۔ کراچی کی طرح ممبئی بھی ساحلی شہر

اورآبادی ور قبے کے لحاظ سے کراچی سے بڑا ہے۔ اگر اس کے نقشے کو غور سے دیکھیں تو یہ تین اطراف، سمندر میں گھرا ہے
اور جو جگہ بچ جاتی ہے وہاں دریا نے گھیرا ہوا ہے یوں ممبئی ایک جزیرے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

دھیرندر شکلا کا پرانا ٹھکانہ آگرہ میں تھا۔ لیکن بھارت کے چند بڑے شہروں میں اس کی رہائش گاہیں موجود تھیں۔ مسلسل کام کی وجہ سے وہ شاذ و نادر ہی کسی جگہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ گزار پاتا تھا۔ اس کا کاروبار نہایت منضبط بنیادوں پر جاری تھا۔ اس کی انتظامیہ میں قابل بھروسا اور اعلیٰ صلاحیتوں والے شامل تھے۔ اس کے محافظوں میں بڑی تعداد انڈین آرمی کے ریٹائرڈ کمانڈوز کی تھی۔ بعض تو نوکری کے اختتام سے پہلے ہی مستعفی ہو کر اس سے آن ملے تھے۔ کہ اس نے انڈین آرمی سے زیادہ مراعات اور تنخواہ کی پیش کش کی تھی۔ سچ کہیں تو وہ ایک مافیا کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ پرما انصاری کو اس نے کس شہر میں رکھا ہوا تھا اس بارے انصاری صاحب لاعلم تھے۔ شروع میں انھوں نے اپنی بیٹی کو آگرہ سے اغوا کرانے کی ناکام کوششیں کیں۔ جس کی وجہ سے دھیرندر شکلا نے نہ صرف پرما کی حفاظت بڑھادی تھی بلکہ اسے آگرہ سے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا تھا۔ اس کی تعلیم جاری تھی، انصاری صاحب کے بہ قول وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، یقیناً کسی اچھے میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہوگی۔ بدقسمتی سے انصاری صاحب کے پاس اس کی تصویر بھی موجود نہیں تھی کیوں کہ وہ افراتفری میں انڈیا سے فرار ہوئے تھے۔ حلیہ پوچھنے پر معلوم ہوا، محترمہ کے بال سنہری تھے۔ مگر وہ وقتاً فوقتاً ڈرائی کراتی رہتی تھی، اس لیے کبھی کالے ہو جاتے کبھی بھورے، کبھی نیلے تو کبھی سفید۔ اسکول دور میں کندھوں سے کافی نیچے تک پھیلے تھے اور اب جدید انداز میں ترشوانے پر صرف کندھوں کو چھوتے تھے۔ (صاف مطلب کہ بالوں کے ذریعے پہچان ناممکن تھی) آنکھیں شوخ، شرارتی جن میں ذہانت کی چمک تھی۔ زبان خاموش بھی ہوتی تو آنکھیں بولتی محسوس ہوتی تھیں۔ (ہر نو عمر نوجوان شرارتی لڑکی کی آنکھیں ایسی ہی لگتی ہیں) کشادہ پیشانی، روشن و معصوم چہرہ (ہر محبت کرنے والے باپ کو بیٹی کا چہرہ ایسا ہی لگتا ہے) اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی خوبیاں اور نشانیاں بتلائیں مگر تمام اتنی عام تھیں کہ ہر پانچویں لڑکی پر پرما کا شبہ ہو سکتا تھا۔ میں نے جتانا مناسب نہ سمجھا۔ اب محترمہ کی پہچان بھی ہمارے لیے مسئلہ ہی تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آیا وہ انصاری صاحب کے حوالے سے وہ ہمارے ساتھ آنے پر تیار ہو جاتی یا سچ مچ اسے اغواء کرنا پڑتا۔ انصاری صاحب کے بہ قول وہ ان پر جان دیتی تھی۔ لیکن انصاری صاحب کے جانے کے بعد دھیرندر شکلا نے کچے ذہن کی لڑکی کے دماغ میں کیا کچھ الٹا سیدھا بھرا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسے ٹھکانے لگانا بھی علیحدہ دردِ سر تھا۔ اگر اسے قتل کیے بغیر مسئلہ حل ہو جاتا تو زیادہ بہتر رہتا کہ ہمارے پاس انڈیا کے اندرونی معاملات کو سدھارنے کا ٹھیکا نہیں تھا۔ ہمارا مقصد تو فقط پرما کا حصول تھا۔ وہ انصاری صاحب کی اولاد تھی اور اس پر مکمل طور پر باپ کا حق تھا۔ لیکن انصاری صاحب دھیرندر شکلا کے قتل پر بہ ضد تھے۔ وہ مجسم بدی تھا اور اس کے بہت سارے گناہوں کے گواہ خود انصاری صاحب تھے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی خوف تھا کہ وہ پرما کو پاکستان سے بھی اغواء کرانے کی کوشش ضرور کرتا۔ انصاری صاحب بیٹی کو کب تک چھپا سکتے تھے۔ دھیرندر شکلا کے ہاتھ کافی لمبے تھے۔ وہ شرارت سے کبھی باز نہ آتا اور اس کا مستقل حل یہی تھا کہ دھیرندر شکلا باقی نہ رہتا۔

ہم ممبئی کے چھترپتی شیواجی انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترے۔ پاکستان ہو یا انڈیا ہر دو ممالک کی خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر کثیر تعداد میں جمع رہتے ہیں۔ ان کا کام ملک دشمن عناصر کو تاڑنا، ان کا پیچھا کرنا اور ان پر شکنجہ کسنا ہوتا ہے۔ کوئی بھی جاسوس صرف کاغذات کے بل بوتے پر نہیں پکڑا جاتا اور نہ بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر آنے والے مسافروں کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ ایجنسیاں ہر ایک کے کاغذات جانچ سکیں۔ ائرپورٹ کا عملہ کاغذات کی جانچ پڑتال باریک بینی سے کرتا ہے لیکن جعل ساز بھی کچی گولیاں نہیں کھیلتے کہ ان کے بنائے کاغذات آسانی سے پکڑے

جاسکیں۔

ایجنسیوں کے پاس جاسوسوں کو پہچاننے کے مختلف گر اور طریقے ہوتے ہیں۔اس میں قیافہ شناسی، جاسوس کا اکیلا ہونا، یعنی بیوی بچوں کے بغیر سفر کرنا، ان کے پاس مختصر سامان کا ہونا، انھیں ہوائی اڈے پر وصول کرنے کو خاندان کے کسی فرد کا نہ آنا، آدمی کا خواہ مخواہ دائیں بائیں چوکنا انداز میں گھورنا۔ خوف زدہ یا گھبرایا ہوا نظر آنا، مستقل ٹھکانہ نہ ہونے کے باعث اکثریت کا ہوٹلوں و مہمان خانوں میں رہنا اور بھی بہت سی وجوہ سے جاسوسوں کی پہچان ہوتی ہے۔روزانہ سیکڑوں ہزاروں افراد کی بیرون ملک سے آمد ہوتی ہے۔ایجنسیوں نے ہر ملک سے آنے والے افراد کو مختلف درجوں میں بانٹا ہوتا ہے۔جن میں کچھ ممالک سے آنے والے افراد کو زیادہ باریک بینی اور احتیاط سے جانچا جاتا ہے۔ایجنسیوں والے مشکوک افراد کا تعاقب اور دور دور سے نگرانی کر کے اپنا شبہ رفع کرتے ہیں۔

کاغذات کے مطابق ہم سال ڈیڑھ کے بعد عمان سے لوٹ رہے تھے۔اور کسی ایسے فرد کا مختصر سامان کے ساتھ سفر کرنا عجیب لگتا ہے۔تبھی میرے پاس دو تین بڑے بڑے سوٹ کیس تھے جن میں مردوں، عورتوں اور بچوں کے کپڑوں کے علاوہ مختلف قسم کے کھلونے وغیرہ بھرے تھے۔کاغذات کی جانچ پڑتال کرا کے مجھے سامان کے انتظار میں بیٹھنا گوارا نہیں تھا۔وطن عزیز کی طرح وہاں بھی کام نکلوانے کو تصویری کاغذ استعمال ہوتے ہیں۔مہاتما گاندھی کی تصویر کی پوجا رام، کرشن اور بھگوان سے زیادہ کی جاتی ہے۔پرانے مسافر ایسے چٹکلوں سے واقف ہوتے ہیں کہ کیسے تھوڑی سی نقدی خرچ کر کے انتظار سے بچا جائے۔گو بین الاقوامی مسافرت کا مجھے زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن انصاری صاحب کے پرمغز اسباق یاداشت میں زندہ تھے۔چند سو کی قربانی دے کر میں اپنے سامان کے ساتھ ائرپورٹ سے باہر آ گیا۔پارکنگ میں ٹیکسی ڈرائیور سے بھاڑا (کرایہ) طے کرتے ہوئے کافی مغز ماری کی کہ یہ بھی انڈین عوام کی فطرت کی عکاس ہے۔خود کو مشکوک ہونے سے بچانے کو یہ ڈراما بھی ضروری تھا۔ٹیکسی کے پارکنگ سے نکلنے سے پہلے اللہ ڈینو کندھے سے بیگ لٹکائے، ایک بڑا بیگ کھینچتا ہوا نمودار ہوا۔اس نے ہاتھ اٹھایا۔ٹیکسی ڈرائیور یقیناً نہ رکتا، مگر میرے کہنے پر بریک دبا دی۔

''بھائی، جو چندرا گاؤں جانا ہے۔''

میں نے سمندر کنارے موجود وسائی ٹاؤن کا بتایا تھا، جو چندرا اس سے پہلے آتا تھا تبھی میں سرعت سے بولا۔

''اسے بھی ساتھ لے چلتے ہیں راستے میں اتار دیں گے۔''

''پانچ سو زیادہ لگیں گے۔''ٹیکسی ڈرائیور سودے بازی پر اتر آیا تھا۔ذرا سے مول تول پر ساڑھے تین سو زائد دینے پر معاملہ ختم ہوا۔وسائی ٹاؤن ائیرپورٹ سے پچاس ساٹھ کلو میٹر دور تھا۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی وسائی ٹاؤن کی طرف روانہ تھی۔اللہ ڈینو عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔رستے میں ہم دونوں انجان مسافروں کی طرح شناسائی بڑھانے لگے۔معاشی مسائل، بہنوں کا جہیز، پردیس کی نوکری میں مشکلات، بڑھتی ہوئی مہنگائی، بچوں کے تعلیمی اخراجات وغیرہ مماثل مسئلے تھے، جن پر ہم محو گفتگو رہے۔ڈرائیور بے چارہ بھی انھی حالات کا ڈسا تھا زور و شور سے شامل گفتگو ہو گیا۔

گھنٹا ڈیڑھ بعد ہم وسائی پل سے گزر کر دریائے الہاس عبور کر چکے تھے۔آگے رش کم تھا ٹیکسی کی رفتار میں اضافہ ہوا، جو چندرا جانے کو ہمیں ہائی وے چھوڑ کر لنک روڈ پر مڑنا پڑا، جو جو چندرا گاؤں سے ہو کر وسائی پل جاتا تھا۔وہاں جانے ہم پہلی بار رہے تھے لیکن انصاری صاحب نے ہمیں نقشوں پر اتنی وضاحت اور تفصیل سے سڑکوں وغیرہ کے بارے آگاہی دی تھی کہ لگتا تھا کئی بار سفر کر چکے ہوں۔

لنک روڈ پر موڑ کر ہم ذرا سا آگے بڑھے تھے کہ دو جیپیں ہمیں ''اوورٹیک'' کر کے آگے بڑھیں اور پچاس ساٹھ قدم

دور جا کر رستہ روک دیا۔ جیپ سواروں کا حلیہ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ ڈرائیور کا پسینہ نہ نکلتا۔ اس نے فوراً ٹیکسی روکی اور ہاتھ بلند کیے لرزتا ہوا باہر نکلا۔ ہمارے پیچھے دو تین کاریں آرہی تھیں، انھوں نے دور ہی سے کاریں واپس موڑیں اور دم دبائے بھاگ پڑے۔ ممبئی کو مجرموں کی جنت کہتے ہیں، وہاں سرکار راج کے بجائے غنڈہ راج چلتا ہے۔ پولیس خود اتنی ہے کہ دم مارنے کا حوصلہ نہیں کرسکتی۔ جواء خانوں اور شراب خانوں کی تو خیر حکومتی سطح پر اجازت ہے لیکن ممنوع نشے بکتا ہے، اسلحے کا کاروبار، قتل و غارت و بھتہ خوری کو جرم ہونے کے باوجود کوئی روک نہیں پاتا۔ ممبئی کی غنڈہ گردی دیکھ کر کراچی امن و امان اور شرافت کا گہوارا نظر آنے لگتا ہے۔ پورا شہر غنڈوں کے ہاتھ گروی ہے۔ انھیں وزیروں اور اہم شخصیات کی پشت پناہی حاصل ہے، بلکہ اکثریت کو سامنے لانے والے سیاسی ٹولے ہی ہیں۔

ہمارا ابھی ٹیکسی میں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ دونوں جیپوں میں تین تین افراد سوار تھے۔ ان کا سرغنہ سانولے رنگ کا دراز قامت جوان تھا۔ لمبے گھنے بال جو اس کے شانوں پر پھیلے تھے۔ کالے پاجامے پر اس نے نصف بازووں کی بنیان پہنی تھی۔ بازو کی تڑپتی مچھلیاں اور فراخ چھاتی کو دیکھ کر اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو سکتا تھا۔ ہمارے چہروں پر بھی خوف ابھر آیا تھا۔

اس نے پر رعب آواز میں پوچھا ''سکندر کون ہے؟''

میں ہکلایا۔ ''مم...... مم...... مہاراج میرا نام سندیپ ہے، آپ شناختی کارڈ دیکھ سکتے ہیں۔''

اللہ ڈینو نے بھی خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''میں گوپال ہوں۔''

وہ اپنے آدمیوں کی طرف مڑا، ایک نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''دادا! ٹیکسی کا نمبر یہی بتایا گیا ہے، لگتا ہے جھوٹ بک رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ ڈرائیور کو مخاطب ہوا۔

''انھیں چھترپتی انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے اٹھایا ہے نا۔''

''جی مہاراج۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

دادا اطمینان سے بولا۔ ''دونوں کو لے چلو، وہ خود اپنا مجرم پہچان لیں گے۔''

''چلو اوئے۔'' ایک نے تڑی دی۔

اللہ ڈینو ہکلایا۔ ''مم...... مہاراج شما کر دو۔''

اس نے پستول لہراتے ہوئے دھمکایا ''چلتے ہو یا ادھر ہی ٹھوک دوں۔''

ہم لرزتے کانپتے جیپوں میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی سے ہم نے ایک ایک چھوٹے بیگ کے علاوہ کچھ نہیں لیا تھا۔

ایک غنڈہ ٹیکسی ڈرائیور کو بولا۔ ''اگر یہ کل تک نہ لوٹیں تو کبھی نہیں لوٹیں گے۔ ان کا سامان استعمال کر لینا۔''

ٹیکسی ڈرائیور ہونقوں کی طرح کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ ہم پریشانی و خوف ظاہر کرتے غنڈوں کے درمیان پھنسے بیٹھے تھے۔

جیپیں واپس مڑیں اور تیز رفتاری سے چل پڑیں۔ گھنٹے بھر بعد ہم ان کے اڈے پر تھے۔ انھوں نے ایک ہوٹل کے عقبی جانب اڈہ بنایا ہوا تھا۔ وہ ایک وسیع عمارت تھی اس کی چار دیواری ہوٹل سے متصل تھی یوں کہ اسے ایک ہی عمارت سمجھا جا سکتا تھا۔ سامنے قانونی کاروبار اور عقب میں غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز۔

اڈے پر پہنچتے ہی دادا نرم لہجے میں بولا۔ ''پاریش ملہوترا (انصاری صاحب) کے ساتھ اتنا ہی معاہدہ ہوا تھا۔''

اللہ ڈینو نے منہ بنایا۔ ''تو کیا انھوں نے منع کیا تھا کہ ہم سے کھانے کا نہ پوچھنا۔''

دادا کا قہقہہ بلند ہوا۔ ''یار جب تک دل چاہے سلطان دادا کا اڈہ حاضر ہے۔ میں فقط معاہدے کا ذکر کر رہا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''وصولی ہوگئی ہے یا...... ؟''
وہ بے نیازی سے بولا۔ ''یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔''
اللہ ڈینو نے خیال ظاہر کیا۔ ''شاید ایک دو دن ہمیں رکنا پڑے۔''
سلطان دادا نے بے فکری سے کہا۔ ''اس بارے وضاحت کر چکا ہوں۔''
''تو کوئی آرام کی جگہ دکھا دیں۔'' اللہ ڈینو نے نشست چھوڑ دی۔
''وکرم انھیں کمرہ دکھاؤ۔'' اس نے ایک آدمی رہنمائی کو ساتھ بھیج دیا۔
سلطان دادا کا اڈہ کافی وسیع تھا۔ بڑا سا صحن اور درجنوں کمرے۔ وکرم ہمیں درمیانے حجم کے کمرے میں لے آیا
اں لوہے کی تین چار پائیاں پڑی تھیں۔
''میں بھوجن کا بندوبست کرتا ہوں۔'' وہ باہر نکل گیا۔
ہم نے چار پائیاں سنبھال لیں۔
''یہاں تک تو کام بہترین ہو گیا ہے۔'' تکیے پر سر ٹکتے ہوئے اللہ ڈینو نے اطمینان ظاہر کیا۔
میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے پرما کی تلاش یہیں سے شروع کر دینا چاہیے۔''
اللہ ڈینو نے تائید کی۔ ''شکلا کی ممبئی میں رہائش ضرور ہوگی اور وہ کافی مشہور ہے یقیناً ڈھونڈنے میں اتنی مشکل نہ
''
''لیکن احتیاط کرنا پڑے گی، ایسے افراد کے مخبر بھی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں۔ اسے ذرا بھی بھنک پڑ گئی تو مشکلات
ا فہ ہو جائے گا۔''
اللہ ڈینو نے منہ بنایا۔ ''پہلے کون سا کم ہیں۔''
بن پھیکے لہجے میں بولا۔ ''یقین مانو پہلی بار اتنے فضول کام سے واسطہ پڑا ہے۔ ساری زندگی لبلبی دبائی
ضاری صاحب نے الٹے کام پر لگا دیا ہے۔ پہلے پرما بی بی کو ڈھونڈو، پھر اغواء کرو اور پھر پاکستان پہنچانا سمجھ میں
کیسے ہوگا، جبکہ یہ بھی پتا نہیں وہ باپ کے پاس جانا چاہتی ہے یا نہیں۔''
ہ ڈینو نے کہا۔ ''تمھیں یہاں بھی لبلبی دبانے بھیجا گیا ہے، باقی ذمہ داری تو میرے سر ہے۔''
ا نے اطمینان سے کہا۔ ''پھر میں سلطان دادا کے پاس قیام پذیر رہوں، تم ذمہ داری نبھاؤ میری باری پر بلا لینا۔''
ڈینو نے سر کھجاتے ہوئے قہقہہ بلند کیا۔ ''مذاق کیا تھا یار، تم نے سنجیدہ ہی لے لیا۔''
م کھانے کے برتنوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور ہم بحث چھوڑ کر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔
یا پینا پسند کریں گے، وسکی، اسکاچ، شیری، دیسی سب موجود ہے۔'' برتن میز پر رکھ کر اس نے ہماری پسند پوچھی۔
ینو اطمینان سے بولا۔ ''وائیٹ بیئر......''
نے سوالیہ لہجے میں دہرایا۔ ''وائیٹ بیئر......؟''
ینو نے وضاحت کی۔ ''مطلب لسی...... اگر نہیں ہے تو چائے یا کافی بھی چل جائے گی۔ باقی جو مشروب آپ
یں انھیں پینے کا حوصلہ نہیں ہے بھائی۔''
سکراتا ہوا باہر نکل گیا۔
ہو نے خیال ظاہر کیا۔ ''دھیرندر شکلا کی ممبئی والی رہائش گاہ کا سلطان دادا کو یقیناً معلوم ہوگا۔''
نے کہا۔ ''مگر پوچھ نہیں سکتے، انصاری صاحب نے صاف کہا تھا کہ سلطان دادا ہمیں اغواء کر کے انٹیلی جنس

کے ممکنہ اندیشے سے نجات دلانے کا ذمہ دار ہے اور بس۔ اگر اس سے ہدف کے بارے کوئی معلومات لینا مناسب ہوتا تو وہ وضاحت کر دیتے۔''

وہ متفق ہوا۔''دو تین دن تو یہاں گزارنا پڑیں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''احتیاط ہی میں بھلائی ہے۔''

کھانے کے اختتام تک چائے آگئی تھی۔ پیالیاں ہمیں پکڑا کر وکرم برتن سمیٹنے لگا۔ ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ فائر کی آواز آئی اور پھر شور سنائی دینے لگا۔ وکرم بھاگ کر باہر نکلا، ہم بھی پیچھے ہو لیے تھے۔

پانچ مسلح افراد داخلی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ آگے آگے چھریرے بدن اور لمبی قامت کا جوان تھا۔ جو بآواز بلند سلطان دادا کو للکار رہا تھا۔

''سلطان دادا! تم نے راجپوت کی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔ اگر تمہارے خیال میں راجپوت کے گروہ نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں تو لو آ گئے ہیں۔ ہماری خالی کلائیاں دیکھ کر یقین آئے نہ آئے گولی کی دلیل پر شبہ دور ہو جائے گا۔''

سلطان دادا خالی ہاتھ تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے گرگوں کو ہتھیار نیچے کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔

''تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے راجپوت! سلطان نہ معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے دادا کے علاقے میں واردات کا شوقین ہے۔''

''مجھے ملنے والی اطلاع جھوٹی نہیں ہو سکتی۔'' راجپوت اس کی صفائی پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔

سلطان ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔''میں اپنے آدمی واپس لینے گیا تھا۔ دونوں تمھارے سامنے کھڑے ہیں۔ اطمینان سے تسلی کر لو۔''

راجپوت کے چہرے پر الجھن ابھری۔''میں سمجھا نہیں؟''

سلطان نے وضاحت کی۔''سندیپ اور گوپال میرے پرانے واقف کار کے جاننے والے ہیں۔ اس نے درخواست کی کہ انھیں چند دن اپنے پاس رکھوں۔ ہوائی اڈے پہنچا تو یہ وہاں سے جا چکے تھے۔ اپنے دوست سے معلومات لیں اور ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ باقی اغواء کا ڈراما کرنا انھیں تنگ کرنے کو کیا۔ ورنہ تمھاری حدود میں کوئی واردات کرنا ضروری ہوتا تو پہلے اجازت لیتا۔''

راجپوت نے اپنا پستول جیب میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی خفت ابھری۔''یقیناً تم میری جلد بازی کو شما کر دو گے۔''

سلطان دادا مسکرایا۔''اگر میرے ہمراہ بیٹھ کر ایک پیگ وسکی پی لی تو اس بارے سوچا جا سکتا ہے۔''

راجپوت لبوں پر پھیکی مسکراہٹ سجائے اس کے ساتھ ہو لیا۔ لڑائی کا ماحول ایک دم دعوتِ شرب و طعام میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سلطان دادا کے گرگے، راجپوت دادا کے ساتھیوں کو سنبھالنے لگے۔ ہم اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

سارا ممبئی مختلف جرائم پیشہ افراد نے بانٹا ہوا ہے۔ ہر بڑے غنڈے کا اپنا علاقہ ہے جہاں دوسرا غنڈہ کوئی واردات نہیں کر سکتا۔ اس میں جیب تراشی سے لے کر بینک ڈکیتی تک کے جرائم شامل ہیں۔ بلکہ غنڈہ گردی تو در کنار ممبئی اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں تو بھیک مانگنے والی مافیا تک نے علاقے تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ راجپوت دادا بھی اسی سلسلے میں سلطان دادا کے پاس حساب کتاب کرنے آیا تھا کہ اس کے تئیں سلطان دادا نے ہمیں اس کی حدود میں اغواء کر کے حد بندی کی خلاف ورزی کی تھی۔ اور سلطان دادا نے حکمت سے معاملہ سنبھال لیا تھا۔

''ان غنڈوں کا جاسوسی نظام تو حکومت سے کئی گنا تیز ہے۔'' چارپائی سنبھالتے ہی اللہ ڈینو نے حیرانی ظاہر کی۔

میں ہنسا۔ ''پیٹ کا معاملہ ہے بھائی۔ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں، دو ملا مرغی حرام کر دیتے ہیں، سالار فوج مروا تو سکتے ہیں لڑا نہیں سکتے، پھر ایک علاقے میں دو غنڈوں کا راج کیسے ہو سکتا ہے۔''

اللہ ڈینو نے دکھ ظاہر کیا۔ ''کراچی میں تھوڑا عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہاں بھی یہی حالت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی بڑی وجہ ہماری گندی سیاست ہے۔ بے چاری پولیس تو وزیروں کے ہاتھ ہے، جس ڈاکو غنڈے پر ہاتھ ڈالتی ہے وہ کسی نہ کسی ایم این اے کا اپنا بندہ یا منظور نظر نکلتا ہے۔ آرمی پہلے ہی اتنے محاذ پر منقسم ہے کہ کوئی نیا محاذ نہیں کھول سکتی۔ تو تبدیلی کیسے آئے گی۔ یقین کرو پولیس کو خود مختار کرنا اس مسئلے کا بہترین حل ہے مگر صاحب اقتدار طبقے کو یہ حل منظور نہیں۔''

اللہ ڈینو نے موضوع تبدیل کیا۔ ''ویسے سلطان دادا نے کچھ زیادہ تحمل اور برداشت کا مظاہرہ نہیں کیا؟''

''غلطی کا اعتراف کرنا اس کی مجبوری تھی۔ راجپوت دادا کے علاقے میں دخل اندازی اس نے کی تھی۔ یوں اس کے اڈے پر چڑھ دوڑنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ افرادی طاقت میں سلطان دادا سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔''

''یقیناً شکالا جی کے زیر زمین افراد سے قریبی تعلقات ہوں گے۔'' اللہ ڈینو نے نیا موضوع چھیڑ دیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تبھی اس کے متعلق ان لوگوں سے کسی بھی قسم کی معلومات لینے سے گریز ان ہوا۔''

اللہ ڈینو نے خیال ظاہر کیا۔ ''ہم نوکری حاصل کرنے کے بہانے زیر زمین کام کرنے والے کسی اور گروہ سے بھی معلومات لے سکتے ہیں۔''

اس کا مشورہ پسند آیا تھا، میں نے اتفاق میں سر ہلا دیا۔ اور ہم اسی بارے مشورہ کرنے لگے۔ مگر دکرم نے ہمیں زیادہ دیر گپ شپ نہیں کرنے دی تھی۔ دروازہ بجا کر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آیا۔

''اپنا سامان اٹھا کر میرے ساتھ چلیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ اور انداز ایسا نہیں تھا کہ استفسار کے چکروں میں وقت کھوٹا کرتے۔ اپنے مختصر بیگ سنبھال کر ہم اس کی معیت میں کمرے سے نکلے۔ عمارت کے داخلی دروازے کے بجائے وہ ایک اور کمرے میں گھس گیا تھا۔ وہ خواب گاہ تھی۔ ایک کونے میں سنگل بیڈ رکھا تھا، ساتھ ہی تین کرسیاں پڑی تھیں اور عقبی دیوار کے ساتھ لکڑی کی منقش پٹ والی کپڑوں کی ایک چوڑی الماری رکھی تھی۔

دکرم نے الماری کے پٹ کھول کر ہینگر میں لٹکے کپڑوں کو بائیں جانب اکٹھا کیا اور کوئی مخصوص بٹن دبایا، الماری پیچھے کی جانب کھل گئی تھی۔ ایک تنگ سا دروازہ نظر آیا جس کے عقب میں سیڑھیاں تھیں۔ دکرم پہلی سیڑھی پر رک گیا۔ ہمیں نیچے اترنے کا اشارہ کر کے وہ خود دروازہ بند کرنے لگا۔

دس پندرہ سیڑھیاں اتر کر چھوٹی سی گیلری تھی۔ اس کے بعد پھر سیڑھیاں تھیں۔ دکرم ہم سے آگے بڑھ گیا۔ سیڑھیوں کا اختتام لکڑی کے دروازے پر ہوا۔ دروازہ کھول کر دکرم اندر گھسا، پہلے کمرے ہی کی طرح وہاں کپڑوں کی ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ الماری کے رستے ہم دوسری جانب خواب گاہ میں پہنچ گئے۔

دکرم نے ایک چابی میری طرف بڑھائی۔ ''دائیں جانب، تیسرے، چوتھے نمبر پر کمرہ نمبر ایک سو انیس ہے۔ وہاں ٹھہر کر اگلی ہدایت کا انتظار کرو۔''

اللہ ڈینو نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، مگر جانے سے پہلے ہماری الجھن دور کر دو۔''

دکرم نے وضاحت کی۔ ''راجپوت دادا کو ہماری کارروائی کی اطلاع کرن چاولہ سے ملی۔ اور زیر زمین حلقوں میں کرن چاولہ کی شہرت را کے مخصوص کارندے کی حیثیت سے ہے۔ یقیناً اپنا شک دور کرنے کو اس نے راجپوت دادا

سلطان دادا تک رہنمائی کی ہے۔اور اس صورت میں سیدھے راستے سے جانا آپ کو پھنسا سکتا تھا۔ بہرحال مطمئن نہ ہونا کہ خطرہ اب تک ٹلا نہیں۔اور سلطان دادا کی اجازت کے بغیر کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا۔اور نہ خود کو قیدی سمجھنا۔سب ہم آپ کے فائدے کو کیا جا رہا ہے۔"

آپ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکلے اور خود کو گیلری میں پایا جس کے دونوں جانب کمرے بنے تھے۔دروازوں پر کمرہ نمبرز کی تختیاں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہوٹل میں تھے۔ان کے اڈے کے عقبی جانب جو ہوٹل تھا یقیناً خفیہ رستے کے ذریعے ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔

دائیں جانب چوتھا دروازہ کمرہ نمبر ایک سو انیس کا تھا۔قفل کھول کر ہم اندر گھس گئے۔وہ درمیانے حجم کا کمرہ تھا۔کونے میں ڈبل بیڈ اور اس کے ساتھ شیشے کی ایک میز اور سامنے صوفہ سیٹ رکھا ہوا تھا۔بائیں ہاتھ بیت الخلاء و غسل خانے کا دروازہ تھا۔دائیں دیوار میں ایک بڑی کھڑکی تھی جس پر دبیز پردہ لٹک رہا تھا۔

ہونٹ پر نشست سنبھالتے ہوئے اللہ ڈینو بولا۔"یقیناً ہمارا ڈراما ناکام ہو گیا ہے۔"

"ضروری تو نہیں کہ انسان جو سوچے وہی ہو۔" میں بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔

اس نے منہ بنایا۔"ناکامی برداشت کرنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔"

میں نے شکرگزاری کا اظہار کیا۔"خوش قسمت ہیں کہ ناکامی کی اطلاع ہمیں دشمن کی زبانی سننے کو نہیں ملی۔ورنہ یہ بھی ممکن تھا اپنی آنکھ کسی عقوبت خانے میں کھلتی۔"

اللہ ڈینو نے فکرمندی ظاہر کی۔"کیا تمھیں لگتا ہے سلطان دادا ہمارے لیے راستہ نکال پائے گا۔"

میں بہ ظاہر متفق ہوا۔"اعتبار کرنے کے علاوہ کوئی صورت ہے تو بتاؤ۔"

"اگر معاملہ سچ میں را کا ہے تو وہ اتنی آسانی سے سلطان دادا کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔اور یہاں سے نکلنے میں جتنی سستی دکھائیں گے ہمارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جائے گا۔"

میں معترض ہوا۔"مگر وکرم ہمیں کہیں جانے سے منع کر چکا ہے۔"

ڈینو معنی خیز لہجے میں بولا۔"اور ہم اتنے بھولے ہیں ناں کہ اس کا کہنا مان لیں گے۔"

میں نے پوچھا۔"کیا تمھیں سلطان دادا پر شک ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔"نہیں، مگر اس کا خلوص بھی شاید ہمارے کام نہ آسکے۔وہ سلطان دادا کی کسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اسے مجبور بھی کر سکتے ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا انھوں نے ہوٹل کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔یقیناً ہوٹل سے سلطان دادا کے تعلق کو وہ اچھی طرح جانتے ہوں گے۔کرن چاولہ اب تک راجپوت دادا سے سلطان دادا کی واردات کی وضاحت سن چکا ہوگا اور اس کے بعد دو جمع دو چار کی طرح منطقی نتیجہ اخذ کرنا اس کے لیے مشکل نہ ہوگا۔"

اس نے زور دیا۔"یہی تو کہہ رہا ہوں، گھیرا مکمل ہونے سے پہلے بھاگنا مفید رہے گا۔دوسری صورت میں پھنسا یقینی ہو جائے گا۔"

"تو چلیں۔"، متفق ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

اللہ ڈینو نے منصوبہ پیش کیا۔"الگ، الگ ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔بچھڑ گئے اور موبائل فون پر بھی بات نہ ہو پائی تو نیتا بس اسٹیشن پر کل اور پرسوں دن کے دس بجے سے بارہ بجے تک ایک دوسرے کا انتظار کریں گے۔"(انڈین کنکشن کے موبائل فون ہمیں مسقط ہی میں اپنے خاص ایجنٹوں سے وصول ہو گئے تھے)

میں نے امید ظاہر کی۔"شاید وہ ہماری صورت سے واقف نہیں ہوں گے۔"

ڈینو بولا۔"جب بات مفروضوں کی ہے تو ہوائی اڈے سے پیچھا کرنے والے ایجنٹوں کو ہماری شناخت ہو سکتی۔اور یقیناً ہوٹل کے دروازے اور سلطان دادا کے اڈے کے باہر وہ افراد موجود ہوں گے۔"

میں نے مشورہ دیا۔"پھر لباس تبدیل کر کے بیگ یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

ڈینو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بیگ اٹھا کر غسل خانے میں گھس گیا۔ میں نے وہیں کپڑے تبدیل کر لیے۔ نیلی جینز پر پھول دار قمیص پہن کر ضروری کاغذات پتلون کی جیب میں منتقل کیے اور جانے کو تیار ہو گیا۔ ڈینو غسل خانے سے نکلا تو اس کا حلیہ بھی مجھ سے ملتا جلتا تھا۔

"دس منٹ بعد نکلنا۔" ہاتھ لہرا کر وہ نکل گیا۔

میں اس کی خیریت کی دعا کرتا ہوا مضطرب انداز میں ٹہلنے لگا۔ اللہ ڈینو سے جذباتی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود وہ اس وقت میرا اکیلا دوست، مددگار بلکہ سب کچھ تھا۔ ہمارا مقصد، ہدف اور منزل ایک تھی۔ اس وجہ سے ہمارے دکھ درد اور غم الم بھی سانجھے ہو گئے تھے۔ انجان ہو کر بھی اتنا اپنا پن پاکستان آرمی کے ہر جوان، عہدہ دار اور آفیسر میں پایا جاتا ہے۔ ہر شہید ہونے کی لاش ہمیں اپنی لاش نظر آتی ہے۔ ہر گھائل کے زخم ہمیں اپنے بدن پر دکھائی دیتے ہیں اور ہر مبتلائے درد کی اذیت ہمیں بھی محسوس ہوتی ہے۔

ڈینو کے جانے کے بعد میں نے چند منٹ انتظار کیا اور پھر باہر نکل آیا۔ اندازے سے چلتا ہوا میں ہوٹل کے ہال میں پہنچا۔ اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ دوپہر کے کھانے کا وقت گزر گیا تھا اور رات کے کھانے کا وقت ابھی دور تھا۔ ہم سے ذرا سی غلطی ہو گئی تھی، گھنٹے ڈیڑھ بعد نکلتے تو رش زیادہ ہو جاتا، ایسی صورت میں ہم زیادہ محفوظ رہتے۔ مگر اب قدم بڑھا دیے تھے اور واپس لوٹنا مناسب نہیں تھا۔ یہ احتمال بھی ذہن میں جاگا کہ زیادہ دیر کرنے کی صورت میں کوئی اور افتاد بھی سر پر پڑ سکتی تھی۔

استقبالیہ پر دو تین بندے کھڑے، استقبالین سے کچھ استفسار کر رہے تھے۔ میں دھیمے قدموں سے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت ایک جوڑا بھی دروازے کا رخ کرتا نظر آیا۔ لڑکی نے چست جینز اور اس کے اوپر نصف بازوؤں کی بنیان پہنی تھی۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت، مسکراتا چہرہ اور دلفریب بدن، دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ لڑکی لڑکے کی دوستی تو اب وطنِ عزیز میں بھی معیوب نہیں سمجھی جاتی اور نیک بیبیاں دھڑلے سے اپنے مرد دوستوں کو متعارف کراتی پھرتی ہیں۔ انڈیا تو اس معاملے میں ہم سے کئی قدم آگے ہے۔ بلکہ ہمارا رہبر و رہنما اور استاد ہے کہوں تو بے جانہ ہوگا۔ انھی کی فلمیں دیکھ دیکھ کر پاکستانی قوم میں بھی یہ شعور جاگا کہ نکاح اور شادی کو ثانوی بلکہ قید و بند کا درجہ دے دیا گیا ہے۔

میں نے قدموں کی رفتار غیر محسوس انداز میں سست کی، یوں کہ وہ میرے ساتھ سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لڑکی مرد کے بائیں جانب چل رہی تھی۔ میں قدم دو کا فاصلہ رکھ کر اس کے دائیں چلنے لگا۔ اس لڑکی کی موجودگی میں مشکل تھا کہ کوئی میرا چہرہ دیکھنا گوارا کرتا۔

داخلی دروازے سے نکل کر میں نے دائیں بائیں نگاہیں گھمائیں، البتہ چہرے کو فطری انداز میں سامنے ہی رکھا۔ ایک انسان کی آنکھیں گردن گھمائے بغیر ایک سو اسی ڈگری کا نظارہ کر سکتی ہیں۔ پارکنگ میں اکا دکا افراد گاڑی کھڑی کر کے ہوٹل کے دروازے کا رخ کرتے نظر آئے، چند ایک گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ دو افراد موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں غیر محسوس انداز میں ہر آنے جانے والے پر گڑی تھیں اور وہی مجھے بھی مشکوک

گی۔ ایک شین گن بردار [illegible] والی بڑی مونچھوں والا [illegible] سے اس کی مطابقت تھی۔
میں قدم بڑھاتا ہوا نوجوان جوڑے کے ساتھ یوں چلنے لگا گویا میں ان کا ساتھی ہوں۔ ہم [illegible]
میں ان سے [illegible] قدم پیچھے [illegible] پر ہم تینوں ایک [illegible] سے نکل آئے تھے۔
نگرانی کرنے والوں نے ہمیں نظر بھر کر دیکھا لیکن کوئی [illegible] نہیں کیا تھا۔ [illegible]
تھا۔ [illegible]
ہے۔ [illegible]
رہی تھی۔ نوجوان [illegible] اور [illegible] تھا۔ اور [illegible] نگرانی کرنے والوں نے ہمیں [illegible]
تھی بس ان کی نظر میں [illegible] ساتھی تھا۔ یقیناً [illegible] ساتھی نظر آنے [illegible]
ہم سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے مجھ پر شک کیا [illegible] جا رہا تھا۔
گو معاملہ اس [illegible] ہو جاتا تھا [illegible] ہوتے اور [illegible]
سے اپنے کام میں لگ رہے ہوتے۔ لیکن چند لمحوں بعد میرے [illegible] اپنے [illegible] تھے۔

پارکنگ سے نکل کر پک اپ جونہی سڑک پر چڑھا دائیں جانب سے تیز رفتار میں آتی ہوئی ایک ٹیکسی نمودار ہوئی۔ لڑکے نے ہاتھ لہرایا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی روکی اور دونوں پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا دونوں موٹر سائیکل سوار میری جانب ہی متوجہ تھے۔ اور پک اپ جوڑے سے جانے میں جس سرعت اور مجھ سے لاتعلقی کا مظاہرہ کیا تھا وہ انہیں چونکا گیا تھا۔ میرا ان سے کم [illegible] ان کا ساتھی ہوں اور یہ ایک دم الگ ہو جانا مجھے ہی شک میں ڈال رہا تھا۔

میں سڑک کے دوسری جانب یوں کھڑا ہو گیا جیسے ٹیکسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ بظاہر بے پروا اور غیر متعلق سا لیکن باطن انہی کی طرف متوجہ رہا۔

لمحے بھر مشورے کے بعد ایک شین گن والا ٹہلنے کے انداز میں میری طرف آنے لگا۔ یقیناً اس کا ارادہ مجھے مخاطب کر کے جانچنے کا تھا۔ مزید ٹھہرنا مناسب نہیں تھا لیکن حرکت کرنا ان کے شک کو تقویت دے جاتا۔ میں نے نظر گھمائی اور بائیں جانب سے قریب آتے خالی رکشے کو دیکھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ہاتھ لہرانے پر رکشے کی رفتار کم ہوئی اور وہ میرے سامنے آرکا۔ دشمن سڑک کے قریب آپہنچا تھا۔ رکشے کو رکتے دیکھ کر اپنے ساتھی کو بلانے لگا۔

میں نے سیٹ سنبھالتے ہی رکشے ڈرائیور کو تیز چلنے کا کہا۔ بلاشبہ رکشا موٹر سائیکل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جلد ہی ہمیں آلیتے۔ موٹر سائیکل ایک ایسی سواری ہے جو گلیوں، سڑکوں اور ہر قسم کی جگہوں پر تیز رفتاری سے حرکت کر سکتی ہے۔ میرا دماغ سرعت سے ان حالات سے جان چھڑانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ ایک جاسوس کی زندگی میں ایسے لمحات بہت نازک اور خطرناک ہوتے ہیں۔ ایک غلط فیصلہ دردناک عذاب میں پھنسا سکتا ہے کہ موت بھی زندگی سے بہتر لگنے لگتی ہے۔

''سردار جی! ذرا تیز چلو۔'' میں نے سکھ ڈرائیور کو تاکید کی۔

''جانڑاں کتھے ہے باؤ... '' (کہاں جانا ہے۔) رفتار بڑھاتے ہوئے وہ ہلکا سا مسکرایا۔

''دائیں مڑ جاؤ۔'' اسے ہدایت دیتے ہوئے میں نے عقب میں دیکھا۔ مونچھوں والا اپنے ساتھی کو بٹھا رہا تھا۔ رکشے نے موڑ کاٹا۔

''یہیں روک دو۔'' میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

کی تھی۔

معتوب کے قتل کی افواہ بھی مجھے زیادہ خطرناک ثابت کرنے کو اڑائی جا رہی تھی۔ یہ انڈین ایجنسیوں کا پرانا طریقہ کار ہے۔ یوں کسی بھی چھپنے والے کو زیادہ مشکلات درپیش ہو سکتی ہیں۔ اور دہشت گرد کے ساتھ پاکستان کا نام لگانا ان کی فطرت ہے۔ بغیر کسی تحقیق اور ثبوت کے الزام تراشی کرنا ان کی عادت ہی نہیں مشغلہ ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ان کا کوئی جاسوس اور دہشت گرد پکڑ کر بھی آواز بلند نہیں کر سکتے۔ ہماری خارجہ پالیسی ہمیشہ کمزور، بے دست و پا اور بودی رہی ہے۔ عالمی سطح پر ہم کبھی اپنا مقدمہ صحیح طریقے سے پیش کر سکے اور نہ لڑ سکے ہیں۔

میری وہاں موجودی بہ طور جاسوس تھی نہ دہشت گردی کا ارادہ تھا۔ بلکہ ایک باپ کو بیٹی سے ملانا اور ایسے ناپاک جرم کے خاتمے کو بھی جو پاکستان سے زیادہ انڈیا کے لیے نقصان دہ تھا۔ لیکن حصول مقصد کو نیت کی درستی کافی نہیں ہوتی، طریقہ کار بھی نیت جتنا ہی اہم اور ضروری ہوتا ہے۔ اور سچ کہوں تو میرا طریقہ کار قانون کے دائرے سے بالاتر تھا۔ اس لحاظ سے انڈین ٹی وی کی خبر کو جھٹلانا دیانت داری کے منافی ہوگا۔

میں نے پی کیپ کو سر پر کچھ اور دبا دیا تا کہ چہرہ مزید چھپ جائے۔ پہلے میرا ارادہ اسی ہوٹل میں شب بسری کا تھا، مگر اب احتیاط ضروری ہو گئی تھی۔ جنگلوں اور پہاڑوں کی نسبت شہری آبادی میں رہنا مجھے دشوار لگ رہا تھا۔ کھانے کا بل چکا کر میں باہر نکل آیا۔ وڈیو میں میری داڑھی واضح نظر آ رہی تھی اور حلیہ تبدیل کرنے کا آسان طریقہ یہی تھا کہ میں داڑھی صاف کر دیتا۔ بلاشبہ ایک جاسوس کو اپنے بچاؤ کو اخلاقی اقدار کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ انصاری صاحب کی کہانی میں اجمالاً بیان کر چکا ہوں۔ ان کے علاوہ بھی کئی جاسوسوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ تفصیلی بات چیت ہوئی اور پتا یہ چلا کہ اپنی پہچان چھپانے کو جاسوس کو کئی اخلاقی قدریں پامال کرنا پڑتی ہیں، اصول توڑنا پڑتے ہیں، کردار داغ دار کرنا پڑتا ہے، جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور جواء، شراب نوشی، آبرو باختہ عورتوں سے تعلق رکھنا یہ سب بہ حالت مجبوری روا سمجھا جاتا ہے۔

ایک دکان سے میں قینچی، شیونگ ریزر اور دستی آئینہ خرید لیا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا میری نظریں کسی مناسب گوشے کی تلاش میں بھٹکنے لگیں تا کہ داڑھی صاف کر سکوں، اچانک ڈینو کی گھنٹی آنے لگی۔

گھنٹی وصول کرتے ہوئے میں نے محتاط لہجے میں ''ہیلو'' کہا۔

وہ شوخ لہجے میں بولا۔ '' کیسے ہو مہاراج! پسند کرو تو آج رات دعوت کر سکتا ہوں۔''

''اپنی بھابی کو تو جانتے ہو، یہ نہ ہو میری جان کو آ جائے۔'' میں نے اشارے میں خطرے کا استفسار کیا۔

''دیدی کو سمجھا دوں گا، میری کوئی بات نہیں ٹالتیں۔'' اس نے ''سب اچھا'' رپورٹ دی۔

''تمھارے گھر آنا پڑے گا؟'' میں نے مخصوص انداز میں پتا معلوم کیا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ''گھر پر کہاں عیاشی ہو سکتی ہے۔ اس وقت خصوصی دوست کے ساتھ ہوں، پتا بھیج رہا ہوں پہنچو۔'' خصوصی دوست کا مطلب مجھے یہی سمجھ آیا تھا کہ وہ اس وقت کسی لڑکی کے ساتھ تھا۔

رابطہ منقطع کرنے کے منٹ بھر بعد ہی پیغام موصول ہوا۔ نرائن نگر کالونی کا گلی اور مکان نمبر درج تھا۔ نزد شیو مندر لکھ
ن کو آسان کیا گیا تھا۔

مجھے اپنی جگہ کے بارے کوئی خاص معلومات نہیں تھیں، نہ میں ممبئی کے گلی کوچوں سے واقف تھا۔ اتنے بڑے شہر
ـ ہونے کو کم از کم چند ماہ کی آوارہ گردی ضروری تھی۔ البتہ رکشے، ٹیکسیاں وغیرہ رہنمائی کو موجود تھے۔ ایک خالی
کر میں اسے نرائن نگر اور شیو مندر کے بارے بتانے لگا۔

اس نے کہا: "ڈیڑھ سو روپے لگیں گے بابو۔"

"رام.....رام، اتنے دام۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"دس کم دے دینا۔" اس نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری۔

تھوڑی تکرار کے بعد ایک سو بیس روپے کرایہ طے ہوا اور میں رکشے میں بیٹھ گیا۔ خود کو مشکوک ہونے سے بچانے کو تکرار کرنا ضروری تھا۔

شیو مندر سے پچاس ساٹھ قدم آگے جا کر مطلوبہ گلی میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ میں مندر کے سامنے اتر گیا۔ رکشے والے کو فارغ کر کے میں نے چند لمحے انتظار کیا اور رکشے او جھل ہوتے ہی گلی کی طرف بڑھ گیا۔ ڈینو نے اعتماد سے "سب اچھا" کی رپورٹ دی تھی لیکن میں نے احتیاط کا دامن چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور میری یہ احتیاط کام آ گئی تھی۔

گلی کافی وسیع اور روشن تھی۔ پندرہ نمبر میرا مطلوبہ مکان تھا۔ بہ ظاہر بے پروائی لیکن بہ باطن چوکنے انداز میں گلی میں داخل ہوا۔ پہلے مکان کے دروازے پر پینتیس کا عدد چمکتا ہوا نظر آیا، چند قدم آگے مخالف جانب چونتیس عدد پڑھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ میں گلی کے اختتام سے آغاز کی طرف جا رہا تھا۔ گلی کی رونق اب تک بحال تھی۔ اکا دکا راہگیروں کا آنا جانا لگا تھا۔

تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی روشنی کے کھمبے سے ٹیک لگائے ایک فقیر نظر آیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جانے اس کے جی میں کیا سمائی کہ "بجرنگ بلی" کا نعرہ بلند کر کے مجھے قریب بلانے لگا۔

"بالک! جوگی کی سہائتا کرتے جاؤ۔" (بچے جوگی کی مدد کرتے جاؤ)

اسے نظر انداز کر کے میں نے آگے بڑھنا چاہا، مگر جونہی پاس سے گزرا اس کی تیز سرگوشی ابھری۔ "میری بات سن کر جاؤ۔" یہ کہنے کے ساتھ اس کی بلند آواز ابھری۔ "بالک! جوگی کو نظر انداز کرنے والے کو نرگ میں بھی جگہ نہیں ملتی۔"

اس کے نعرے سے زیادہ سرگوشی نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میں نے بدک کر آگے پیچھے دیکھا، کوئی خطرہ موجود نہ پا کر بھکاری کا مکلم نظر جاننے کو قریب ہوا۔

وہ تیز لہجے میں بولا۔ "بالک! جوگی کو سہارا دے کر اس کے ٹھکانے تک پہنچا دو، بھگوان تمھاری رکھشا کرے گا۔"

میں متذبذب کھڑا رہا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دوں۔

اس نے سرگوشی میں میرا شناختی نام لیتے ہوئے کہا۔ "سندیپ چوپڑا! آگے خطرہ ہے۔"

ایک دم لگا میں پھنس گیا ہوں، کیوں کہ ضروری نہیں کہ مجھے پہچاننے والا دوست ہی ہوتا۔

اس کی بلند آواز میری سوچوں میں مخل ہوئی۔ "بالک! جوگی کو سہارا دے کر اٹھاؤ۔"

ایک بار میرا جی واپس بھاگنے کو کیا لیکن پھر یہ سوچ کہ دشمن کو مجھے للکارنے کی کیا ضرورت تھی وہ مجھے بے دھیانی میں ہی گھیر سکتے تھے۔ یوں سرگوشی کرنے والا دوست ہی ہو سکتا تھا۔ مگر یوں ایک دم کسی دوست کا مل جانا بھی عجیب لگ رہا تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ لمحے کے دسویں حصے میں فیصلہ کرتے ہوئے میں نے بھکاری کو سہارا دینے کو ہاتھ بڑھا دیا۔

دائیں ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام کر اس نے بائیں ہاتھ میں ڈنڈا تھاما اور نقاہت کا اظہار کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے ہاتھ کی گرفت یہ باور کرانے کو کافی تھی کہ کمزوری کا اظہار نرا ڈراما ہی تھا۔

اٹھتے ہی اس نے دایاں بازو میرے کندھے پر رکھا، ساتھ ہی اس کی سرگوشی نما بڑبڑاہٹ ابھری۔

"گوپال چند خطرے میں گھرا ہے۔ اور اس کا چارہ ڈال کر تمھیں یہاں گرفتار کرنے کو بلایا گیا ہے۔" اللہ ڈینو کے

شناختی کاغذات گوپال چند کے نام سے بنے تھے۔
میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''
وہ درشت ہوا۔ ''انصاری صاحب کو تم جیسے گدھے ہی ملے تھے یہاں بھیجنے کو جنھیں یہ بھی معلوم نہیں ایسے طور استفسار نہیں کیا جاتا۔ جب تمھارے شناختی ناموں کا ذکر کر دیا ہے تو مزید تفتیش کرنا ضروری ہے کیا؟''
میں ششدر رہ گیا تھا۔ بہ مشکل ندامت ظاہر کر سکا تھا۔ ''معذرت خواہ ہوں۔'' یقیناً وہ پاکستان کا گمنام ہیرو تھا۔ ہیروز کا ایک روپ نہیں ہوتا۔ موقع کی مناسبت سے ہر روپ دھار لیتے ہیں۔ دنیا کے ہر خطے میں جہاں وطن کو ضرورت پڑتی ہے یہ حاضر ہوتے ہیں۔ اپنے اصل چہرے، نام اور شناخت کو شاید یہ خود بھی بھول جاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر بس وطن کی خدمت اور حفاظت کا فریضہ رہتا ہے۔
وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ ''ریڑھی والا اور دونوں گاہک، دشمن ہیں۔''
مکان نمبر پندرہ کے سامنے ایک شخص آئس کریم کی ریڑھی لگائے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی لکڑی کے بینچ پر دو جوان بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے پرانے شناسا اچانک ملیں اور آئس کریم کھا کر حال احوال بانٹنے لگیں۔ میں نے مذکورہ افراد کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ''سمجھ گیا۔''
''مکان کے دوسری جانب بھی تین آدمی موجود ہیں۔ گلی کے اس سرے پر چائے کا کھوکا بنا ہے اور تینوں گاہک کے روپ میں بیٹھے ہیں۔''
میں نے پوچھا۔ ''کرنا کیا ہے؟''
''انھیں بے ہوش کر کے گوپال کو ساتھ لے جانا ہوگا۔''
''تمام کو؟'' اسے سہارا دے کر میں آگے بڑھتا رہا۔
''ان تینوں کو۔'' آہستہ سے کہتے ہوئے اس نے زوردار نعرہ بلند کیا۔ ''جے بجرنگ بلی، جوگی کو آئس کریم کھلاؤ۔''
میں اسے سہارا دیئے ریڑھی کے قریب پہنچا اور لکڑی کے بیچ کے ساتھ بٹھاتے ہوئے ریڑھی والے کو کہا۔ ''بھائی! جوگی بابا کو آئس کریم کا کپ دینا۔''
''جی مہاراج۔'' شائستگی سے کہتے ہوئے اس نے بکس کھولا۔ اسی اثناء میں جوگی بابا نے بیٹھے بیٹھے جیب سے ... نکال کر باری باری دونوں گاہکوں کے چہرے پر سپرے کر دیا۔ وہ ہڑبڑا گئے تھے، لیکن ان کے سنبھلنے سے پہلے بے ہوشی زود اثر دوا اپنا کام کر گئی تھی۔ اٹھتے ہی دونوں دھڑام سے نیچے گرے تھے۔
ریڑھی والے نے چونکتے ہوئے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے میں حرکت میں آ گیا تھا۔ میرا بھرپور مکا اس کی کنپٹی پر لگا۔ ''اوغ۔'' کی آواز کے ساتھ ہی وہ ڈھیر ہو گیا تھا۔
جوگی نے حفظ ماتقدم کے طور پر اس کے چہرے پر سپرے کرتے ہوئے اس کی بے ہوشی کو گہرا کر دیا تھا۔ میں نے سرعت سے تلاشی لی، اس نے نیفے میں سائیلنسر لگا ''والتھر پی ٹوٹی ٹو'' پستول اڑسا ہوا تھا۔
اس اثناء میں جوگی، گاہکوں کی تلاشی لے کر ان کے لباسوں سے ہتھیار برآمد کر چکا تھا۔ تینوں کے پاس سائلنسر لگے ہوئے پستول موجود تھے۔
''وقت کم ہے، گوپال کو بلاؤ۔'' جوگی نے دونوں پستول اپنے لباس میں چھپا لیے تھے۔
میں نے فوراً ڈینو کا نمبر ڈائل کیا۔ ''کس وقت تک پہنچو گے بھائی اتنی دیر لگا دی۔'' کال وصول کرتے ہی اس نے ... بلا کیا۔

''تم خطرے میں ہو محترم، اس چھپکلی کو بے ہوش کر کے فوراً دروازے پر پہنچو میں منتظر ہوں۔''

''اوہ ٹھیک ہے میں منتظر ہوں۔'' گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں بجھ جانے کا اشارہ دیا۔ اگلے دومنٹ میں وہ دوڑتے ہوئے باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے متردد چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی تھی۔

''اس طرف۔'' جوگی نے واپسی کی راہ کی طرف رہنمائی کی۔ کھلا چوغہ اور لمبے بالوں کی وگ اتار کر اس نے لپیٹے اور بنڈل بغل میں دبالیا۔ نیچے سادہ شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس نے اسٹریٹ لائیٹ کی طرف اشارہ کیا۔''نشانے باز کون ساہے، بتیاں ناکارہ کردو۔''

یقیناً انھیں میرے بارے زیادہ نہیں تو سرسری معلومات ضرور تھیں۔ اس کا مطمح نظر میں نہیں سمجھا تھا لیکن ہدایت پر عمل کر گزرا۔ سائیلنسر لگے پستول نے دودفعہ ''ٹھک ٹھک۔'' کی اور دو بتیاں کرچی ہو کر زمین بوس ہو گئی تھیں۔ گلی میں ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا۔ تیسری اسٹریٹ لائیٹ پستول کی مار سے ذرا دور تھی۔ چند قدم دوڑتے کر میں لمحہ بھر کو رکا ایک اور ''ٹھک۔'' نے گلی کی آخری بتی توڑ دی تھی۔

جوگی سب سے آگے تھا۔ دو افراد موڑ مڑ کر گلی میں داخل ہوئے۔ ان کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عام لوگ تھے۔ ان کے قریب ایک لمحے کو قدم روکتے ہوئے جوگی نے دونوں کے چہرے پر بے ہوشی کا سپرے کر دیا۔ وہ دھڑام سے نیچے گرے تھے۔ جوگی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ گلی کے ماقبل اختتامی (سیکنڈ لاسٹ) مکان کے دروازے کے سامنے رک کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور لوہے کے دروازے پر بندر کی طرح پاؤں رکھتا ہوا مکان کے اندر کود گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ذیلی دروازہ کھول کر ہمیں اندر بلا لیا۔

ہم آگے پیچھے اندر گھسے۔ ذیلی دروازہ اندر سے کنڈی کر کے جوگی اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ وہ درمیانے حجم کا مکان تھا۔ جوگی کی معیت میں چلتے ہوئے ہم سامنے سے گھوم کر پچھواڑے میں پہنچے۔ ایک کھڑکی کو دھکیل کر وہ اچک کر اوپر چڑھا اور اندر گھس گیا۔ ہم نے تقلید کی تھی۔

اس نے کھڑکی کنڈی کر دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک خواب گاہ میں بیٹھے تھے۔ جوگی کا گھر کی بتیاں نہ جلانا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ کسی انجان شخص کا گھر تھا۔ مکین کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر وہ عارضی استعمال میں لا رہا تھا۔ یقیناً مکان پہلے سے اس کی نظر میں تھا تبھی بغیر جھجکے اندر گھسا تھا۔ کھڑکے دو دروازے کے پردے برابر کر کے اس نے موبائل فون کی روشنی جلائی اور میز پر رکھ دیا۔

''گوپال چند تمھاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی تھی۔'' نشست سنبھالتے ہی وہ ڈینو پر برہم ہوا۔

ڈینو کھسیاتے ہوئے بولا۔''پہچان کرا کر بے عزتی کر دیا ر!''

جوگی نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔''خالی لڑائی بھڑائی کی مہارت تمھیں خطرات سے نہیں بچا سکتی۔''

ڈینو نے صفائی دی۔''میں نے اسے بازاری لڑکی سمجھا تھا۔''

میں مخل ہوا۔''مجھے بھی سمجھا دو۔''

ڈینو نے مسمسے لہجے میں تفصیل بتلائی۔''جونھی ہوٹل کے ہال میں پہنچا ایک لڑکی استقبالیہ کے سامنے نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے دعوت آمیز تبسم اچھالا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، سوچا شاید پیشہ ور لڑکی ہے۔ اس کی مدد سے میں ہوٹل سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ پس جوابی مسکراہٹ اچھال کے قریب ہو گیا۔ بے حیا فوراً ہی مان گئی۔ ارادہ تھا ہوٹل سے نکل کر اسے چھڑا لوں گا مگر پھر شب بسری کا لالچ آڑے آ گیا۔ باہر نکلتے ہوئے مجھے نگرانی کرنے والے بھی نظر آئے تھے

بھی تمہیں پیغام بھی بھیجے۔ شردھا سہتا کا مکان مجھے چھپنے کو بہتر لگا اس لیے تمہیں بھی دعوت دے [illegible]
بے چاری کو بے ہوش کر آیا ہوں۔"

جوگی نے انکشاف کیا۔ "اس کا نام سیتا جیسوال ہے۔ را کی خصوصی ایجنٹ ہے۔ [illegible]
آسان ہدف نہیں ہے۔ باقی ہم شروع سے تم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ سلطان دادا نے اپنا کام [illegible]
مگر تمہاری بدقسمتی کہ را کا ایک نمائندہ بھی تمہارے تعاقب میں تھا۔ وہ خود تو سلطان دادا پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا [illegible]
تصدیق کر سکتا تھا۔ اس نے کرن چاولہ تک یہ خبر پہنچا دی۔ راجپوت دادا کا پتا کرن چاولہ ہی نے [illegible]
کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ مگر کرن چاولہ جانتا تھا کہ سلطان دادا تک اس کا نام پہنچ جانے گا اور اس سے [illegible]
چھپانے کی کرے گا، لیکن اس کا مطمح نظر تمہاری موجودگی کی تصدیق کے ساتھ تمہاری پہچان بھی تھی۔ [illegible]
نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ حکومتی کارندے حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ زیرِ زمین لوگوں سے نہ بگاڑیں۔ سلطان دادا [illegible]
اور ہوٹل کی عمارت کے درمیانی ربط سے وہ بھی واقف تھے، تبھی ہوٹل پر زیادہ توجہ دی اور گوپال کو آسانی سے [illegible]
لیا۔ چونکہ ان کا مطمح نظر تم دونوں کی گرفتاری تھا اور سندیپ چوپڑا ان کے ہاتھ نہیں آسکا تھا تبھی انھوں نے [illegible]
دیے رکھی تاکہ گوپال کے ذریعے سندیپ کو پکڑ سکیں۔ ہم بھی ان کے تعاقب میں تھے۔ [illegible]
دوسری جانب ہمارے ایک اور ساتھی نے مورچہ پکڑا ہوا تھا، کیوں کہ ہمیں اندازہ تھا وہ سندیپ کو [illegible]

جوگی کی وضاحت نے ہمارے کافی شکوک دور کر دیے تھے۔ ڈینو منہ بنا کر بولا۔ "اگر سلطان دادا کے [illegible]
لوگ ہی ہمیں وصول کرتے تو زیادہ مناسب رہتا۔"

وہ صاف گوئی سے بولا۔ "اس طرح ہم خود نظر میں آجاتے۔ اور ہماری یہاں موجودگی کا مقصد انصاری صاحب کی
بیٹی کی بازیابی نہیں ہے۔"

میں شاکی ہوا۔ "تو اب مدد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

جوگی اطمینان سے بولا۔ "مجبوراً مخل ہونا پڑا۔ کیوں کہ ایک تو ہمارے بے نیازی برتنے پر تم دونوں کی گرفتاری یقینی
تھی، دوسرا اب ان کی توجہ تم دونوں پر مرکوز تھی اس لیے ہم آسانی سے وار کر گئے۔"

ڈینو ممنونیت سے بولا۔ "بہرحال شکریہ۔"

"تمہارے شکریے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ تم دونوں کی جگہ کوئی بھی پاکستانی ہوتا ہم اسے بچانے کی کوشش
ضرور کرتے۔ باقی انصاری صاحب کے کچھ قرض بقایا ہیں اگر خود ان کا کام نہیں کر سکتے تو اس کے مددگاروں کی تھوڑی بہت
مدد ضرور کر سکتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہاں محفوظ ہیں؟"

اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "دورانِ لڑائی کس کا داؤ چل جائے یہ مقدر کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کام
کوشش کرنا ہے، سو فیصد کامیابی کا حصول کسی اور کے قبضہ قدرت میں ہے۔ البتہ دونوں اپنے موبائل فون بند کروا دیں۔
تمہارے موبائل نمبر ان کے پاس پہنچ گئے ہوں گے۔"

ہم نے موبائل فون بند کر کے کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں پھینک دیے تھے۔

"ڈینو نے اندازہ ظاہر کیا۔ "یقیناً یہ کسی انجان شخص کا مکان ہوگا اور اس کی آمد کسی بھی وقت متوقع ہو سکتی ہے۔"

جوگی نے وضاحت کی۔ "بھاگنے کی کوشش میں پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہاں کب تک چھپیں گے؟"

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے جوگی نے آنکھیں بند کر لیں۔
ڈیتو نے منہ بنایا۔ ''پھر اپنا نام ہی بتادو۔''
''دیپک۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''اور یقیناً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی کہ ایک آدمی کا جاگنا ضروری ہے۔''
ڈیتو نے اٹھنے کا اشارہ کر کے ڈرائنگ روم میں لے آیا، وہاں اندھیرا تھا۔ اس لیے ہم جوگی کا موبائل فون ساتھ
لے آئے تھے۔ بیٹھنے کی جگہ تلاش کر کے میں نے روشنی بجھادی۔
ڈیتو شرمسار ہوا۔ ''سوری یار! میں نے تمھیں بھی پھنسانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔''
میں متبسم ہوا۔ ''انصاری صاحب کو کم از کم دو تین ماہ تک ہمیں جاسوسی کی تربیت دینا چاہیے تھی۔''
ڈیتو کرید ہوئی۔ ''بھائی کا اصل نام دیپک تو نہیں ہوگا۔''
میں نے سمجھایا۔ ''اس نے ہمارے اصل نام جاننے کی کوشش نہیں کی تو اپنا نام کیوں کر بتائے گا۔''
وہ چپ نہیں پاؤ۔ ''اس نے گہرا سانس لیا۔ ''یار! مجھے تو شردھا یاد آرہی ہے۔''
میں نے یاد دلایا۔ ''اس کا نام سنیتا ہے۔''
وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔ ''نام بھاڑ میں ڈالو، صورت اتنی موہنی ہے کہ مستقل انڈیا میں رہائش کا سوچنے لگا
تھا۔ سانولی ہے لیکن حواس پر چھانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔''
میں ہنسا۔ ''اتنی ہی پیاری ہوتی تو بے ہوش کر کے نہ آتے۔''
''مجبوری تھی یار! ورنہ ارادہ یہی تھا کہ پرما انصاری کے بجائے پہلے شردھا کو اغواء کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔''
میں نے ٹوکا۔ ''تم مسلسل اس کا غلط نام لیے جا رہے ہو۔''
وہ شوخی سے بولا۔ ''کیا کروں، اس نام میں نغمگی زیادہ ہے۔ اور جب تمھیں پتا چل جاتا ہے کہ شردھا کہنے سے
میری مراد سنیتا ہی ہے تو کبھی ٹوکنے سے باز آجاؤ۔''
''فضول بحث کو چھوڑ دو اور آگے کا سوچو۔'' میں نے موضوع تبدیل کیا۔
وہ اطمینان سے بولا۔ ''سوچنے کو دیپک صاحب تشریف لے آئے ہیں۔''
میں نے واویلا کیا۔ ''یقین مانو مجھے تو معاملے کا سر پیر نظر نہیں آرہا۔ ڈور ایسی الجھی ہوئی ہے کہ کوئی سرا دکھائی نہیں
دے رہا۔''
''ایک مشورہ مانو گے۔''
میں صاف گوئی سے بولا۔ ''تمھاری حالیہ بے راہروی متقاضی ہے کہ مشورہ سنے بغیر میں اثبات میں سر نہ ہلاؤں۔''
وہ عاشقانہ لہجے میں بولا۔ ''بے راہروی سے مراد شردھا سہنا ہے تو یہ الزام سر آنکھوں پر۔''
میں چڑ کر بولا۔ ''مشورہ پھوٹو۔''
''آرام سے سوجاؤ، دیپک بھائی سے مل بیٹھ کر کوئی حل سوچیں گے۔''
''تمھاری عادتیں کیسی بھی ہوں مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں دیا۔'' طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں موبائل روشن کر
کے خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔
''تمھارے طعنے اس دل سے شردھا سہنا کی محبت کم نہیں کر سکتے۔'' میری تقلید میں اس نے بھی خواب گاہ کا رخ کیا
دیپک ڈبل بیڈ پر پھیل کر لیٹا تھا۔ مجھے بھی ایک کونے میں جگہ مل گئی تھی۔ موبائل فون میز پر رکھ کر میں لیٹ گیا۔

عموماً سول دوستوں سے سنا ہے کہ انھیں نئی جگہ پر نیند نہیں آتی۔ لیکن ایک فوجی بے چارہ اتنے علاقے گھوم چکا ہوتا ہے کہ کوئی جگہ اسے نئی معلوم نہیں ہوتی۔ ایک سنائپر تو اس معاملے اور بھی سخت جان ہوتا ہے۔ پتھریلی چٹانوں، اونچے درختوں، برفیلی وادیوں اور گرم ریگزاروں میں موسم کی شدت کی پروا کیے بغیر سوجانا ایک سنائپر ہی کا خاصا ہوتا ہے۔ جب خطرات برساتی بادلوں کی طرح سر پر منڈلا رہے ہوں۔ موت کے قدموں کی چاپ اونچی ایڑی کے سینڈل کی ٹک ٹک کی طرف سنائی دے رہی ہو۔ مقصد پورا کرنے کا جنون ولگن دل و دماغ پر حاوی ہوا ایسے میں سوجانا کمال کہلاتا ہے۔ اور ایسے کمال پاکستانی سنائپرز سے سرزد ہوتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے طارق بن زیادؒ کا قول مصرع میں نقل فرمایا کہ......

ع ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست

اور بلاشبہ پاکستانی سنائپرز پر بھی یہ مصرع مکمل طور پر منطبق ہوتا ہے۔ وہ تو آرام دہ بستر تھا۔ گو خطرہ موجود تھا لیکن بدن کو راحت میسر تھی۔ جو جسمانی اور ذہنی اذیت میں سونے کے عادی ہوں انھیں صرف ایک دشواری جاگنے پر مجبور نہیں رکھ سکتی۔ میں بھی لمحوں ہی میں گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔

میری آنکھ ڈینو کے جگانے پر کھلی تھی۔

''شش.... خطرہ ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں سرگوشی کی تھی۔ سنائپر کا دماغ عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔ جاگنے ساتھ اسے ماحول کا ادراک ہوجاتا ہے۔ اور ایسا مسلسل مشقوں سے ہوتا ہے کہ آنکھ کھلتے ہی انسان حواس باختہ نہ ہو جائے۔ میں نے فوراً ڈینو سے موبائل لے کر بجھا دیا تھا۔ دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی۔ میرا خیال مالک مکان کی طرف پلٹا مگر دبے قدموں کی چاپ اور ہلکی سرگوشیاں میرے اندازے کو جھٹلا رہی تھیں۔

اچانک ہی کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا، کسی نے ''مین سوئچ آن'' کیا تھا۔ یقیناً گھر والوں نے جاتے وقت ہر کمرے کی روشنی بجھانے کے بجائے صرف ''مین سوئچ'' سے بجلی منقطع کی تھی جو بٹن کے دبتے ہی بحال ہوگئی تھی۔

روشنی ہوتے ہی دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولا گیا۔ چست لباس پہنے ہوئے دو افراد ہتھیار تانے دندناتے ہوئے اندر گھسے۔ انھوں نے انساس رائفلیں پکڑی ہوئی تھیں۔ (5.56 ایم ایم انساس رائفل (انڈین نیشنل سمال آرمز سسٹم) ایک بھی رائفل ہے۔ اس کا رسیور اور پسٹل گرپ کلاشن کوف جیسا ہے۔ میگزین شفاف پلاسٹک کی بنی ہے اور اس میں 2 گولیاں آتی ہیں۔ خودکار ہتھیاروں کو جب چھٹے (برسٹ) پر لگایا جائے تو فائرر کی انگلی کے دباؤ سے گولیوں کی بوچھاڑ تی ہے۔ یعنی جتنی دیر ٹریگر دبا کر رکھا جائے گا اتنا لمبا چھٹا فائر ہوگا۔ اور یوں عموماً اچھے فائرر بھی لمبے چھٹے فائر کر بیٹھتے ہیں لہ گولیوں کے ضیاع کے ساتھ ہدف کو بھی فائرر کی مرضی کے خلاف زیادہ نقصان پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن انساس کی ایک وصیت یہ بھی ہے کہ سلیکٹیو میکانزم کے ذریعے سنگل شاٹ اور تین راؤنڈ کے چھٹے فائر کیے جاسکتے ہیں)

''ہاتھ اوپر۔'' کرخت لہجے میں پکارا گیا۔

مگر ڈینو اسپرنگ کی طرح اچھلا، اس کی بھرپور ٹھوکر، دائیں والے کی چھاتی میں لگی۔ وہ دروازے سے باہر جا۔ دوسرے نے رائفل ڈینو کی طرف گھمائی، لیکن اس سے پہلے میں لبلبی (ٹریگر) دبا چکا تھا۔ وہ وقت خطرہ مول لینے کا تھا کہ میں اسے زخمی کرنے کا سوچتا۔ تبھی ''دالتھرپی ٹوٹی ٹو'' کی گولی اس کے کان سے ایک انچ اوپر کھوپڑی میں۔ وہ مری ہوئی چھپکلی کی طرح نیچے گرا تھا۔

ڈینو فرش پر لوٹ لگاتے ہوئے دروازے سے گزرا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دشمن پر جا پڑا۔ سر کی بھرپور ٹکر بس رسید کرتے ہوئے ڈینو نے اس کے ہتھیار پر ہاتھ ڈالا۔ وہ کولہوں کے بل نیچے گرا تھا۔ لیکن ڈینو سے ایک غلطی ہو

کی تھی وہ تیزی میں درستی بھول گیا تھا۔ حملہ کرنے والے صرف دو نہیں تھے۔ کمانڈوز عموماً گروپ پر دھاوا بولتے وقت
بھاری تعداد میں حملہ کرتے ہیں۔ ایک کمانڈو کو یہ اصول بھولنا نہیں چاہیے تھا۔ اور میدان جنگ میں ذراسی غلطی، کشمکش کا
موقع چھین لیا کرتی ہے۔
ڈینو، انسان پہنچتے ہی پیٹھ کے بل فرش پر گرا اور دیوار کے ساتھ کھڑے دشمن پر فائر کھول دیا۔ اس کا صاف مطلب
بھی تھا کہ اسے بنیادی اصول نہیں بھولا تھا۔ بس جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے دو
افراد میں سے ایک تو اس کی گولیوں کا نشانہ بن گیا البتہ دوسرے نے لبلبی دبا کر ڈینو کی چھاتی میں سوراخ کھول دیا تھا۔
اس حالت میں بھی ڈینو کی حرکت نہیں رکی تھی، اس کی رائفل نے دوسرا چھنا اگلا اور اسے مارنے والا بھی چیختا ہوا نیچے
گر گیا تھا۔
میں بجلی کی سی سرعت سے ڈینو کی طرف بھاگا۔ اس دوران ڈینو کی ٹکر کھا کر گرتے ہوئے دشمن نے اٹھ کر ڈینو کو ٹھوکر
رسید کرنے کی کوشش کی، مگر سائلنسر لگا ''والتھر پی ٹونٹی ٹو'' دوسری گولی اگل چکا تھا۔ بھاگتے ہوئے بھی میں دشمن کے ماتھے
کو کامیابی سے داغ چکا تھا۔
اس سے پہلے کہ میں باہر نکلتا، دو افراد ڈرائینگ روم کے دروازے سے اندر آئے۔ دونوں نے ہتھیار پہلے سے
تانے ہوئے تھے۔ میں فوراً منہ کے بل گرا۔ ان کے ہتھیار ایک ساتھ گرجے گولیاں میرے اوپر سے گزری تھیں۔ بلاشبہ
میں بال بال بچا تھا، لیکن دشمن کی گولیاں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ میرے کانوں میں ڈیپک کی زوردار کراہ پہنچی، یقیناً وہ بھی
میری تقلید میں باہر نکل رہا تھا۔
میں نے لیٹے لیٹے پستول سیدھا کیا، دونوں دشمن اگلا چھنا فائر کرنے کی حسرت لیے منہ کے بل گر گئے تھے۔
ڈینو کی حالت دیکھ کر مجھے نہیں لگتا تھا کہ اسے مدد کی ضرورت تھی۔ یقیناً اس کے سانس پورے ہو چکے تھے۔ وطن کی
حفاظت کی قسم کھانے والے کے نصیب میں وطن کی مٹی بھی نہیں لکھی تھی۔
میں پیچھے مڑا، میرے دوسرے ساتھی نے بھی ڈینو کی تقلید کرنا پسند کیا تھا، دو چھنے چہرے سے ٹکرا کر اسے ناقابل
شناخت بنا چکے تھے۔ ایک ساتھ چھ گولیوں نے بے چارے کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ میں ایک لمحے کو ساکن ہوا،
موجودصورت حال سے نکلنے کو دماغ کے گھوڑے دوڑائے، یقیناً جان بچانے کو ہتھیار ڈالنا ضروری ہو گیا تھا۔ انڈین
کمانڈوز نے مکان کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ اور ایک پستول کے سہارے میں تربیت یافتہ کمانڈوز کا گھیرا توڑ کر
بھاگ نہیں سکتا تھا۔
کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے اچانک دھماکا ہوا، میں نے فوراً خود کو نیچے گرایا، مگر اس سے پہلے ہی میری دائیں ران
میں گرم سیسہ گھس کے دوسرے جانب نکل گیا تھا۔ گولی لگتے وقت درد یا تکلیف کا احساس بالکل بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کے
بعد ہر گزرتے لمحے زخم پھوڑے کی شکل اختیار کرتا جاتا ہے۔
فائر کرنے والے کا احسان تھا کہ اس نے کھوپڑی، گردن اور پیٹھ کے بجائے ران میں گولی ماری تھی۔ شاید اس کا
ارادہ مجھے زندہ پکڑنے کا تھا۔ اور اللہ پاک کی منشا کے مطابق میرے چند سانس بقایا تھے، ورنہ میرا حشر اللہ ڈینو اور ڈیپک
سے مختلف نہ ہوتا۔
نیچے گرتے ہی میں فوراً سیدھا ہوا دشمن نے چوکنے انداز میں رائفل تانی ہوئی تھی۔ میرے سیدھا ہوتے ہی اس نے
رائفل ہلا کر مجھے دھمکانے کی کوشش کی، مگر اس کے ہونٹوں سے دھمکی نکلنے سے پہلے میرا پستول گولی اگل چکا تھا۔ میرا اسے
زندہ پکڑنے کا ارادہ نہیں تھا کہ کھوپڑی کو نشانہ نہ بناتا۔ اور سنائپر اتنے قریب سے نشانہ خطا نہیں کرتا۔

گولی ماتھے میں لگی تھی۔ اس کے نیچے گرتے ہی میں لمحے کے بیسویں حصے میں ایک فیصلے پر پہنچا۔ "والتھر پی ٹو تھری ٹو" کا دستہ میں نے دیپک کے دائیں ہاتھ میں پکڑا دیا، بیڈ پر اس کی گدڑی اور لمبے بالوں والی وگ پڑی تھی۔ گدڑی کا کپڑا پھاڑ کر میں نے سرعت سے پھوڑا اپنی ران پر کس کر لپیٹا تاکہ خون کا اخراج رک سکے۔ ابتدائی طبی امداد کا پہلا اصول خون کے بہاؤ کو روکنا ہوتا ہے۔ اکثر زخمی صرف خون ضائع ہونے سے ہلاک ہو جاتے ہیں ورنہ ان کے زخم بذات خود جان لیوا نہیں ہوتے۔ دیپک کے بالوں کی وگ اور گدڑی بیڈ کے نیچے پھینک کر خود بھی بیڈ کے نیچے کھسک گیا۔ مکان کے باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں اور احتیاط سے اندر گھسنے کی ہدایات گونج رہی تھیں۔ مرنے والوں کے کانوں میں وائرلیس سیٹ کے ہینڈ فری لگے ہوئے تھے اس لیے وائرلیس کی بلند آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ اور اپنے ساتھیوں کی خاموشی کی وجہ سے وہ اندر گھسنے میں احتیاط برت رہے تھے۔ ان کا محتاط پن ہی مجھے چند لمحوں کی مہلت دے گیا تھا اور میں بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ گو یہ جوا ہی تھا مگر اس وقت جوا کھیلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ ڈینو جلد بازی اور جوش میں حالات کو اس نہج تک لے آیا تھا ورنہ میں گرفتاری دینے پر تیار ہو جاتا۔

میرے اندازے کے مطابق ان کی نظر میں ہم صرف دو تھے۔ اور دو لاشیں ملنے کے بعد انھیں تیسرے کی تلاش کی ضرورت باقی نہیں ہونا چاہیے تھی۔ خوش قسمتی سے جن افراد نے کمرے میں تین افراد کو دیکھا تھا وہ تمام ہلاک ہو چکے تھے۔ باہر والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اندر دشمنوں کی تعداد کتنی ہے۔ جو ہمارے صورت آشنا تھے انھیں بھی دیپک کو دیکھ کر کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ اس کا چہرہ ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے کو پہچاننے اور اس پر واری قربان ہونے والی نگاہیں کہیں دور پاکستان میں تھیں۔ وہاں تو بس نفرت، حقارت اور ناپسندیدگی سے دیکھنے والی آنکھیں تھیں جن کی نظر میں اس کا وجود دھرتی کا بوجھ تھا۔ یقیناً نفرت و محبت کا تعلق پہچان دو واسطے سے ہے، صورت و کردار کے تعین سے نہیں۔

کمانڈوز کے طریقہ کار میں ہمیشہ ایسے کمرے کی تلاشی لینے کو جس میں دشمن کی موجودی یقینی ہو دستی بم (ہینڈ گرنیڈ) اندر پھینک کر رائفل کی چند گولیاں فائر کرتے ہیں تاکہ کوئی دستی بم کو اٹھا کر واپس نہ پھینک سکے۔ (پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ دستی بم پن نکلنے کے تین سے چار سیکنڈ بعد پھٹتا ہے) لیکن ایسا تب کیا جاتا ہے جب دشمن کے چوکنا ہونے کا یقین ہو۔ ہمیں انھوں نے بے خبری میں چھاپنے کی کوشش کی تھی جو کامیاب نہیں ہو پائی تھی۔ اور اب وہ دستی بم پھینکنے کی حالت میں نہیں تھے کہ خود ان کے ساتھی اندر موجود تھے۔ گو ساتھیوں کی طرف سے خاموشی چھا جانا، ساتھیوں کے ضائع ہونے کو ظاہر کرتا ہے، مگر ان کے بے ہوش ہونے کا امکان بھی نظر انداز نہیں کیا سکتا تھا۔ اور وہ اسی امید پر دستی بم نہیں پھینک رہے تھے۔

''تم چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے ہو۔ جان بچانا ہے تو ہتھیار پھینک دو۔''

اوندھے منہ لیٹ کر میں نے سر قالین پر ٹیکا ہوا تھا۔ بھورے رنگ کے قالین پر خون کی سرخی واضح نظر آ رہی تھی۔ لیکن اندازہ تھا کہ میرے خون کو بھی دیپک کا خون سمجھا جا سکتا تھا۔

دشمن نے زیادہ دیر انتظار نہیں کیا تھا۔ ڈرائینگ روم کا دروازہ خواب گاہ کے دروازے سے ذرا ترچھا تھا۔ تبھی دشمن کا داخلہ میری نظر سے اوجھل رہا۔ چند لمحوں بعد دو پاؤں میری نظروں کے سامنے طلوع ہوئے اور ایک دم کمرے کے دروازے سے گزر کر دروازے کے دائیں جانب چھپ گئے۔ دروازے کی بائیں جانب بھی کسی نہ کسی کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ پھر بعد وہ دھاڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔۔۔۔۔

''خبردار۔۔۔۔۔ ہاتھ اوپر۔۔۔۔۔ حرکت نہیں۔'' جیسے فقرے باآواز بلند کہتے ہوئے انھوں نے متوقع دشمن پر رعب

لا، مگر اندر انھیں اپنے ساتھی اور دیپک کی لاش کے علاوہ انھیں کچھ نہیں ملا تھا۔ دو آدمی سرعت سے غسل خانے کے دروازے تک گئے، مگر ناکام لوٹنے تھے۔

''کلیئر کلیئر کلیئر'' وقفے وقفے سے تین مختلف آوازوں نے سب اچھا پیش کیا۔ میں دم سادھے لیٹا رہا۔ دو بوٹ میرے چہرے سے دو تین فٹ کی دوری پر آ کر رکے۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی، مگر خیریت گزری اور اس نے نیچے جھانکنے سے گریز کیا تھا۔

ان کا سرغنہ وائرلیس سیٹ پر ''سب اچھا'' دے رہا تھا۔ ''دو گھس بیٹھیے ہلاک کر دیئے ہیں۔ اپنے سات ساتھی شہید ہوئے ہیں۔'' مسلمانوں کی نقل میں اب غیر مسلم اقوام بھی وطن کی خاطر لڑ کر مرنے والوں کو شہید کہنے لگے ہیں۔

ایک اور آواز ابھری۔ ''کچرا دان (ڈسٹ بن) میں دو موبائل پڑے ہیں۔''

سینئر نے انھیں خبردار کیا۔ ''کرن چاولہ صاحب یہیں آ رہے ہیں، ان کی آمد تک لاشوں سے چھیڑ خانی نہیں ہوگی۔''

ایک آدمی رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''مارے گئے، وہ تو بہت بے عزت کریں گے۔''

وہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے ڈرائینگ روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔

کرن چاولہ کا نام میں نے سلطان دادا کے آدمی اور پھر دیپک سے بھی سنا تھا۔ یقیناً را کا خصوصی کارندہ تھا۔ جبھی تو کمانڈوز بھی اس کے نام سے گھبرا رہے تھے۔

ڈرائینگ روم سے ان کی گفتگو کی آواز گونجتی رہی۔ دیپک اور ڈینو کو کوستے ہوئے وہ اپنے مرنے والے ساتھیوں پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ کرن چاولہ کے سوالوں کے جواب تیار کر رہے تھے کہ کس طرح دو دہشت گرد ان کے ساتھ کمانڈوز کا کام تمام کر گئے تھے۔

میری ران میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ گولی نے ہڈی نہیں توڑی تھی۔ اور ران کے کنارے کے گوشت کو چھیدتی ہوئی باہر بھی نکل گئی تھی۔ پٹی کو چھونے پر مجھے ہلکی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ خون ہلکا ہلکا رس رہا تھا۔ میں عجیب حالات میں پھنس گیا تھا۔ اللہ ڈینو کی جدائی کو دماغ اب تک ہضم نہیں کر پایا تھا۔ اس کے ساتھ رشتہ نیا سہی مگر وہ ایک مخلص اور کارآمد ساتھی تھا۔ دلیر، نڈر اور پہل کرنے والا۔ دیپک انجان سہی مگر سچا خیر خواہ تھا۔ یقیناً اس کی وجہ سے ہمیں کافی سہولتیں میسر ہوتیں، لیکن شومیٔ قسمت کہ تعلقات کے آغاز کے ساتھ وچھوڑے کی صدا گونج اٹھی تھی۔

ان کی گفتگو سے بے نیاز میں آگے کا سوچنے لگا۔ پہلا مرحلہ تو جان بچانے کا تھا۔ نامعلوم کرن چاولہ کی آمد کیا گل کھلانے والی تھی۔ ممکن تھا وہ بیڈ کے نیچے جھانکنے پر مصر ہوتا۔ اور ایسا ہونے کی صورت میری گرفتاری یقینی تھی۔ اس کے بعد کیا ہونا تھا یہ سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

سنا ہے جتنا بھی سخت جان ہو ایک حد تک تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔ اور انڈین عقوبت خانے میں پھنسنا کسی بھی پاکستان جاسوس کی اخیر درجے کی بدقسمتی کہلاتی ہے۔ انڈین ایجنسیوں کے پاس تشدد کے وہ طریقے اور حربے ہیں کہ قدم زمانے کا غیر انسانی تشدد بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔

مگر کہتے ہیں پانی میں گھسنے والے کو گیلا ہونے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ میں نے بھی انصاری صاحب کو ہامی بھرتے قت بدترین حالات کو مدنظر رکھا تھا۔ دشمن ملک میں گھسنے والا ہر جاسوس اس دن کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتا ہے۔

اچانک ڈرائنگ روم میں ہلچل مچی۔ میں اس طرف متوجہ ہوا۔ معلوم ہوا کرن چاولہ پہنچ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مبیر آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ بولنے والا پُراعتماد و پُررعب لگ رہا تھا۔ اپنے ساتھ آدمیوں کی لاشیں دیکھ کر اس اظہار برہمی کیا تھا لیکن اس کی درشتی میں حوصلہ و متانت چھپی تھی۔ وہ سرغنہ کے منصوبے میں پیشہ ورانہ غلطیاں اور کمیاں

اجاگر کرنے لگا۔

"محاصرے میں آئے دو دہشت گردوں سے اپنے سات کمانڈوز مروا کر انھیں ہلاک کر دینا نالائقی، کمزوری اور درجے کی حماقت ہے۔ اگر لڑنے کی صلاحیت نہیں تھی تو دستی بم استعمال کرتے، آنسو گیس کام میں لاتے۔ راکٹ لانچرز حملہ کرتے، مگر اپنے آدمیوں کی بلی نہ دیتے۔ سات آدمی مروا کر تو کوئی اناڑی بھی دو آدمیوں کو قتل کر سکتے تھے۔ تم کمانڈو ہو۔ اگر دشمن کو زندہ پکڑا ہوتا پھر بھی کوئی بہانہ تو موجود ہوتا کہ انھیں زندہ پکڑتے ہوئے اپنے آدمی قتل ہوئے ہیں۔" اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا تبھی حملہ آوروں کے سرغنہ نے صفائی دینے کو منہ کھولا۔

"سر! ہم انھیں غافل سمجھنے کی غلطی کر بیٹھے۔ مگر وہ جوابی کارروائی کو مکمل تیار تھے۔"

"لچر بہانے بازی سے پرہیز کرو سوراج!.... کیا بھارتی کمانڈوز صرف سوئے ہوئے دشمنوں ہی پر کاری وار کر سکتے ہیں۔" کرن چاولہ برہم ہوا۔ "اگر وہ ہوشیار تھے تو تم بھی غنودگی میں نہیں تھے۔"

سوراج نے ندامت ظاہر کی۔ "سوری سر۔"

کرن چاولہ نے درشتی سے کہا۔ "من کرتا ہے تمھارے بچ جانے والے ساتھیوں کو بھی مرنے والوں کے پاس بھجا دوں۔"

سوراج کے پاس جواب ختم ہو گئے تھے۔ کسی اور کی بھی آواز نہیں ابھری تھی۔ کرن چاولہ کا عہدہ مجھے معلوم نہیں تھا، مگر انداز سے آفیسر لگ رہا تھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کرن چاولہ کی آواز ابھری، لہجہ بدلا ہوا تھا۔ یقیناً اس نے غصے پر قابو پالیا تھا۔ "یہ چار لاشیں دیکھو، ہر ایک کے سر میں گولی ماری گئی ہے۔ اسے کہتے ہیں پیشہ ورانہ مہارت۔" وہ لاشیں دیکھتا ہوا اندر گھسا۔ "اس کے بھی سر میں گولی لگی ہے۔ اور یہ اس کا کام ہے۔" وہ دیپک کی لاش کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ "اس نے تمھارے کمانڈوز پر خالی ہاتھ حملہ کیا۔" کرن چاولہ نے ڈینو کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "اور اس نے تیز رفتاری اور درستی سے فائر کرتے ہوئے اپنے ساتھی کی مدد کی۔ مگر سمجھ میں نہیں آ رہا اسے کیسے گولیاں لگیں....؟" کرن چاولہ نے عمدہ تجزیہ کرتے ہوئے الجھن ظاہر کی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم بڑھ گئی تھی۔ کرن چاولہ نہایت منجھا ہوا اور شاطر دشمن لگ رہا تھا۔ بعید نہیں تھا کہ وہ تیسرے دشمن کی موجودگی کا اندازہ کر لیتا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھارتے غیبی مدد آ پہنچی ایک بے وقوف بولا۔ "سر! اسے میں نے ہلاک کیا ہے، میں سنتوش کے عقب میں تھا، جونھی اسے گولی لگی میں نے فائر کھول دیا۔ دشمن کے نیچے گرتے ہی احتیاطاً ... گیا کہ مجھے اور دشمن کی موجودگی کا خدشہ تھا۔" اس نے شاید کرن چاولہ سے شاباش چاہنے کی غرض سے جھوٹ بولا

کرن چاولہ معترض ہوا۔ "اس کے چہرے پر دو چھٹے لگے ہیں۔ اور ایک رائفل سے چلائے ہوئے دو چھٹے ایک شخص ... لگ سکتے ہیں؟ اصولاً اسے پہلے چھٹے کے ساتھ گر جانا چاہیے تھا۔"

... آواز ابھری۔ "میں بھی موہن کے ساتھ تھا، ہم نے اکٹھے فائر کیا تھا۔"

... کمروں کی مکمل تلاشی لے لی تھی۔" کرن چاولہ کے بوٹ بیڈ کے نزدیک آ کر رکے۔

... راج پر جوش لہجے میں بولا۔ "جی سر! باریک بینی سے دیکھ چکے ہیں۔ کوڑا کرکٹ کی ٹوکری سے دو موبائل نے ... جیب سے بھی دو پستول برآمد ہوئے ہیں۔" یقیناً اس نے دیپک کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "اور کوئی قابل ذکر چیز ... ل خانے اور ڈریسنگ روم کی تلاشی لے لی تھی۔"

"تینوں پستول ہمارے آدمیوں سے چھینے ہوئے ہیں۔" کرن چاولہ پستولوں کو پہچان گیا تھا۔

"بالکل سر۔" سوراج نے پرزور انداز میں تائید کی تھی۔

"لاشیں پوسٹ مارٹم کو بھجوا دو اور کرنل صاحب کے لیے تحریری رپورٹ تیار کر دو۔" اختتامی ہدایات دیتے ہوئے کرن چاولہ کے قدم واپسی کو مڑ گئے۔

سوراج نے ایڑیاں بجا کر۔ "جے ہند۔" کہا۔ اور کرن چاولہ کے غائب ہوتے ہی وہ موہن اور اس کے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم دونوں نے غلط بیانی کیوں کی؟"

موہن نے کہا۔ "سوچا شاید چاولہ صاحب کی شاباش سننے کو مل جائے، مگر حسرت ہی رہی۔ کسی کو سراہنے میں موصوف اتنے ہی کنجوس ہیں جتنے پردھان منتری فوجیوں کی تنخواہ بڑھانے میں۔"

سوراج نے مطعون کیا۔ "تم جانتے نہیں چاولہ صاحب کتنے باریک بین اور ہوشیار ہیں، اگر جھوٹ پکڑ لیتے تو کتوں والی ہو جانا تھی۔"

موہن بے نیازی سے بولا۔ "وہ تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔"

"بہرحال آئندہ خیال رکھنا، فضول کی چالاکیاں مجھے پسند نہیں ہیں۔" سوراج نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور اب اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھاؤ۔"

تمام انتظامی امور میں لگ گئے۔ گھنٹے بھر میں تمام لاشیں لے گئے تھے۔ اس دوران میں دم سادھے لیٹا رہا۔ زخم میں درد جیسے رچ بس گیا تھا۔ مجھے مناسب طبی امداد کی سخت ضرورت تھی، لیکن یہ عیاشی فی الوقت میری قسمت میں نہیں تھی۔ بلکہ اس وقت تو مجھے کراہنے اور درد کے اظہار کی سہولت بھی میسر نہیں تھی۔ میں دانت بھینچے بے تحاشا تکلیف کو برداشت کرنے کی سعی کرتا رہا۔

کمرہ دشمنوں کے وجود سے خالی ہونے کے بعد میں نے موبائل پر وقت دیکھا، صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ نجانے وہ کسی کو نگرانی پر مامور کر گئے تھے یا نہیں اس کی تصدیق کرنا آسان نہیں تھا۔ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ میں تیز رفتاری سے حرکت نہیں کر سکتا تھا اور ایسی حالت میں محفوظ کمین گاہ سے نکلنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ جب تک مجھے خطرہ ٹلنے کا یقین نہ ہو جاتا خواب گاہ سے نکلنا بے وقوفی ہوتی۔ درد میرے لیے نیا تھا، نہ تکلیف انجانی تھی اور نہ بھوک پیاس یا بے آرامی اچھوتی تھی۔ میں بیڈ کے نیچے دبکا رہا۔

کمرے کی روشنی وہ جلتی چھوڑ گئے تھے۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد سورج کی روشنی بھی محسوس ہونے لگی۔ گولی میری دائیں ران میں لگی تھی، مگر درد پوری ٹانگ میں محسوس ہو رہا تھا۔ گدڑی سر کے نیچے رکھ کر میں چت لیٹ گیا اور گہرے سانس لیتے ہوئے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بیت الخلاء میں جانے کی حاجت بھی ہو رہی تھی۔ لیکن احتیاط، تقاضے کی راہ میں رکاوٹ بنی رہی۔ دوپہر تک فطری تقاضا برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ میں بیڈ کے نیچے ہی حاجت پوری کر لیتا مگر انسانی فضلے کی بدبو کسی بھی اندر آنے والے کو فوراً متوجہ کر دیتی۔ مجبوراً مجھے بیڈ کے نیچے سے نکلنے کا خطرہ مول لینا پڑا۔

میں کھسک کر باہر نکلا، اٹھنے کی کوشش پر منہ سے چیخ نکلتے رہ گئی تھی۔ بے ساختہ کراہ تو زبردستی ہونٹوں سے پھسل گئی تھی۔ زخم میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ چند لمحے میں ٹانگ لمبی کیے بیٹھا رہا اور پھر بائیں ٹانگ پر زور دے کر کھڑا ہو گیا۔ چلنے کو سہارے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ دائیں ٹانگ پر بالکل زور نہیں دے پا رہا تھا۔ جب ایک انچ بھی کھسکنے میں ناکامی ہوئی تو دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر میں جھکے جھکے کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

انسان بھی کتنا بے بس، کمزور اور ضعیف ہے۔ ذرا سی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ اور دعوے اتنے بلند بانگ کہ آسمان کو چھو لے، اکڑ جیسے پہاڑ اکھیڑ پھینکے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طاقت و قوت کا مالک تو بس ایک ہی ہے۔ جو ہاتھی کو چیونٹی سے زیادہ بے بس کر دے، شیر کو کیچوا بنا دے، صحت مند کو اپاہج و معذور کر دے، شہ زور کو کمزور کر دے، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یقیناً ساری بڑائیاں، بلندیاں، عزتیں، طاقتیں اسی ذات کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

کھڑکی کے پاس پہنچ کر میں دیوار کے سہارے اٹھا، پردے لوہے کے پائپ میں پردئے گئے تھے۔ پردے کو کھینچ کر میں نے پائپ کو پردے سے باہر نکال لیا۔ جیب سے چھوٹا چاقو نکال کر میں نے پردے سے ایک چوڑی پٹی کاٹی۔ حرکت کرنے سے زخم سے خون رسنے لگا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ پورے کمرے میں خون کے قطرے بکھر جائیں۔ پٹی ران پر لپیٹی، پردے کو تہہ دے کر میں نے کھڑکی کے کنارے ہی پر رکھا اور لوہے کے پائپ کے سہارے بیت الخلاء کی طرف بڑھ گیا۔ خواب گاہ کا ملحقہ غسل خانہ (اٹیچ باتھ روم) میرے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا تھا۔ تازہ دم ہو کر میں باہر نکل آیا۔ تھوڑی بہت حرکت کرنے سے تکلیف تو کم نہیں ہوئی تھی، البتہ درد برداشت کرنے کی اہلیت بڑھ گئی تھی۔ صبح سے وہاں کسی شخص کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ اور مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ دل کیا وہاں سے نکل جاؤں مگر سنا پر بھوک کے ہاتھوں ایک دن میں اتنا بے بس نہیں ہو جاتا کہ احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے۔ میں نے رات ہونے کا انتظار کرنا ضروری سمجھا کہ اندھیرا کافی غلطیوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔

کمرے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لے کر میں دوبارہ بیڈ کے نیچے گھس گیا۔ اور اندھیرا چھانے تک وہ دُبکا رہا۔ کمرے کی بتی روشن تھی اس وجہ سے مجھے رات ہونے کا اندازہ موبائل فون پر وقت دیکھ کر ہوا تھا۔ اس دوران کمرے میں کسی کی آمد نہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر میرا اطمینان مزید بڑھ گیا تھا۔ نو بجنے کو تھے جب میں بیڈ کے نیچے سے نکلا۔ گدڑی کو بیڈ کے نیچے ہی چھوڑ دیا کہ وہاں پہلے بھی کسی نے نہیں جھانکا تھا۔ یوں بھی اگر بیڈ کو ہٹایا جاتا تو میرے خون کے داغ ظاہر کر دیتے کہ وہاں کوئی چھپا رہا تھا۔ البتہ غالب گمان یہی تھا کہ وہاں اب ایجنسی کے کسی بندے کا آنا محال تھا۔ کیوں کہ ان کے تیس ہدف ہلاک کر کے وہ مقصد پورا کر چکے تھے۔ اب گھر کے مکین ہی نے آ کر مکان سنبھالنا تھا۔

جاتے ہوئے انھوں نے روشنی بجھانے کی زحمت کی تھی نہ کسی کمرے کے دروازے کو بند کرنا گوارا کیا تھا۔ صرف گھر کے داخلی دروازے کو قفل کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ وہاں ڈھونڈنے پر یقیناً کچھ نہ کچھ کھانے کو مل جاتا۔ اور کچھ نہیں تو خشک راشن تو ضرور مل جاتا۔ مگر کسی کی آمد کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور میری حالت ایسی تھی کہ صحیح طریقے سے چل نہیں سکتا تھا تو جان چھڑا کر بھاگتا کیسے۔ پائپ کے سہارے چلتا ہوا میں صحن میں پہنچا۔ داخلی سے نکلنا مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا

نظریں گھما کر میں نے صحن کا جائزہ لیا اور داہنی دیوار کی طرف بڑھ گیا جہاں لوہے کے فریموں میں گملے رکھے ہوئے تھے۔ ان فریموں کی شکل ریک نما تھی۔ ہر فریم کے تین خانے تھے اور ہر خانے میں چار گملے سجے ہوئے تھے۔ ان کی مدد سے میں آسانی سے دیوار عبور کر سکتا تھا۔ اگر زخمی نہ ہوتا تو ایسے سہارے ڈھونڈنے کی کبھی ضرورت نہ تھی مگر تب میری ران پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ اور دیوار چڑھنا تو کجا مجھے ہموار زمین پر چلنے میں سخت دقت ہو رہی تھی۔ ایک فریم کے قریب ہو کر میں پائپ کی مدد سے کوشش کر کے فریم کے تیسرے خانے پر پہنچ گیا۔ اس مشقت میں ٹانگوں کے بجائے میں نے ہاتھوں کا زیادہ استعمال کیا تھا۔ دیوار کے سرے پر چڑھنے تک مجھے دانتوں پسینہ آ گیا تھا۔ دیوار بمشکل آٹھ فٹ ہو گی جو میرے لیے نانگا پربت بن گئی تھی۔ ورنہ دوران تربیت نو فٹ کی دیوار ہم بھاگتے ہوئے عبور کرتے تھے۔ آرمی کی مختلف تربیتوں میں اسالٹ کورس بھی شامل ہے جسے آپ رکاوٹوں بھری دوڑ کہہ سکتے

ہیں۔ایک میل کی حدود میں مختلف رکاوٹیں بنائی جاتی ہیں جنھیں چھوٹے چھوٹے اور ہتھیار کے ساتھ بھاگ کر عبور کرنا پڑتا ہے۔اختتام پر ہدف پر پانچ گولیاں بھی فائر کی جاتی ہیں۔

دیوار کے اوپر لیٹ کر میں نے دوسری جانب جھانکا۔ایک مختصر صحن نظر آیا۔برآمدے میں بلب روشن تھا جس کی پیلی روشنی صحن کا اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔مجھے سب سے زیادہ خطرہ کتے سے تھا۔گھر میں کتا ہونے کی صورت میں میں صحن میں اترتے ہی پکڑا جاتا۔مگر تھوڑی دیر انتظار کے باوجود جب کتے کے آثار نہ دکھے تو میں نے پائپ دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور ہاتھوں کے بل لٹک گیا۔یوں میرے پاؤں کا زمین سے فاصلہ چار پانچ انچ سے زیادہ نہیں رہا تھا۔زخمی ٹانگ کو ہلکا سا سمیٹتے ہوئے میں بائیں پاؤں پر کود گیا۔اوپر سنبھال کے رکھنے کے باوجود دائیں ٹانگ کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔بڑی مشکل سے میں نے درد بھری کراہ کو ہونٹوں میں دبایا تھا۔

چند لمحے دیوار پر سر ٹیکے کھڑا رہا۔درد میں افاقہ ہوتے ہی میں پائپ کے سہارے اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔پچھلا مکان متمول شخص کا تھا،لیکن وہ مکان کسی سفید پوش کا دکھائی دے رہا تھا۔مکان کی بناوٹ ایسی نہیں تھی کہ گھوم کر عقبی جانب سے جائزہ لیا جا سکتا۔کمروں کی دیواریں مکان کی چار دیواری کا حصہ تھیں،اس لیے کمروں کا عقبی حصہ گلی میں آ رہا تھا۔

صحن میں گاڑی وغیرہ کا نہ ہونا مکین کی مفلسی کے ساتھ میری بے بسی کا بھی مظہر تھا۔کیوں کہ کار کی مدد سے وہاں سے نکلا جا سکتا تھا۔

برآمدے کے سامنے پہنچتے ہی میں شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔گھر والوں کو دھمکانے کو میرے پاس ہتھیار بھی موجود نہیں تھا،اگر مکین مجھے پولیس کے حوالے کرنے پر تل جاتے تو میرا جان چھڑانا ناممکن ہو جاتا۔یوں گھر میں داخلے کا میرے پاس ایک ہی جواز تھا کہ میں اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کر لیتا۔یقیناً مکین گزشتہ شب،ساتھ والے مکان میں ہونے والی فائرنگ سے محظوظ ہو چکے تھے اور اب ایک زخمی کو گھر کے صحن میں دیکھ کر انھیں میرے بارے اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوتی۔

کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے دروازہ کھلا۔میرے پاس پیچھے ہٹنے کی مہلت نہیں تھی۔

''کون ہے؟''ایک نسوانی آواز ابھری اگلے ہی لمحے تیس بتیس سال کی قبول صورت خاتون باہر نکلی۔آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور ہاتھ میں چھڑی پکڑے ہونا اس کے نابینا ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ اعتماد سے بولی۔''جواب کیوں نہیں دے رہے،میں محسوس کر سکتی ہوں۔تمھارے پاؤں کی آہٹ ہی مجھے باہر لائی ہے۔''

میں خاموش ہی رہا۔

اس کی طنزیہ ہنسی ابھری۔''ایک اندھی محتاج کے پاس تمھیں کیا ملے گا؟''

میں نے خاموشی توڑی۔''دو نوالے روٹی تو مل ہی جائے گی۔''

''تم تکلیف میں ہو''اس کا اندازہ مجھے حیران کر گیا تھا۔

''کیسے پتا چلا؟''میں حیرانی نہیں چھپا سکا تھا۔

''دیکھ نہیں سکتی،محسوس تو کر سکتی ہوں۔تمھاری آواز میں درد چھپا ہے۔''

میں نے اقرار کیا۔''زخمی ہوں۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''شاید یہ کل کی تلخ کا پھل ہے۔''

''آپ کو جھٹلا نہیں سکتا۔''

وہ رکھائی سے بولی۔ ''کسی مجرم کو زیب نہیں دیتا کہ ایک معذور کو جوکھم میں ڈالے۔''

میں بے چارگی سے بولا۔ ''تھوڑا سا کھانا اور زخم کی مرہم پٹی کرنے پر شاید آپ کو زیادہ تکلیف نہ پہنچے۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ ''اس کی کیا دلیل کہ مزید بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔ یوں بھی ایک مرد گھر پہ ہونے سے اکیلی عورت کے لیے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔''

''کیسے یقین دلا سکتا ہوں؟''

وہ اطمینان سے بولی۔ ''جو عملی تجربات سے گزر چکی ہو اسے چکنی چپڑی باتوں پر یقین نہیں آ سکتا۔''

جی چاہا پوچھوں کہ ''میرے زبردستی گھر میں گھسنے پر کیسے روکو گی۔'' مگر پھر اس کی مظلومیت پر ترس آ گیا۔ ایک بے [illegible] اندھی عورت کو مرد سے جو خطرہ ہو سکتا تھا اس نے کھل کر اظہار کر دیا تھا۔ اور اس کے پس پردہ آج کے مردوں [illegible] ہے۔ یقیناً سارے مرد ایسے نہیں ہوتے، مگر حکم اکثریت کے مزاج پر لگایا جائے گا۔ اس بے چاری کا بھی کسی [illegible] سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا اسے یہ تجربہ ایک سے زیادہ بار ہو چکا ہو، تبھی وہ کسی مرد پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا مجھے اندر آنے کی اجازت نہیں دو گی۔''

وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''بالکل نہیں دوں گی۔''

میں کہیں اور جانے کی حالت میں نہیں تھا، مگر ایک سہمی ہوئی عورت کی مرضی کے خلاف اس کے گھر میں گھسنا کچھ مناسب نہیں تھا۔ ورنہ اس کے پاس مجھے روکنے کی طاقت نہیں تھی۔

''معافی چاہتا ہوں آپ کو زحمت دی۔'' میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھا کہ اب کوئی اور دیوار عبور کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ کافی دیر رکنے کے بعد قدم آگے بڑھاتے ہوئے میرے ہونٹوں سے ہلکی آواز میں۔ ''سی...'' برآمد ہوا تھا۔ ہونٹ بھینچ کر میں نے کراہوں کا گلا گھونٹا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

''ٹھہریں۔'' اس کی اضطراری آواز گونجی۔ ''شاید آپ زیادہ زخمی ہیں۔'' لہجہ کافی بدلا ہوا تھا۔

وہ غیرت دکھانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں رک گیا۔

''آ جائیں، کسی مجبور کو در سے دھتکارنا مناسب نہ ہو گا۔ اور بنتی کرتی ہوں وقت آنے پر تم بھی ترس کھا لینا۔'' اس کی خوف میں لپٹی ہمدردی نے مجھے ششدر کر دیا تھا۔ میری مدد کرنے سے پہلے وہ میرے شر سے پناہ مانگ رہی تھی۔ نجانے کون سے درندہ صفت مرد تھے جنھوں نے اس مظلوم کو مرد ذات سے اتنا متنفر کر دیا تھا۔ مگر وہ وقت استفسار یا اس کی کہانی سننے کا نہیں تھا۔ ٹانگ کی تکلیف میں کمی یا ٹھہراؤ کے بجائے اضافہ ہو رہا تھا۔ جب تک زخم صاف کر کے مناسب مرہم پٹی نہ ہوتی اور درد کش گولیاں نہ ملتیں یہ حالت برقرار رہنا تھی۔ ایسے زخم جن کی بروقت دیکھ بھال نہ کی جائے بعض اوقات ناسور بن جاتے ہیں۔ ایسا ہونے پر ٹانگ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

میں زبانی کلامی وعدے کے بجائے عملی نمونہ پیش کر کے اس کے دل سے کم از کم یہ غلط فہمی دور کر سکتا تھا کہ سارے مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میں خاموشی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔ ایک طرف ہو کر اس نے مجھے داخل ہونے کا رستہ دیا۔

ایک کھلا کمرہ تھا، جس کے دائیں بائیں دو اور کمروں کے دروازے تھے جبکہ عقبی جانب باورچی خانہ نظر آ رہا۔ کمرے میں رکھا پرانا صوفہ سیٹ، چند کرسیاں اور دو میزیں اسے ڈرائینگ روم ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے بیٹھنے کے لیے پلاسٹک کی کرسی کو ترجیح دی تھی کیوں کہ صوفہ زخمی ٹانگ کے خون سے داغ دار ہو سکتا تھا۔

''صوفے پر دیکھیں ناں۔'' میرے نشست سنبھالنے سے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے سننے کی حس غضب کی تھی۔ اللہ پاک جس سے کوئی نعمت لیتا ہے تو بدلے میں دوسری حس میں ناقابل بیان اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں نے وضاحت کی۔ ''زخمی ٹانگ سے خون رس رہا ہے، صوفہ گندا ہو جائے گا۔''

''میں طبی امداد کا سامان لاتی ہوں۔'' وہ بغلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے اعتماد سے اٹھتے ہوئے قدم ظاہر کر رہے تھے کہ گھر کے چپے چپے سے خوب واقف ہے۔

قریب پہنچ کر اس نے چھڑی سے دروازے کی تصدیق کی اور اندر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ طبی صندوقچہ (میڈیکل بکس) اٹھائے نمودار ہوئی۔ چھوٹے قدم رکھتے وہ نزدیک آئی، چھڑی سے میز ٹٹول کر اس نے صندوقچہ اوپر رکھا اور کرسی گھسیٹ کر میرے پاس بیٹھ گئی۔ ہونٹوں پر خوشگوار تبسم بکھیرے وہ گویا ہوئی۔

''بینائی ختم ہونے سے پہلے میں نرس تھی، آٹھ سال پرانی بات ہے لیکن کام بھولی نہیں ہوں۔ اب ذرا زخم کی تفصیل بتاؤ تاکہ مرہم پٹی کر سکوں۔''

میں نے کہا۔ ''داہنی ران میں عقبی طرف سے گولی لگی ہے۔ اور سامنے سے نکل گئی ہے۔''

اس نے تسلی آمیز لہجے میں میرا حوصلہ بڑھایا۔ ''یقیناً ہڈی بچ گئی ہے ورنہ چل نہ سکتے۔ اور گولی کا نکل جانا بھی تمھاری خوش قسمتی ہے۔''

میں ہولے سے بولا۔ ''آپ صحیح کہہ رہی ہیں ویدی۔''

اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ لمحہ بھر کو وہ سن ہو گئی تھی۔ پھر نشست چھوڑتے ہوئے بولی۔ ''زخم دھونے کو گرم پانی لاتی ہوں، اگر پٹی باندھی ہے تو کھول کر زخم کو ننگا کر دو۔'' وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی اور میں پٹیاں کھولنے لگا۔ چونکہ پٹیاں پتلون کے اوپر ہی باندھی تھیں اس لیے زخم سے چپٹی نہیں تھیں۔ البتہ پتلون اتارتے وقت میری کراہیں نکل گئی تھیں کہ کپڑا زخم سے بری طرح چپٹا ہوا تھا۔

میرے زخم کھولنے تک وہ پانی گرم کر کے لے آئی تھی۔ میں نے پتلون اتار دی تھی اور صرف جانگیہ (انڈر ویئر) پہنا تھا۔ اس کے اندھا ہونے کے باوجود مجھے ہلکی سی جھجک ہو رہی تھی۔ مگر ران ننگا کرنا مجبوری تھی۔ کہ زخم کی صفائی اس کے علاوہ ممکن نہ تھی۔ گولی گوشت پھاڑتے ہوئے سامنے سے نکلی تھی۔ گولی لگنے کی جگہ چھوٹا سا سوراخ تھا مگر جہاں سے گولی نکلی تھی اس جگہ کا گوشت پھٹ گیا تھا۔

چھڑی سے میز چھو کر اس نے پانی کا برتن رکھا اور کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

''میں پٹی کر لوں گا دیدی۔'' مجھے جھجک ہو رہی تھی۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ''نرس تو غیروں کی مرہم پٹی فرض سمجھ کر کرتی ہے، تم نے تو دیدی بنا لیا ہے۔ اور چھوٹے بھائی کی مرہم پٹی کرنے میں کیسی جھجک۔''

میں نے وضاحت کی۔ ''آپ کو نظر نہیں آتا تبھی کہہ رہا تھا کہ خود کر لوں گا۔''

''نابینا ہوں، انجان نہیں ہوں۔'' میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے وہ شفقت سے بولی۔ ''میرا ہاتھ زخم پر رکھو۔''

میں نے اس کا ہاتھ زخم پر رکھ دیا۔ اس نے نرمی سے زخم کو چھوا اور ہولے ہولے ہاتھ گھما کر پورے زخم کا جائزہ لینے لگی۔ زخم کو اچھی طرح ٹٹول کر وہ بڑبڑائی۔ ''پستول کی گولی تو نہیں لگتی۔''

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ ''آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟''

''کہا ناں پیشہ ور نرس ہوں۔ پستول کی گولی اتنا گہرا شگاف نہیں ڈالتی۔'' اس نے چھڑی سے میز کی جگہ کا اندازہ کیا

اور میز کو قریب گھسیٹ کر طبی صندوقچے کو کھولنے لگی۔ میں نے اس کی مدد کو ہاتھ بڑھائے۔ وہ شفقت سے
بولی۔ "آرام سے بیٹھے رہو، میں کر سکتی ہوں۔"
میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ واپس کھینچ لیے۔
اس نے روئی نکال کر پانی میں بھگوئی اور نرمی سی زخم پر پھیرنے لگی۔ انداز میں پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ بڑی
کی شفقت بھی جھلک رہی تھی۔
گرم پانی سے زخم کو صاف کر کے وہ پائیوڈین میں روئی بھگو کر زخم پر لگانے لگی۔ اگلے مرحلے میں اس نے چوڑی
کاٹ کر اس پر ایک کریم ملی اور پٹی کو زخم کے منہ پر رکھ کر اوپر سے پٹی لپیٹ دی۔
مرہم پٹی ہوتے ہی درد کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔
وہ درد کش ٹیکہ تیار کرنے لگی۔ مجھے خاصی حیرانی ہوئی تھی۔
"دیدی، بغیر دیکھے آپ کو کیسے پتا کہ یہ کون سا ٹیکہ ہے؟"
"بدھو، مختلف ٹیکوں کی بوتلوں کا حجم یکساں نہیں ہوتا۔ اور میرے پاس چند قسم کے ٹیکے ہی پڑے ہیں۔ آسانی سے
شناخت کر لیتی ہوں۔"
ٹیکہ تیار کر کے اس نے مجھے کولہے پر لگایا اور پھر اینٹی بایوٹک ٹیکہ تیار کر کے میری رگ میں لگا دیا۔ انگلیوں سے ٹٹول
کر جس طرح اس نے میری رگ تلاش کی تھی میرے لیے حیران کن نظارا تھا۔ ایک اندھی مسیحا پہلی بار دیکھی تھی۔
بکس کو بند کر کے اس نے شفقت سے پوچھا۔ "کھانا کھاؤ گے؟"
میں بے تکلفی سے بولا۔ "سخت بھوک لگی ہے۔"
"گرم کر کے لاتی ہوں۔" وہ اٹھنے لگی۔
میں سرعت سے بولا۔ "پہلے کوئی چادر یا تولیہ لا دو کہ میں صرف جانگیے میں ہوں۔"
وہ شرارتی انداز میں بولی۔ "تو یہاں ایک اندھی کے علاوہ کون ہے جو شہزادے کو دیکھنے آئے گا۔"
میں جھینپتا ہوا بولا۔ "دیدی مجھے عجیب لگ رہا ہے۔"
وہ مسکراتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھیں۔ واپسی پر ہاتھ میں مردانہ شلوار قمیص تھی۔ "یہ پتا جی کے کپڑے
ہیں۔" اس نے صاف لباس میری طرف بڑھا دیا۔
میں نے شکریہ کہتے ہوئے کپڑے لے لیے۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔
لباس تبدیل کر کے میں نے پرانے کپڑے اور خون آلود پٹیاں وغیرہ سمیٹ کر کوڑا کرکٹ کی ٹوکری میں پھینکے۔ اور
صوفے پر بیٹھ گیا۔
تھوڑی دیر بعد وہ کھانا گرم کر کے لے آئیں۔ آلو بھجیا اور توے کی تازہ روٹی تھی۔ مجھے کھانا پکڑا کر وہ چائے بنانے
لی گئیں۔ سخت بھوک لگی تھی۔ میرے کھانا کھانے تک وہ گرما گرم چائے لے آئی تھیں۔ اور اس وقت مجھے چائے کی سخت
ب بھی ہو رہی تھی۔ سگریٹ، نسوار جیسی لت سے قدرت نے مجھے دور رکھا ہے، لیکن چائے تو میری نظر میں قدرت کا تحفہ
ے۔
چائے اس نے دو پیالیوں میں لائی تھی۔ مجھے پیالی پکڑا کر اس نے میرے سامنے نشست سنبھالی۔ "اب اپنی کہا
انی) سناؤ۔"
میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا "ضروری ہے۔"

''نہیں، لیکن مشتاق ضرور ہوں۔''
''خود کو بے گناہ کہنا تو جھوٹ ہوگا۔''
''معافی تو نہیں مانگی۔''
اس نے منہ بنایا۔''اگر اپنے متعلق سچ بتانا مشکل ہو تو کیا کروں۔''
میں ہچکچاتے ہوئے بولا۔''خبروں میں سنا ہے کہ حساس ادارے کے کمانڈوز نے ملحقہ مکان پر چھاپہ مار کر دو تین
اس نے انکشاف کیا۔''خبروں میں سنا ہے کہ حساس ادارے کے کمانڈوز نے ملحقہ مکان پر چھاپہ مار کر دو تین دہشت گردوں کو ہلاک کیا ہے۔اور حقیقت تو یہ ہے کہ چھاپہ مار دستے کے کچھ افراد میرے گھر کی دیوار پھلانگ کر ساتھ والے مکان میں داخل ہوئے تھے۔''
میں نے جان چھڑائی۔
''جب آپ جانتی ہیں تو استفسار کا مطلب؟''
اس نے الجھن ظاہر کی۔
''کیا دہشت گرد تم جیسے ہوتے ہیں، جو اکیلی عورت کو دیدی بنالیں۔''
''اچھائی اور برائی کا احساس تو تعلق کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔فاقوں سے مغلوب ہو کر دکان کا تالا توڑنے والا اپنے بچوں کو مسیحا اور دکان دار کو ڈکیت لگتا ہے۔''
''فلسفہ سننے کا موڈ نہیں ہے۔''
میں جز بز ہوا۔''دیدی! میرے پاس آپ کو بتانے کو کچھ نہیں ہے۔''
وہ شاکی ہوئی۔''اعتبار نہیں ہے۔''
''بے اعتباری، کسی خوف یا خطرے کے زیر اثر ہوتی ہے۔اور آپ جیسی نرم دل و معصوم چاہتے ہوئے بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''
اس نے منہ بنایا۔''میں گھنٹی کر کے پولیس کو بلا لیتی ہوں تاکہ یہ غلط فہمی تو دور ہو کہ میں کچھ کر نہیں سکتی۔''
میں نے قہقہہ لگایا۔
''پولیس کے آنے سے پہلے میں نکل جاؤں گا۔''
''نکل کر دکھاؤ۔''سنجیدہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے دایاں ہاتھ گریبان میں ڈالا واپسی پر اس میں میں لیڈیز پستول موجود تھا۔سنہری رنگ کا ننھا سا پستول منقش سانپ کی طرح مجھے گھور رہا تھا۔میرے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔
میں نے چائے کی پیالی دھیرے سے میز پر رکھی
ایک دم اس نے تبصرہ کیا۔
''تم نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی ہے۔''
مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔اتنی مدہم آواز بھی اس نے سن لی تھی۔کالے شیشوں کی عینک کو تاڑتے ہوئے مجھے لگا شاید وہ دیکھ سکتی ہے۔
اس نے میری سوچ پڑھ لی تھی، ایک دم نفی میں سر ہلایا۔''دیکھ نہیں سکتی، صرف سن سکتی ہوں اور یقین مانو اگر پہلو بھی بدلوگے تو مجھے محسوس ہو جائے گا۔''
''کیا چاہتی ہیں۔''میں نے بے بسی کا اظہار کیا اور تب لگا کہ اسے بے بس جاننا میری حماقت تھی۔گھر داخل ہونے کی اجازت میں نے اخلاقی تقاضا پورا کرنے کو مانگی تھی۔لیکن وہ اس وقت بھی مسلح تھی اور یقیناً مجھے بہ زور روک سکتی تھی۔

وہ متبسم ہوئی۔ "تمھاری غلط فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔" اس کا دایاں ہاتھ پستول غائب کرنے کو گریبان کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے نظریں جھکالی تھیں کہ اسے دیدی پکارنے کی نسبت سے وہ میرے لیے محترم و مقدس تھی۔

میں شاکی ہوا۔ "اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔"

اس نے خفت سے پوچھا۔ "خفا ہو۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

نشست چھوڑتے ہوئے اس نے چھڑی سے میز کو چھوا اور گھوم کر میرے پہلو میں آگئی۔ "دیدی سے بھی کوئی خفا ہوتا ہے بھلا۔" میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس نے شفقت سے پکارا۔

"دیدیاں ڈانٹتی ہیں، دھمکی نہیں دیتیں۔"

"شما چاہتی ہوں۔" اس نے ندامت ظاہر کی۔

میں خفت سے بولا۔ "اب بے عزتی تو نہ کریں نا۔"

وہ گزشتہ موضوع کی طرف پلٹی۔ "کیا آپ کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے؟"

"کیوں، پڑوسی ملک والا کسی محترم خاتون کو دیدی بنانے کا مجاز نہیں ہوتا۔" اس کی تفتیش سے جان چھڑانے کو میں نے بے موقع واویلا مچایا۔

وہ شاکی ہوئی۔ "ایسا کب کہا ہے۔"

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ "آج رات کو پناہ مل سکتی ہے؟"

اس نے حکم صادر کیا۔ "مکمل ٹھیک ہونے تک تم کہیں نہیں جا رہے۔"

میں نے منہ بنایا۔ "اگر یونھی تفتیش ہوتی رہی تو شاید آج ہی بھاگ جاؤں۔"

"مجھے مسلسل ٹال رہے ہو۔" اس کا ہاتھ بازو پر رینگتا ہوا میرے کان کی لو تک پہنچا اور اس نے کان پکڑ کر شفقت سے کھینچا۔ "بتا رہے ہو یا کان اکھیڑ دوں۔"

"بعض اوقات خاموش رہنا مجبوری بن جاتی ہے کہ بندہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتا اور سچ بول نہیں سکتا۔ صرف اتنا ہی یقین دلا سکتا ہوں کہ کسی بے گناہ کو نقصان پہنچانے نہیں آیا، نہ بھارت سرکار کی املاک کو نقصان پہنچانے کا ارادہ ہے اور نہ مال و زر کے حصول کو آیا ہوں۔"

"تمھاری وضاحت نے میری ڈھارس بندھا دی، ورنہ یہی کھد بد رہتی کہ شاید میں نے کسی مجرم کو پناہ دی ہے۔"

میں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔ "کسی کو مجرم گردانا اخلاق نہیں مملکت کے قانون کے دائرہ کار میں ہے۔ اور اس لحاظ سے مجرم ہوں۔"

میرے سر میں چپت رسید کرتے ہوئے وہ متبسم ہوئی۔ "چھوٹے، تم فلسفے کی آڑ میں اپنے سارے چھپالو۔" میرے دیدی کہنے پر اس کے رویے میں نہ صرف بے تکلفی در آئی تھی بلکہ ایک قسم کی شفقت بھی جھلک رہی تھی۔

"مجھے اپنی دیدی کا نام تک معلوم نہیں۔" میں نے سوالوں کا رخ اس کی جانب موڑا۔

وہ جلدی سے بولی۔ "ممتا دشنول۔"

"اور آپ کب سے اکیلی رہ رہی ہیں۔"

"پتا جی کے دیہانت (انتقال) کے بعد سے اکیلی ہوں۔" وہ افسردہ ہوگئی تھی۔

"آپ اپنے نرس ہونے کا ذکر کر رہی تھیں، اس کا مطلب ہے آپ کی بینائی بعد میں ضائع ہوئی۔"

"انٹرویو لینے کی ضرورت نہیں میں خود سے سب کچھ بتا دیتی ہوں، بلکہ بینائی ختم ہونے کا تو پہلے بتا چکی ہوں، شاید بھول گیا ہے۔"

"مگر یہ تو نہیں بتایا کہ کیسے ختم ہوئی۔" میں نے بات بنائی۔ تھوڑا فاصلہ بڑھا کر انھوں نے صوفے سے ٹیک لگائی اور گہری سوچ میں کھو گئیں۔ میں نے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لمحہ بھر بعد وہ گویا ہوئی۔ "پتا جی فوج میں تھے۔ بھارت ماتا سے ان کی محبت کسی تعارف کی متقاضی نہیں ہے۔ ہم دو بہن بھائی تھے۔ چھوٹا راجیو اور میں۔ ہم پر وہ جان چھڑکتے تھے، مگر دیش کی محبت پر ہمیں کبھی ترجیح نہ دی۔ ریٹائرڈ ہونے پر انھوں نے ایک دکان ڈالی، اچھی خاصی آمدن ہو جاتی تھی۔ ماتا جی، پتا جی کے ریٹائرڈ ہونے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہی تھیں۔ راج بھی ایک حادثے میں ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جانتے ہو مرتے وقت اس کا سر میری گود میں تھا۔" ان کی آواز گلوگیر ہوئی۔ آنسو پینے میں انھیں چند لمحے لگے تھے۔ ایک گہرا سانس لے کر انھوں نے سلسلہ تکلم جوڑا۔ "ماتا جی اور راج کے دیہانت (انتقال) کے بعد پتا جی کی ساری محبتیں مجھ پر نچھاور ہونے لگیں۔ ان کا ارادہ مجھے ڈاکٹر بنانے کا تھا مگر میں لکھنے پڑھنے میں واجبی سی تھی۔ ایف ایس سی بہ مشکل پاس کر سکی تھی۔ انھیں، مجھے مسیحا کے روپ میں دیکھنے کا بڑا شوق تھا، لیکن میں ڈاکٹر نہیں بن سکتی تھی۔ مجبوراً ان کی خواہش کے احترام میں نرس بن گئی۔ اسی اثناء میں روہن گجرال سے ملاقات ہوئی۔" ایک بار پھر وہ چپ ہو گئیں۔ یقیناً روہن گجرال بھی کوئی خاص شخص تھا کہ وہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ میں صبر کیے ان کے بولنے کا منتظر رہا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی آواز گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

"بہت پیار جتایا کرتا تھا۔ آسمان کے تارے توڑنے کے دعوے، راج کماریوں کی سی زندگی دینے کی ڈینگیں، آسائشیں و آرام دینے کے وعدے، ہر حال میں ساتھ نبھانے کی قسمیں اور زبان اتنی میٹھی کہ یقین کیے بغیر چارہ ہی نہ تھا۔ شبہ ہی نہیں گزرتا تھا کوئی اس اعتماد سے جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ جب نبھانے کا وقت آیا تو ظالم فیصلہ سنانے بھی نہ آیا کہ کم ازکم گلہ شکوہ ہی کر لیتی۔" ایک اور گہرا سانس لے کر اس نے جذبات پر قابو پایا "روزانہ اسی کے ساتھ ہسپتال جایا کرتی تھی۔ وہ موٹر سائیکل بھی اسے میں نے لے کر دی تھی۔ یہاں آ کر پہلے میرے ہاتھ سے ناشتا کرتا اور پھر ہم دونوں ہسپتال جاتے۔ مجھے ہسپتال اتار کر وہ یونیورسٹی چلا جاتا۔ اس دن اس کے ناز نخرے اٹھاتے تھوڑی دیر ہو گئی۔ تبھی اسے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ دو جگہ ٹریفک سگنل توڑ کر وہ ہسپتال کے قریب پہنچا اور تیسرے اشارے کو توڑتے ہوئے مخالف سمت سے آنے والے موٹر سائیکل سے تصادم ہو گیا۔ ہم دونوں پختہ سڑک پر بری طرح گرے تھے۔ اس نے ہیلمٹ پہنا تھا لیکن میں بغیر ہیلمٹ کے تھی۔ ہوش آیا تو دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ کافی علاج کرایا مگر آنکھوں کی روشنی بھگوان نے واپس لے لی۔ جب تک ڈاکٹروں نے میری دید ختم ہونے کی تصدیق نہ کر دی وہ باقاعدگی سے آتا رہا۔ جونھی معلوم ہوا کہ اب میں کبھی نہیں دیکھ سکوں گی الوداع کیے بغیر غائب ہو گیا۔ اس کے بعد میری اس سے بات نہ ہوئی۔ ایک بار پتا جی کو بات کرتے سنا تھا۔ پتا جی اس کی بنتی (منت) کرتے ہوئے میرے خوشیوں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ مگر اس نے پتا جی کی توہین کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے پتا جی کو سختی سے منع کر دیا کہ اس ظالم کے سامنے گڑگڑانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں پتا جی کو خوش نظر آنے کو بہ ظاہر ہنستی مسکراتی رہتی، لیکن جب دکان پر چلے جاتے تب جی بھر کر رو لیتی۔ اور ان کے آنے تک جی ہلکا ہو جاتا۔ مگر شاید یہ میری خوش فہمی تھی کہ پتا جی میرے غم سے ناواقف ہیں۔ انھیں میرا غم اندر ہی اندر کھا گیا۔ اور پتا ہی نہ چلا ایک دن مجھے اکیلا چھوڑ کر سورگ (جنت) کی راہ لی۔ پتا جی کے کریا کرم کے بعد مجھے مستقبل کے اندیشوں نے گھیر لیا۔ مگر یہ پریشانی عارضی ثابت ہوئی۔ بھگوان کے کرم سے پتا جی چلتی ہوئی دکان چھوڑ گئے تھے۔ ان کے دیہانت کے بعد ان کا ملازم میرے پاس دکان کا حساب کتاب لے آیا۔ وہ شروع دن سے پتا جی کے ساتھ تھا۔ میں نے

دکان کا سارا حساب کتاب اسی کے حوالے کر دیا۔ تین سال ہو گئے ہیں، بھگوان کی کرپا سے کیم کو گھر آ کر حساب کتاب دے جاتا ہے۔ اچھی گزر اوقات ہو رہی ہے۔ بس یہی میری کہانی ہے۔''

اس نے کافی تفصیل سے اپنی کہانی سنائی تھی، جو غیر ضروری تفصیلات حذف کر کے اجمالاً آپ کے سامنے بیان کر دی ہے۔

اب اس نے توپوں کا رخ میری جانب موڑنا تھا، اس سے پہلے ہی میں نشست چھوڑتا ہوا بولا۔ ''سخت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ آرام کی جگہ ہی دکھا دیں۔''

ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔ میرا اپنے بارے کچھ بتانے سے اعراض کرنا اس کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا۔ بیٹھتے وقت وہ چھڑی لپیٹ لیتی تھی۔ جدید ساخت کی چھڑی سمٹ کر بالشت برابر رہ جاتی تھی۔ قدم بڑھانے سے پہلے اس نے چھڑی کو سیدھا کیا اور بائیں جانب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ بلاشبہ چھڑی اندھے کے لیے آنکھ کا کام کرتی ہے۔ اور ہر قدم پر وہ چھڑی کے محتاج ہوتے ہیں۔

دروازہ دھکیلتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئی۔ درمیانے حجم کی خواب گاہ میں مسہری، کپڑوں کی الماری، دو تین کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔

''یہ میرے راج کی خواب گاہ ہے، بعد میں پتا جی یہاں منتقل ہو گئے تھے۔ الماری میں ان کے چند سوٹ بھی لٹکے ہوں گے۔ بلا تکلف پہن لینا۔''

''شکریہ دیدی۔'' میں بستر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ واپس مڑ گئیں۔

بستر کو جھاڑ کر میں بیٹھ گیا۔ ممتا وشنول کا ملنا ایک خوشگوار حادثہ لگ رہا تھا۔ نہایت باکردار، ہنس مکھ، خوش اخلاق اور رحم دل عورت تھی۔ میرا دیدی کہنا انھیں نہال کر دیتا تھا اور تبھی میرے قریب آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ زخم کے ٹھیک ہونے تک وہاں چھپنا نہایت مفید تھا۔ اللہ پاک نے سر چھپانے کا ایسا ٹھکانہ مہیا فرما دیا تھا جہاں زخم کی دیکھ بھال بھی ہو رہی تھی، آرام بھی مل گیا تھا اور کھانے کی بھی کمی نہیں تھی۔

بوٹ کھول کر میں نے زخمی ٹانگ کو ہاتھوں میں پکڑ کر بستر پر سیدھا رکھا اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ گزشتہ رات نے مجھ سے قریبی ساتھی اور مددگار چھین لیے تھے۔ ڈینو کے بغیر میری طاقت آدھی رہ گئی تھی۔ ساری زندگی دہشت گردوں کے خلاف لڑنے والے مجاہد کا آخری وقت پردیس میں آنا تھا کہ جہاں اس کا جنازہ پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ زندہ دل، نڈر اور باصلاحیت جوان تھا۔ اس مشن میں اس کی حیثیت سرغنہ کی سی تھی۔ گو باقاعدہ طے نہیں ہوا تھا لیکن میں نے اس کے مشوروں کو اپنی رائے پر مقدم رکھا تھا۔ اور اب اس کے جانے پر سامنے خلا ہی نظر آ رہا تھا۔ اندھیرے میں تو ہم پہلے ہی سے تھے۔ اب تو گویا بے دست و پا بھی ہو گیا تھا۔

اس کی شہادت مجھے اس لیے کھل رہی تھی کہ میرا مددگار اور ساتھی تھا لیکن گھر والوں کا تو زندگی کا سہارا چلا گیا تھا۔ نجانے اس کے ماں باپ پر کیا بیتے گی۔ پریشان کن سوچوں میں دروازے پر ہونے والی آہٹ مخل ہوئی۔ گردن گھمانے پر ممتا دیدی نظر آئیں۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے میں ٹرے اٹھائی تھی۔ البتہ لباس ایسا نہیں تھا کہ میں نظر بھر کر دیکھ سکتا۔ شاید سونے کو انھوں نے شب باشی کا لباس پہنا تھا۔ ہلکا پھلکا پاجامہ اور اس پر نصف بازوؤں والی بنیان۔ میری آنکھیں جھک گئی تھیں۔ وہ سڈول و متناسب جسم کی بھرپور عورت تھیں۔ ہلکا سانولا رنگ، تیکھے نین نقش، جاذب نظر۔ ہونٹوں پر ہر وقت دھیمی مسکان کی موجودی نے انھیں پرکشش بنا دیا تھا۔ ہلکے سانولے رنگ نے ان کی شخصیت کو مقناطیسی بنا دیا تھا۔ لیکن میرے دل میں ان کے لیے بڑی بہن جیسا احترام اور مقام تھا۔ میں نے نظریں جھکا

لیں، اگرچہ ''میری نظروں کی آوارگی نہیں دیکھ سکی تھی لیکن جو دلوں کے بھید جانتا ہے، اتنا باریک بین ہے کہ سوچوں کی آلودگی جس سے چھپائی نہ جا سکے، اس کے سامنے تو جواب دہ ہونا تھا۔

''دیدی آپ!'' میں سیدھا ہوا۔

چھڑی سے میز کو چھو کر اس نے ٹرے رکھا جس میں دودھ کا گلاس اور چند گولیاں پڑی تھیں۔ ''بستر پہ لیٹے ہوئے کھانا کھا کر تمھیں دوائی تو کھلائی ہی نہیں ہے۔''

''آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے آواز دی ہوتی۔''

متانت سے بولی۔ ''تکلف کی ضرورت نہیں ہے چھوٹے! بڑی بہنیں ماں کی جگہ پہ ہوتی ہیں۔ اور ماؤں کو اولاد کے کام آ کے خوشی ہوتی ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''خیر اتنی بھی بڑی نہیں ہیں کہ میری اماں جان بن جائیں۔ ممتا نام کا غلط فائدہ نہ اٹھائیں۔''

کھلکھلاتے ہوئے بولیں۔ ''دوائی لے کر آرام کرو اور دودھ کا گلاس ختم کرنا۔'' وہ دروازے کی طرف مڑ گئیں۔

میں ٹرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ گولیاں کھا کر میں نے دودھ کا گلاس پیا اور آرام کرنے لیٹ گیا۔

—●—

دوسرے ہی دن میں نے داڑھی، مونچھیں صاف کر کے کلین شیو کر لی تھی۔ دیپک کا موبائل فون میرے پاس تھا۔ اس میں ڈالا گیا ہوا ایک ہی نمبر تھا۔ کئی بار کوشش کرنے کے باوجود وہ نمبر بند ہی ملتا تھا۔ یقیناً انھوں نے مذکورہ نمبر ضائع کر دیا تھا اور اب وہ موبائل فون میرے لیے ناکارہ تھا۔

اگلے دو ہفتے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ممتا دیدی ایک مثالی خاتون تھیں۔ مجھے انھوں نے اتنی محبت، توجہ اور شفقت سے نوازا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئیں۔ ہم رات گئے تک گپیں ہانکتے رہتے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی راجو کے نام پر مجھے راج کہہ کر بلاتی تھیں۔ میں انھیں اپنے بارے قریباً سب کچھ بتا چکا تھا۔ جینی، گلکارے، ماہین کی بے وفائی، سردار کی دوستی، لی زونا کی کہانی، پلوشہ ورومانہ کے ساتھ عشق کی داستان، بیٹے عبداللہ کے بارے اور بھی کافی تفصیل البتہ انڈیا آنے کے مقصد کے بارے چاہ کر بھی کچھ نہیں بتا سکا تھا۔ انھوں نے بھی ایک دو بار سرسری سا کریدنے کے بعد زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ جینی کے ذکر پر اس نے پوچھا

''امریکہ کیا کرنے گئے تھے۔''

جواب دیا۔ ''نشانہ بازی سیکھنے۔''

وہ متبسم ہوئی۔ ''واہ چھوٹے، تم سنائپر ہو۔''

میں حیرت سے اچھل پڑا تھا، مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''دیدی! آپ سنائپر کے بارے کیا جانتی ہیں؟''

''سنائپر پر پہلی فلم میرے خیال میں 1993 میں بنی تھی، دوسری 2002 اور تیسری 2004 میں۔ تینوں فلمیں میں نے دیکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھی ہیں۔ اس کے بعد میرا خیال ہے 2011 میں اس موضوع پر فلم آئی تھی لیکن نہ دیکھ سکی کہ اس وقت میری آنکھیں باقی نہیں رہی تھیں۔'' ممتا دیدی کی آواز میں اداسی در آئی تھی۔

میں الجھنے سے بولا۔ ''اچھا اتنا شوق تھا سنائپر فلم دیکھنے کا کہ فلم ریلیز ہونے کی تاریخ بھی یاد ہے۔''

''ہاں بہت زیادہ شوق تھا۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انھوں نے شوخی سے پوچھا۔ ''تم اپنا بتاؤ، کبھی ہدف پر گولی ماری بھی ہے یا یوں ہی ہو۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''گولی چلا لیتا ہوں۔''

انھوں نے ایک دم پوچھا۔ ''میرے دیش میں بھی گولی چلانے تونہیں آئے۔''

میں جلدی سے بولا۔ ''فکر نہ کریں کسی بے گناہ کے سر میں گولی نہیں ماروں گا۔''

ان کا ہاتھ میرے بازو کو چھوتا ہوا کان تک پہنچا۔ کان کی لو کو انگوٹھے و شہادت کی انگلی میں بھینچتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں بولیں۔ ''تم نے چھاتی کے بجائے سر کا نام لیا ہے۔ گویا اچھے نشانہ باز ہو۔'' ان کا مشاہدہ غضب کا تھا کہ عام کی بات سے خاص نتیجہ اخذ کیا تھا۔

میں بات بناتا ہوا بولا۔ ''ہر آدمی اپنی صلاحیتوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، آپ کے چھوٹے بھائی نے ڈینگ ماردی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔''

''میرا خیال ہے کافی پیتے ہیں۔'' انھوں نے نشست چھوڑ دی تھی۔

مجھے بس ان کے لباس پر اعتراض تھا جو ستر پوشی کے ضروری تقاضے پورے نہیں کرتا تھا۔ وہ شب باشی کے لباس میں بے حجابانہ میرے سامنے آ جاتیں۔ کبھی کبھی نیکر بھی پہن لیتیں۔ یوگا کی مشقیں باقاعدگی سے کرتی تھیں اور اس وقت چست پاجامے میں ملبوس ہوتیں۔ یوگا کی مشقیں ہی تھیں کہ وہ اتنی سمارٹ نظر آتی تھیں۔

لباس صرف ان کا مسئلہ نہیں انڈیا میں عورتوں کی اکثریت اس معاملے میں آزاد خیال ہے۔ پاکستان میں بہت زیادہ جدت کے باوجود خواتین اس نہج تک نہیں پہنچیں۔ صرف اونچے طبقے کی نام نہاد آزادی کی علم بردار قلیل تعداد کی خواتین میں ایسی بے حیا پائی جاتی ہیں؛ جنھیں نہ تو مذہب و شریعت کا لحاظ ہے اور نہ روایات کا پاس۔ شوبز سے تعلق رکھنے والی مختصر سی جماعت بھی ایسے پہناوں کی عادی ہے۔ ورنہ اکثریت کا لباس بہت بہتر ہے، پردے کے تقاضے پورے نہ بھی کرے ستر پوشی کی ضروریات کو کافی ہے۔ ہماری دیہاتی خواتین کی شرم و حیا کے تو کیا کہنے۔ شاید ایک بی بی کے لباس سے مغرب کی درجن بھر خواتین کے لباس تیار ہو جائیں۔

میں نے ایک دو بار سرسری سا ٹوکا مگر وہ ہنس کر ٹال گئیں۔ اطمینان سے بولیں

”گھر میں چھوٹے بھائی کے علاوہ کون ہے کہ مجھے احتیاط کی ضرورت ہو۔“

میں ان پر زور نہیں دے سکتا تھا البتہ اپنی آنکھوں پر قابو پانا میرے بس میں تھا۔ یوں بھی وہ اول آخر میری باجی ہی تھیں۔ رزا گریا کے بعد پہلی خاتون تھیں جنھیں میری زبان نے دل کی تصدیق کے ساتھ بہن بولا تھا۔ یقیناً مرد کی فطرت میں عورت ذات کے حصول کا حرص کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ جیسے لطیفہ ہے کہ ”عورت کی زبان اور مرد کی آنکھ سب سے آخر میں مرتی ہے۔“ گو رومانہ جیسی خوب صورت اور پلوشہ جیسی موہنی لڑکی کے حصول کے بعد مجھے کسی اور عورت کی احتیاج نہیں ہونا چاہیے تھی، مگر جنس مخالف کی خوب صورتی سے متاثر ہونا تو مرد کی فطرت میں شامل ہے اور میں گناہ گار سا مرد ہی ہوں۔ البتہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ میرے دل میں کبھی پلوشہ اور رومانہ سے بے وفائی کرنے کا خیال نہیں آیا۔ جیسے ان پر میں صرف اپنا حق جتاتا تھا یونہی خود کو ان کی امانت سمجھتا تھا۔ گلگارے اور جینی جیسی پرکشش لڑکیاں بھی مجھے متزلزل نہیں کر سکی تھیں۔ گو گلگارے تو اول آخر مشرقی لڑکی تھی اور اپنی پارسائی پر دھبہ برداشت نہیں کر سکتی تھی مگر جینی جس معاشرے کی پیداوار تھی وہاں جسمانی تعلقات کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ شادی سے پہلے خواتین کا مردوں کے ساتھ ملنا (ڈیٹ کرنا) عام سی بات ہے۔

میری جس بات کا جواب نہ دینا ہوتا ممتا دیدی بڑی خوب صورتی سے ٹال دیتی تھیں۔ ایک دن پوچھا۔

”دیدی! آپ کے پاس پستول کب سے ہے۔“

”پتاجی نے لے کر دیا تھا۔ اور انھی سے چلانا بھی سکھا تھا۔“

”تو پستول کی موجودگی میں کوئی آپ سے کیسے چھیڑ خانی کر سکتا ہے۔“ مجھے ان کی پہلے دن کی باتیں یاد آئیں۔

ان کا ہاتھ میرے سر تک پہنچا، بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ شفقت سے بولیں۔ "بدھو، کوئی بڑی بہن سے ... سوال کرتا ہے۔"

"... شا چاہتا ہوں۔" مجھے ندامت کا اظہار کرتے بن تھی۔

تین ہفتوں کے اختتام پر میرا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس دوران میں ایک بار بھی صحن میں نہیں نکلا تھا کیونکہ کسی پڑوسی کی نظر پڑ جاتی تو نہ صرف دیدی کا کردار داغ دار ہوتا بلکہ مجھے بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

آخر ایک دن میں جانے کو تیار تھا۔ تین ہفتے بہت اچھے گزرے تھے۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ میں کسی خطرناک ... ہوں۔ گھر کا سا ماحول، آرام اور سکون، اچھا کھانا، ممتا دیدی کی شفقت بھری محبت اور دیکھ بھال جی نہیں چاہتا ... چھوڑ دوں۔ مگر وہاں مستقل رہنے کو نہیں آیا تھا۔ گھر سے نکلے ہوئے مہینے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ گو فوجیوں کے لیے چھٹی ... ری اتنی اہمیت نہیں رکھتی، مگر اس بار معاملہ مختلف تھا۔ ایک تو میری جان سے پیاری پلوشے کی خفگی کا خیال تھا کہ ... نے کا مشکل مرحلہ باقی تھا۔ اور اس کے بچکانہ فیصلوں سے کوئی بھی الٹی سیدھی امید کی جا سکتی تھی۔ دوسرا گھر کفیٹ ... ن نہیں رہا تھا کہ انصاری صاحب نے انڈیا سے گھر بات کرنے کو سختی سے منع کیا تھا۔

"جانا ضروری ہے۔" ممتا دیدی کے لہجے میں اداسی در آئی تھی۔

میں بے بسی سے مسکرا دیا۔ "آپ نہیں جانتیں۔"

"ایک بات مانو گے۔"

میں اعتماد سے بولا۔ "آپ ہر بات منوا سکتی ہیں، بس میرے اختیار کے دائرہ کار میں آتی ہو۔"

"اگر میں کہوں اپنے دیش لوٹ جاؤ، کیا جواب ملے گا؟"

میں نے اطمینان سے کہا۔ "کہا نہ ہر وہ بات جو میرے دائرہ اختیار میں آتی ہو۔"

... جانتی تھی تم یونہی ٹرخاؤ گے۔" انھوں نے منہ پھلا لیا تھا۔

... یہ ناراض ہونے کا وقت ہے۔" صوفے سے اتر کر میں قالین پر بیٹھا اور ان کی گود میں سر رکھ لیا۔

... ے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ گلوگیر ہوئی۔ "مجھ میں بری خبر سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔"

... ت کی آمد خطرات کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ آرام دہ بستر پر لیٹے شخص کی موت بھی اس کے اتنے نزدیک ہو...

... ن جنگ میں لڑنے والے سپاہی کی۔"

... ابہ تر کی بولی۔ "مگر فکر صرف میدان جنگ والوں کی ہوتی ہے۔"

... ری کامیابی کی پرارتھنا (دعا) کریں، پریشان ہونے سے کیا حاصل۔"

... ہوئی۔ "دیش دشمن کے لیے کیا پرارتھنا کروں۔"

... کی نہ سہی چھوٹے بھائی کی خیریت کی پرارتھنا تو کر سکتی ہیں ناں۔"

... سے ہٹا کر وہ کھڑی ہوئیں اور چھڑی کے سہارے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

... اب گاہ سے برآمد ہوئیں تو ایک ہاتھ میں ڈبا اٹھائے ہوئے تھیں۔ میرے پہلو میں نشست سنبھال ...

... ایک خوب صورت گھڑی برآمد ہوئی تھی۔ میری گھڑی اتار کر وہ قیمتی گھڑی میری کلائی پر باندھنے لگیں۔

... سوا۔ "یہ کیا ہے۔"

... اپنے بھائی کو راکھی باندھتی ہیں۔ میں بھی گھڑی کی شکل میں راکھی کی رسم پوری کر رہی ہوں۔"

''بہت اچھی گھڑی لگ رہی ہے۔''
''کسی کو تحفہ دینے کی غرض سے کافی پہلے خریدی تھی۔ اب مردانہ گھڑی میرے کس کام کی سوچا چھوٹے پر احسان جتا دوں۔''
میں نے اپنا نام ذیشان بتایا تھا، مگر انھوں نے کبھی مجھے ذیشان کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ ہمیشہ راج یا چھوٹا کہتیں۔ اور جب ڈانٹنا ہوتا تو بدھو کہتیں۔
میں ممنونیت سے بولا۔ ''پہلے تھوڑے احسان ہیں۔''
''اپنی محرومیوں وحسرتوں کی تلافی کو احسان نہیں کہتے۔ اور وچن دو اس گھڑی کو کبھی کلائی سے جدا نہیں کرو گے۔''
میں شاکی ہوا۔ ''آپ کو لگتا ہے میں ایسا کر سکتا ہوں۔''
''کبھی نہیں۔'' ان کے ہونٹوں پر خوب صورت تبسم نمودار ہوا۔ ''تھوڑی سی رقم بھی رکھ لو۔'' انھوں نے درمیانی مالیت کے نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھائی۔
میں نے انکار میں کہا۔ ''ہمارے ہاں بہنوں کو پیسے دیئے جاتے ہیں لیے نہیں جاتے۔''
وہ ہنسی ہوئی۔ ''ادھار سمجھ کر رکھ لو، بعد میں لوٹا دینا۔''
''ضرورت ہوتی تو مانگ لیتا۔''
وہ مصر ہوئی۔ ''فالتو پڑے ہیں۔ میرا خرچ نہ ہونے کے برابر ہے اور آمدن زیادہ ہے۔''
میں نے پیسے لے کر ان کے میز پر پڑے پرس میں ڈال دیئے۔ ''اب اجازت دیں۔'' میں نے نشست چھوڑی۔
انھوں نے کھڑے ہو کر ہتھیلیوں میں میرا چہرہ تھاما اور ماتھے پر بوسا دے کر بولیں۔ ''اس گھر کے دروازے تمھارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔''
''فی امان اللہ۔'' دھیرے سے کہہ کر میں مڑا اور تیز قدموں سے چل پڑا۔ تین ہفتوں کے بعد میں کھلے آسمان تلے باہر جانے کو میں نے ایسے وقت کا انتخاب کیا تھا کہ رش حتی الوسع کم ہو۔ یوں کسی بھی نگرانی کرنے والے کی سن گن لینا آسان ہو جاتا ہے۔ ممبئی جیسے شہر میں بازاروں میں بھیڑ ختم ہونے کی آرزو کرنا حماقت ہی ہے۔ البتہ وہ مضافاتی کالونی تھی اور گرمیوں کی دوپہر میں لوگوں کی آمد و رفت خال خال ہی نظر آتی تھی۔ دروازہ کھول کر میں نے دھیرے سے باہر جھانکا، دو آدمی بڑی سڑک کی طرف جاتے دکھائی دیئے۔ باہر نکل کر میں نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا بڑی سڑک کا رخ کرنے کے بجائے میں اسی گلی میں سیدھا چلتا گیا، جہاں دیپک کے ہمراہ اس مکان کے دروازے تک گیا تھا جس میں ڈینو چھپا تھا۔ بڑی سڑک شیو مندر کی طرف جاتی تھی اور یہ دوسری جانب تھی۔
ایک نیچی چار دیواری والے مکان کے صحن میں چند بچے شور کرتے نظر آئے۔ سنیتا جیسوال (را کی ایجنٹ جس نے ڈینو کو پھانسا تھا) کے مکان کے سامنے گزرتے ہوئے میں نے طائرانہ نگاہ ڈالی، مگر دروازے کو تالا لگا تھا۔ گلی کے ایک جانب نکاسی کی نالی بنی تھی جس میں گندہ پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے دیپک والا موبائل فون اس نالی میں پھینک دیا، کیوں کہ اس میں ممتا دیدی کا فون نمبر محفوظ تھا۔ انھوں نے بھی مجھ سے موبائل فون نمبر لیا تھا، لیکن میں ان سے رابطہ رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ کسی مصیبت میں پھنسنے پر موبائل فون نمبر کی وجہ سے وہ بھی دھر لی جاتیں۔ اور انڈین ایجنسیوں کی تفتیش کا جو طریقہ کار ہے اس میں پھنس کر ایک اندھی لڑکی جو بھرپور جوان اور اچھی شکل وصورت کی مالک ہو اس پر کیا بیتتی اس کا اندازہ کرنے کو عقل کل ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ البتہ ان کا نمبر میری یادداشت میں محفوظ تھا جو اشد ضرورت کے وقت میں استعمال کر سکتا تھا۔

تھوڑا آگے بڑھتے ہی گلی دائیں مڑ گئی تھی۔ سامنے سے ایک جوان آرہا تھا جس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا۔ مجھ پر اجنبیت بھری نگاہ ڈال کر وہ آگے بڑھتا رہا۔ میرے احساس اس وقت عجیب سے ہو رہے تھے۔ ہر کوئی مشکوک نظر آرہا تھا۔ ممتا دیدی کا گھر گویا ایسی پناہ تھا جس سے نکلتے ہی دشمن مجھے ہڑپنے کو تیار کھڑے تھے۔ [illegible] دیپک کی موت نے مجھے اکیلا کر دیا تھا۔

جونہی گلی موڑ مڑا کچھ فاصلے پر چار افراد گتھم گتھا نظر آئے۔ غور کرنے پر پتا چلا تین افراد مل کر ایک شخص کو زدوکوب کر رہے تھے۔ ان کے شور اور گالیاں بکنے کی آواز کافی دور تک جا رہی تھی۔ ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے تھے [illegible] کے مقابل تین تھے۔ کوئی راہگیر بھی نظر نہیں آرہا تھا جو انھیں چھڑاتا۔ میں نے بچا خواہ مخواہ بننے سے گریز کا سوچا [illegible] کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کہاں کی عقل مندی تھی۔ مگر ان کے قریب پہنچنے تک میں اپنے ارادے پر قائم نہ رہ سکا۔ اکیلے آدمی کو گرا کر انھوں نے ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اور جس بے دردی سے اسے پیٹ رہے تھے شاید جان ہی لے دیتے۔

''ادے چھوڑ دو اسے۔'' میں نے ایک آدمی کو دھکا دے کر دور کیا اور دوسرے کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

''تیری تو.....'' تیسرا غراتا ہوا مجھے مارنے دوڑا۔ جس کی مدد کو میں آیا تھا اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے اور مجھے ان تینوں کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ مجھے تر نوالہ سمجھ کر وہ گالیاں بکتے ہوئے جھپٹے آگے والے کی چھاتی میں [illegible] ٹانگ رسید کرتے ہوئے میں اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور دائیں پاؤں پر گھومتے ہوئے بائیں پاؤں کی ایڑی [illegible] پیچھے آنے والے کی گردن پر جڑ دی۔ دونوں گلی کے پختہ فرش پر گرے تھے۔ اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھتے ہی تیسرے [illegible] قدموں میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

''تم ہمیں جانتے نہیں، زندگی پیاری ہے تو اپنی راہ لو۔'' اس نے دھمکانے کی کوشش کی۔

''اچھا۔'' میں نے اس کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے ساتھی بھی ڈگمگاتے ہوئے اٹھے اور تینوں ایک ساتھ دور جاتے ہوئے مجھے دھمکیاں بھی دیتے گئے۔ ایسے کردار پاکستان میں بھی کافی مل جاتے ہیں۔ کمزور کو شیر اور زور آور کے لیے بکری۔

جب جان لیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے، میں مضروب کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ہوش میں تھا اور مخالفین کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ کھسک کر قریب کھڑی کار کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''شکریہ جوان۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ کوٹ کی جیب میں رینگا جو ایک چھوٹی سی بوتل کو لیے باہر نکلا۔ ڈھکن کھول کر بوتل منہ سے لگائی، دو تین گھونٹ بھر کر اس نے گہرا سانس لیا۔

''پیو گے۔'' فراخ دلی سے دعوت دیتے ہوئے اس نے بوتل میری جانب بڑھائی۔

''شکریہ۔'' میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے اب آپ خود کو سنبھال لیں گے۔''

وہ متبسم ہوا۔ ''آپ کا خیال غلط ہے۔''

''بتائیے کیا خدمت کروں۔''

اس نے پوچھا۔ ''ڈرائیو کر لیتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے ٹھکانے تک پہنچا دو، اس کے بعد جہاں کہو گے میرے آدمی پہنچا دیں گے۔''

وقت کی ہمت میرے پاس کی نہیں تھی کہ انکار کرتا۔ اسے سہارا دے کر میں نے کار میں بٹھایا ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
قیمتی لباس اور شان دار کار دیکھتے ہوئے اس کی حیثیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ ایسے وقت میں جب میں ڈور کٹی
پتنگ کی طرح بے مقصد پھر رہا تھا اس کی مدد سے کسی متعین راہ کی طرف قدم بڑھا سکتا تھا۔
کلچ دبا کر میں گیئر لگایا اور ریس پر پاؤں کا دباؤ بڑھا کر کار آگے بڑھا دی۔
"گلی سے نکلتے ہی دائیں مڑ جانا۔" وہ مجھے راستہ بتانے لگا۔
سڑک پر آتے ہی اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "مجھے وشال گپتا کہتے ہیں، راجپوت گپتا کا چھوٹا بھائی
ہوں۔ جو راجپوت دادا کے نام سے مشہور ہیں۔"
"سندیپ چوپڑا۔"
وہ ممنونیت سے بولا۔ "دھنے واد سندیپ! (شکریہ) آپ کی وجہ سے میری جان بچی۔"
میں نے پوچھا۔ "آپ ان اچکوں کے ہاتھ کیسے چڑھ گئے؟"
اس نے دانت پیسے۔ "اچکے نہیں، کسی دشمن کے بھیجے ہوئے مہرے تھے، بس میرے قتل کو واردات کا رنگ دینا
چاہتے تھے جو آپ کی بدولت ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن میں سالے کے قتل کو واردات کا رنگ نہیں دوں گا۔"
میں نے بھولا بنتے ہوئے پوچھا۔ "ایسی بھی کیا دشمن کہ بندہ جان لینے پر اتر آئے۔"
وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "جیسے ان کی ٹھکائی کی، مجھے نہیں لگتا آپ شریف زادے ہیں۔"
میں برا مناتے ہوئے بولا۔ "لڑائی بھڑائی میں طاق ہونا کسی کی شرافت پر سوالیہ نشان نہیں چھوڑتا۔"
"شما چاہتا ہوں اپنی بات کی وضاحت نہیں کر سکا۔ میرا مطلب تھا عام آدمی یوں لڑنے کے ماہر نہیں ہوتے۔ البتہ
سرکاری ملازم یا غلط دھندے میں ملوث افراد ہو سکتے ہیں۔"
میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ "ذاتی بچاؤ (سیلف ڈیفنس) کی تربیت حاصل کرنے والے کے بارے آپ کیا کہیں
گے۔"
اس کے ہونٹوں پر کھسیانی ہنسی نمودار ہوئی۔ "یقیناً مسلسل غلط بول کر میں اپنے محسن کو ناراض کر بیٹھا ہوں۔"
"نہیں سر، میں نے صرف صفائی پیش کی ہے۔"
"تو آپ کیا کرتے ہیں؟" اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر اس نے موضوع تبدیل کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔
میں محتاط انداز میں بولا۔ "تعلیم کے اختتام پر کوئی نوکری نہ ملی تو شوقیہ ایک کراٹے کلب میں داخلہ لے لیا۔ اب بھی
کوئی کام دھندہ نہیں ہے اس لیے فی الحال تو آوارہ گردی کر رہا ہوں۔"
"پتا جی کیا کرتے ہیں۔"
"پتا جی کو سورگباشی (جنت مکین) ہوئے چار سال گزر گئے ہیں۔ امی جان ان سے ایک سال پہلے چل بسی
تھیں۔ ایک بڑی بہن ہے جنھیں ڈولی میں بٹھا کر پتا جی نے میرے لیے کوئی ذمہ داری باقی نہ رہنے دی۔ اب بیوہ خالہ
کے ساتھ رہتا ہوں جو مجھ سے اتنا ہی تنگ ہیں جتنا کسی بھی مفت خورے سے ہوا جا سکتا ہے۔" مختصر سے سوال کا میں نے
تفصیلی جواب دیا تھا کہ اس کے اگلے سوال یہی ہونا تھے۔
"کون سا کام کر سکتے ہو؟" اس کا سوال میری منشا کے مطابق آیا تھا اور جواب پہلے سے تیار تھا۔ اطمینان سے کہا۔
"دولت مند بننا چاہتا ہوں۔"
"میں نے کام کا پوچھا ہے۔" اس نے سوال دہرایا۔

"بتایا نا دولت مند بننا چاہتا ہوں کام کوئی بھی ہو کر لوں گا۔"
وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "قتل کرلو گے۔"
سرخ اشارے پر بریک دباتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "قتل کرنے کا میں کام نہیں کر سکتا۔"
اس نے قہقہہ بلند کیا۔ "اغواء، ڈکیتی، چوری، جیب تراشی ..."
"یہ سب کرنے کو مجھے کسی کا ملازم بننے کی کیا ضرورت ہے۔"
وہ مجھے لاجواب کرتا ہوا بولا۔ "تمھی تصدیق چاہی تھی کہ کیا کر سکتے ہو۔"
"کوئی بھی شریفانہ کام۔" اشارہ سبز ہو گیا تھا۔ بریک سے پاؤں ہٹا کر میں نے ریس پر رکھ دیا۔
وہ استہزائی انداز میں بولا۔ "بال کاٹنے کے بارے کیا خیال ہے۔"
میں گڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "میں بس کسی غریب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔"
اس نے منہ بنایا۔ "تو کسی غریب کو اغواء کوئی پاگل ہی کرے گا۔ اور غریب کے گھر پیسہ ہوگا تو ڈاکا مارا جائے گا۔"
میں نے چپ سادھ لی۔
"چوک سے دائیں۔"
موڑ کاٹ کر میں نے گلا کھنکارا۔ "آپ مجھے اپنے محافظوں میں بھی تو شامل کر سکتے ہیں۔ لڑائی بھڑائی جانتا ہوں، اور سکھاؤ گے تو یقیناً ہر قسم کے اسلحے کا استعمال سیکھ لوں گا۔"
وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ "اڈے پر چل کر گپ شپ کریں گے۔" ساتھ ہی اس نے ذیلی سڑک پر جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک وسیع عمارت کے چوڑے دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ کار پہچانتے ہی چوکیدار نے بغیر پوچھے دروازہ کھول دیا تھا۔
سیمنٹ کی پختہ روش پر چلتے ہوئے میں نے کھلے صحن میں پہلے سے موجود گاڑیوں کے قریب کار روک دی۔ تین چار موالی قریب آ گئے تھے۔ ان میں ایک نسبتاً بہتر لباس میں تھا۔
نیچے اترتے ہی وشال گپتا نے اس کا گریبان پکڑتے ہوئے دو تھپڑ جڑ دیئے تھے۔
"سالے حرامی تو سویا ہوا ہے۔ وہ ماں کے خصم آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہوتے اگر مجھے اس دلیر جوان کی مدد نہ ملی ہوتی۔"
"ب... باس! سالے محافظوں کی جیپ کھراب (خراب) ہو گئی تھی۔ اپن نے کافی گھنٹیاں بجائیں مگر تم نے فون نہ اٹھائی۔"
وشال گپتا نے ایک اور تھپڑ کھینچ مارا۔ "میرے ساتھ خراب جیپ بھیجی کیوں تھی؟"
وہ ہکلایا۔ "شش... شما کر دو باس، اپن آئندہ کھیال (خیال) رکھے گا۔"
"مجھ پر حملہ کرنے والوں میں نیلی آنکھوں والا کنجر، استاد سنگھا ساتھ تھا۔ اسی سے باقی دو کا پتا چلے گا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ تینوں مجھے ہر حالت میں چاہئیں۔"
وہ جلدی سے بولا۔ "اپن ابھی ان کی تلاش میں بندے بھیجتا ہے۔"
"اس لڑکے کی اچھی خاطر تواضع کرو، بہترین رہائش مہیا کرو، اگر شکایت کا موقع ملا تو کھال میں بھس بھر دوں گا۔ اور میرے کمرے میں ڈاکٹر بھیج دو۔" اسے ہدایت دے کر وشال گپتا میری طرف متوجہ ہوا۔ "سندیپ، فی الحال آرام کرو بعد میں تفصیلی بات چیت ہوگی۔"

"جی سر۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
کتنے شیریں ہیں ترے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
کے مصداق وہ سیکرٹری نما شخص مجھے خندہ پیشانی سے ملا۔ "شکریہ دوست، تمھاری وجہ سے اپن کی جان بچ گئی۔"
"آپ کی؟" میں نے حیرانی ظاہر کی۔
اس نے وضاحت کی۔ "اگر وشال صاحب کو کچھ ہو جاتا تو راجپوت داوا نے سالا لطیر صفائی مانگے اپن کی گردن مار دینا تھی۔"
"پھر تو آپ کو جان بچنے پر مبارک ہو۔"
اس نے فوراً تعارف کرایا۔ "اپن کا نام راجیو ورما ہے۔"
"سندیپ چوپڑا" میں نے جوابی تعارف کرایا۔
"چلیں۔" اس نے اندرونی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور میں اس کی معیت میں چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ہم پر تعیش مہمان خانے میں بیٹھے تھے۔ وہ کمرہ خصوصی مہمانوں کے استعمال میں رہتا ہوگا تبھی اتنا پرآسائش اور آرام دہ تھا۔ کھانا میں کھا کر آیا تھا اس لیے صرف تازہ جوس پینے پر اکتفا کیا تھا۔ اس نے چند قیمتی مشروبات کی پیش کش بھی کی تھی مگر میرے نزدیک ان کی اہمیت گٹر کے پانی جتنی تھی۔ تبھی خوب صورتی سے ٹال گیا تھا۔

●

رات کو پرتکلف عشائیے (ڈنر) کے بعد میں وشال گپتا کے بلاوے کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ گو دل کے کسی کونے میں پہچانے جانے کا ہلکا سا خوف موجود تھا کہ یہ خوف جاسوس کو ہر وقت لاحق رہتا ہے۔ لیکن یہ تسلی بھی تھی کہ وشال میرا احسان مند تھا۔ مجھے فائدہ نہ بھی پہنچاتا، نقصان پر بھی جری نہیں ہو سکتا تھا۔
رات کو جلد سونے کے باوجود صبح دیر سے آنکھ کھلی تھی۔ ناشتے کے تھوڑی دیر بعد ہی وشال گپتا کا بلاوا آ گیا تھا۔ اس عمارت کے تین بڑے حصے تھے۔ ایک وشال گپتا کے لیے مختص تھا۔ اور اس جانب کوئی نہیں جاتا تھا، دوسرا مہمان خانہ اور محافظوں کی رہائش بنی تھی۔ جبکہ کشادہ تہہ خانے میں جمنازیم، پستول شوٹنگ رینج اور لڑائی کا رنگ بنا تھا۔ اوپر کے دونوں حصوں کو ایک راہداری جدا کرتی تھی۔ اور اسی راہداری میں تہہ خانے تک جانے کا رستہ تھا۔
راجیو ورما کی معیت میں چلتے ہوئے میں وشال گپتا کے پاس پہنچا۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ شیشے کا نازک اور خوب صورت گلاس سنہری سیال سے آدھا لبریز اس کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر تبسم ابھرا۔ راجیو کو جانے اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا۔
"سوری یار! تمھیں انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی، میں انتقام کے چکر میں پڑ گیا تھا۔"
نشست سنبھالتے ہوئے میں نے خوش دلی سے پوچھا۔ "کوئی سپھلتا (کامیابی) ملی؟"
خالی گلاس میں تھوڑا سا مشروب انڈیل کر اس نے میری طرف کھسکاتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔ "شمشان گھاٹ (ہندوؤں کا قبرستان) تک پہنچا دیا ہے، اب گھر والے کریا کرم (آخری رسومات) کر لیں گے۔"
میں نے گلاس واپس ان کی طرف دھکیلتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔ "بڑی جلدی پکڑے گئے۔"
میرے شراب نہ پینے پر تبصرہ کیے بغیر وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ "بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاشنا یقیناً ناممکن سمجھا جاتا ہے، مگر مقناطیس پاس ہو تو تھوڑی سی محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔"

''آپ کے پاس کون سامقناطیس تھا۔''

''دولت بہت بری چیز ہے یار! اس کے حصول کو لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ سو ایسا مقناطیس ہے کہ ... وہمدردی کھینچ لیتی ہے۔ میں نے بھی یہی مقناطیس استعمال کیا۔ ان کے گروہ کے اپنے آدمیوں سے ان کی مخبری کی۔''

میں ہنسا۔ ''مخالفین تو سخت طیش میں ہوں گے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''دشمن کو مارنے سے زیادہ غصہ دلانے میں مزہ آتا ہے۔''

''میرے بارے کیا سوچا۔'' میں اصل موضوع پر آیا۔

''میرے محافظ کو لڑائی بھڑائی کا ماہر ہونے کے ساتھ اسلحے کا اچھا شناور ہونا چاہیے۔''

میں نے دامنِ امید دراز کیا۔ ''آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا، کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''جانچے بغیر فیصلہ نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے قہقہہ لگایا۔ ''مذاق کر رہا تھا یار، تم کل سے میرے محافظوں میں شامل ہو گے۔ فی الحال راجیو کے ... جاتا ہوں تاکہ تمھیں پستول وغیرہ چلانا سکھادے۔''

''میں تیار ہوں۔'' بغیر کسی ہچکچاہٹ میں نے ہامی بھری۔ اس کا محافظ بن کر دھیرندر شکلا کو ڈھونڈنا اور ... آسان ہو جاتا۔ زیرِ زمین گروہ اسلحے اور نشہ آور اشیاء کی اسمگلنگ میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اور اسلحے کے ... شکلا بھارت کا سب سے بڑا ڈیلر تھا۔ نہ صرف انڈین آرمی کو اسلحے کی سپلائی کرتا بلکہ غنڈوں اور حکومت مخالف تنظیموں کے ساتھ بھی اس کے روابط تھے۔ مگر وہ جس مقام پر تھا اس تک عام آدمی کی رسائی دشوار ترین تھی۔ بہت زیادہ سوچنے ... میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پرما انصاری کو ڈھونڈنے کے بجائے دھیرندر شکلا کو ٹھکانے لگانے کی جستجو کرنا زیادہ ... تھا۔ اس کے بعد پرما انصاری کا حصول زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ گو دھیرندر شکلا کی پہلی رہائش گاہ آگرہ میں تھی لیکن وہاں ... ٹھکانہ نہیں تھا۔ ملک کے چند بڑے شہروں میں اس کے ٹھکانے موجود تھے اور اب پہلا مرحلہ اسے ڈھونڈنے کا تھا۔ ... روزمرہ سے واقف ہو کر ہی آگے کا لائحہ عمل طے کیا جا سکتا تھا۔ اور اس کے لیے وشال گپتا کا محافظ بننا کافی فائدہ مند ... تھا۔

''چلیں پھر۔'' گلاس سے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے نشست چھوڑ دی۔ ہم سٹنگ روم میں بیٹھے تھے ... اس کی خواب گاہ سے متصل تھا۔ عمارت کے اندر اس کی رہائش ایک علیحدہ مکان جیسی بنی تھی۔ وہاں سے نکل کر ہم چوڑی ... راہداری میں داخل ہوئے جہاں سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔ راہداری کے دوسرے پر ایک اور دروازہ تھا جو ... راہداری میں کھلتا جہاں محافظوں کی رہائش گاہ اور مہمان خانہ بنا تھا۔

سیڑھیوں کا اختتام ایک وسیع ہال میں ہو رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں جمنازیم اور درمیان میں باکسنگ رنگ ... تھا۔ تین جوڑیاں رنگ کے باہر مشق کر رہی تھیں اور دو جوڑیاں رنگ کے اندر ایک دوسرے پر داؤ پیچ آزما رہی تھیں۔ انھیں نظر کرتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔ اگلا دروازہ کھول کر ہم چند سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترے۔ آگے جو ہال تھا اس کی چوڑائی کم اور لمبائی زیادہ تھی۔ وہ ایک جدید شوٹنگ رینج تھی۔ وہاں پچاس میٹر کے فاصلے تک فائر کی سہولت موجود تھی۔ اور پستول کے لیے یہ رینج کافی سے بھی زیادہ تھی۔ پستول ہمیشہ دو بدو اور قریب کی لڑائی میں استعمال ہوتا ہے۔ گو فلموں میں تو ہیرو اس سے ہیلی کاپٹر بھی گرا لیتے ہیں مگر حقیقی زندگی میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اچھے پستول کی گولی بھی چالیس پچاس میٹر کے

بعد طاقت کھونے لگتی ہے۔پستول سے نشانہ بھی پندرہ بیس میٹر کے دائرے ہی میں درست لگتا ہے۔فاصلہ بڑھنے سے گولی کی طاقت میں کمی آتی ہے وہیں نشانے کی درستی بھی غیر یقینی ہوتی جاتی ہے۔اس کے علاوہ پستول کی گولی کی جہاں بھی گول ہوتی ہے۔اگر چھوٹے ہتھیاروں کے ایمونیشن کی بات کی جائے تو ایک کارتوس کے تین حصے ہوتے ہیں۔پہلا کیس یا کھوکا جس میں بارود بھرا ہوتا ہے۔یہ پیتل کا بنا ہوتا ہے اور اس کے پیندے میں پرائمر لگا ہوتا ہے۔کارتوس کے اندر دھواں پیدا نہ کرنے والا بارود بھرا ہوتا ہے جو کہ دانوں کی شکل میں ہوتا ہے۔اس میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ آگ ملنے پر ایک دم اور تیزی سے جلتا ہے اور بہت ساری گیس پیدا کرتا ہے جو کہ گولی کو ساتھ اڑا کر لے جاتی ہے۔جبکہ گولی کارتوس کے اگلے سرے پر لگی ہوتی ہے اور نوکدار ہوتی ہے۔یہ سیسے کی بنی ہوتی ہے اور اس کے اوپر تانبے کا خول ہوتا ہے۔یہ شکل میں لبی ہوتی ہے تاکہ ہوا کے خلاف اپنی رفتار قائم رکھ سکے۔البتہ پستول کی گولی جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں ہلکی گولائی لیے ہوتی ہے، تبھی ہوا کے خلاف زیادہ مزاحمت نہیں کرتی۔یوں بھی پستول صرف قریبی لڑائی میں استعمال ہوتا ہے۔آرمی میں پستول کا استعمال تربیت یافتہ کمانڈوز یا آفیسرز کرتے ہیں۔ان کے علاوہ سنائپرز کے پاس بھی سنائپر رائفل کے علاوہ پستول موجود ہوتا ہے۔عام فوجی، رائفل ہی استعمال کرتے ہیں۔جس میں سرفہرست جی تھری اور کلاشن کوف ہیں۔

اب ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو یہ بھی یاد رکھیں کہ مختلف پستولوں کے قطر مختلف ہوتے ہیں۔جیسے تیس بور، نائین ایم ایم اور اڑتیس بور بہت مشہور ہیں۔قطر مختلف ہونے کی وجہ سے ایمونیشن بھی مختلف ہوتا ہے۔بین الاقوامی سطح پر استعمال ہونے والے اچھی ساخت کے اکثر پستولوں کا قطر 9ایم ایم ہے۔جیسے گلاک، بریٹا، ہیکلر اینڈ کوچ، زگانا (زگانا میں 30بور بھی دستیاب ہے) ڈزرٹ ایگل وغیرہ۔

راجیو رماوہاں پہلے سے موجود تھا۔شوٹنگ رینج جدید سہولیات سے مزین تھی۔چار لکڑی کے کیبن بنے تھے جہاں چار فائرر بیک وقت چار ہدفوں پر فائر کر سکتے تھے۔ہدف متحرک تھے۔بٹن دبا کر ہدف کو اپنی مرضی سے آگے پیچھے کیا جا سکتا تھا۔

راجیو نے آگے بڑھ کر ہمیں خوش آمدید کہا۔

وشال بولا۔''تمھارا نیا شاگرد آ گیا ہے، اسے پستول کا استعمال مکمل سکھا دو۔''

راجیو اعتماد سے بولا۔''آپ فکر ہی نہ کریں باس، اپن ہے نا۔ شام تک بابو سالے رجنی کانت (انڈین فلموں کا پرانا ہیرو) کا مافک گولیاں پھونکے گا۔''

وشال سر ہلاتا ہوا ایک کیبن میں گھس گیا۔بٹن دبا کر اس نے ہدف کو مناسب فاصلے پر پیچھے دھکیلا اور جیب سے پستول نکال کر فائر کرنے لگا۔اپنے کانوں پر اس نے ایئر گارڈ (کانوں کو فائر کی آواز سے محفوظ رکھنے والے حفاظتی غلاف) چڑھا لیے تھے۔

راجیو مجھے ایک میز کے قریب لے گیا جہاں گلاک سیون مین سیمی آٹومیٹک رکھا ہوا تھا۔میں کئی قسم کے پستول استعمال کر چکا ہوں، مگر گلاک ہمیشہ سے میرا پسندیدہ رہا ہے۔گلاک دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔

راجیو نے پوچھا۔''کبھی پستول چلایا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''چند مرتبہ چلایا ہے۔''

''شاباش، پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔اب پستول چلانے سے پہلے چند کھسوسی (خصوصی) باتیں مگج (مغز) میں بٹھا لیوں کہ سالا، خالی لبلبی (ٹریگر) دبانا پستول چلانا نہیں ہوتا۔ایک فائرر سالے کو پستول کے بارے ضروری باتوں کا بھی

پتا ہونا چاہیے۔ یہ سالا بہت عمدہ اور کھاس (خاص) ساخت کا پستول ہے۔ پہلے تم کا میگزین میں گولیاں بھرنے کے
بارے سکھاؤں گا۔'' راجیو مجھے بنیادی باتیں بتانے لگا۔ میں پوری دلچسپی سے سیکھنے لگا۔ ایک دم تربیت کے ابتدائی دن
نظر میں گھوم گئے تھے۔ ہماری تربیت کی شروعات رائفل سے ہوئی تھی۔ پستول کے بارے ہم نے بہت بعد میں سیکھا
تھا۔ پستول اور رائفل کے فائر میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اگر میں تفصیل میں جاؤں تو شاید یہ ناول کے بجائے سکھلائی کی
کتاب بن جائے، اس لیے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔

میگزین میں گولیاں بھرنے کے بعد راجیو میگزین چڑھانے اتارنے، پستول کاک کرنے، سیفٹی لگانے، نشانہ
سادھنے کے بارے سمجھانے لگا۔ اس دوران وشال گپتا وہاں سے جا چکا تھا۔

گھنٹا ڈیڑھ سکھلائی کے بعد راجیو عملی مظاہرے کو مجھے ایک کیبن میں لے گیا۔

پہلے اس نے خود فائر کیا اور دس میٹر کے فاصلے پر بہ مشکل پانچ گولیاں مار سکا تھا۔ ہدف پر اس کی بکھری ہوئی گولیاں
دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ فائر کی جو تکنیکیں مجھے اپنے استاد تصور صاحب، فیاض صاحب وغیرہ
نے سکھائی تھیں وہ راجیو بے چارے نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔ جاسوس بن کر ایک اناڑی کی شاگردی
اختیار کرنا پڑ گئی تھی۔ یقیناً سردار مجھے اس حالت میں دیکھ لیتا تو اس کی ہنسی نہ رکتی۔ کہاں ایس ایس اور کہاں راجیو ورما۔ اور
پھر دس میٹر کے فاصلے پر گلاک سیون ٹین سے ہدف پر گولی نہ مارنے کی خبر اگر تصور صاحب تک پہنچ جاتی تو انھوں نے مجھے
کچا ہی چبا جانا تھا۔

بہ ہر حال میں سکھلائی میں پوری دلچسپی اور شوق ظاہر کرتا رہا۔ تین چار باریوں کے بعد میرا نشانہ بہتر ہونا شروع ہو
گیا اور ساتویں آٹھویں باری پر راجیو میری پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔

آخر کار اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ ''تم کا فائر تو استاد سے بھی اچھا ہو گیا ہے رے۔''

میں اسے تسلی دیتا ہوا بولا۔ ''استاد تو استاد ہوتا ہے راجیو صاحب۔''

''عجیب بات ہے سالا تم نے پانچ کی پانچ گولیاں دائرے کے اندر ٹھوک دیں۔ ایسا تو شاید وشال صاحب بھی نہ
سکیں۔ حالاں کہ ان کا فائر بہت اچھا ہے۔''

میں بے پروائی سے بولا۔ ''اتفاقاً لگ گئی ہوں گی یار۔''

اس نے ہدف کا فاصلہ بڑھا کر پینتیس میٹر کر دیا۔ مجھے شرارت سوجھی اور میں نے ساری گولیاں ہدف کے سر میں
انچ کے گروپ میں مار دیں۔ کیبن میں سکرین لگی تھی، جس پر ہدف کا قریبی نظارا (کلوز ویو) نظر آ رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی
سے سکرین کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔

''سندیپ، سالا تم نے کمال کر دیا رے۔ یہ مظاہرہ اگر وشال صاحب کے سامنے کر دے تو اپن کا انعام تو کہیں نہیں

پہلے نشانہ پکا تو لوں۔'' دس گولیاں بھر کر میں نے میگزین چڑھائی اور پہلے کی طرح تمام ہدف کے سر میں ٹھوک
جیو نے باقاعدہ تالیاں بجا کر مجھے داد دی تھی۔
اں قسم، جندگی (زندگی) میں پہلی بار سالا تمھارے مافک اچھا شاگرد ملا ہے۔''
نے مکھن لگایا۔'' اس میں سارا کمال آپ کی سکھلائی کو جاتا ہے استاد۔''
ماتی چوڑی کرتے ہوئے بولا۔ ''چلو، باس کے پاس، سالا انھیں بھی پتا چلے اپن میں گن ہیں۔''
ول کی صفائی نہیں کرنا۔'' اسے پستول پتلون میں اڑستے دیکھ کر بے ساختہ میرے ہونٹوں سے نکلا تھا۔

مجھ میں گرانی صفائی کی ضرورت پڑی "وہ وہاں جاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اور میں دل ہی
"یہ پادکوں نا مجھ میں ... پستول کی دہان ہونے کی ضرورت ہی کو پڑتا نہیں۔ ایسا ملک اکسٹر صاحب نے بتائے
دل میں ان کالوں اور ... پستول ... معلومات ... تھا۔ اور بالفرض اگر وہ بچ بھی جاتا تو اس پر چلنے کے قابل رہ جاتا۔
پڑ جاتا تو اس کا دوبارہ چلانا مشکلات ... کرنے کو وہ ایسا ہی رکھتے ہیں بے اندھا فائر کرنے کے بعد اٹھا دیا ہے۔ اور معلومات میں
فائر کے بعد ہتھیار کی صفائی کر کے ... صاف کیا جائے تو ہتھیار جلد ہی ناکارہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی
ہر فائر کے بعد اگر ہتھیار کو اچھی طرح سے صاف نہ کیا جائے ... چال والے پڑے ہوتے ہیں۔ فائر کے بعد بیرل میں بارود اور ... نے
ہتھیار کی کارکردگی کا انحصار اس کی بیرل اور چال والے پرزے ہوتے ہیں۔ اگر انہیں صحیح طرح سے صاف نہ کیا جائے تو جلد ہی بیرل کو زنگ لگ جاتا ہے۔ جس سے
اس ... جاتے ہیں۔ اگر انہیں صحیح طرح سے صاف نہ کیا جائے تو جلد ہی بیرل کو زنگ لگ جاتا ہے۔ جس سے
اس پر چھید جاتے ہیں۔ یوں سب ... پہلے تو ہتھیار کی درستگی نشانے بازی میں فرق پڑتا ہے اور آہستہ آہستہ
بیرل میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ یوں ... وہ پستول میری ملکیت نہیں تھا مگر ہتھیاروں سے قدرتی لگاؤ کی وجہ سے مجھے پرائے
ہتھیار فائر کے قابل ہی نہیں رہتا۔ وہ پستول میری ملکیت نہیں تھا مگر ہتھیاروں سے قدرتی لگاؤ کی وجہ سے مجھے پرائے
فل کا برا لگ پڑا تھا۔ بہرحال میں بحث و تکرار کی حالت میں نہیں تھا۔

وشال گپتا کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اچانک اس کی نظر اپنے آدمی پر پڑی۔

"ابے سالے گنیش تو کا ہے بکری کا مالک بنا پھر رہا ہے۔"

گنیش جلدی سے بولا۔ "استاد صفائی کروا رہا ہوں۔"

وہ پستول اس کی جانب پھینکتے ہوئے بولا۔ "کافی فائر کیا ہے، اس سالے کو بھی جھاڑ پھونک لے۔" اس نے میرے خیالات پڑھ لیے تھے یا شاید پہلے جلدی کی وجہ سے پستول کی صفائی کو غیر ضروری جانا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا پستول کو صاف کرنا اسے اپنی شان کے خلاف لگ رہا ہو۔ بہرحال کچھ بھی تھا کم از کم میرے دل پر پڑا بوجھ کم ہوا تھا۔

گنیش نے پستول کو ہوا میں پکڑتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں "جی استاد" کہا۔

"باس کمرے میں ہے؟"

گنیش بولا۔ "کہیں باہر گیا ہے۔"

راجیو مجھے مخاطب ہوا۔ "تم آرام کرو، استاد کی واپسی پر بات ہو گی۔" اور میں سر ہلاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن آرام نہ آیا اور عمارت کا جائزہ لینے نکل گیا۔ ایک جاسوس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اپنے فرار کا رستہ نگاہ میں رکھے۔ وشال گپتا کا مہمان ہونے کی وجہ سے کسی نے تعرض نہ کیا تھا۔ پوری عمارت میں گھوم کر میں نے باریک بینی سے جائزہ لیا۔ عمارت کی عقبی دیوار میں چار کوارٹر بنے تھے۔ جس میں ملازموں کی رہائش تھی۔ عقبی جانب دروازہ بھی موجود تھا جسے تالہ لگا تھا۔ اور وہاں کوئی چوکیدار وغیرہ موجود نہیں تھا۔ عمارت کے چاروں جانب گلیاں موجود تھیں۔ کوئی بھی دوسرا مکان عمارت سے متصل نہیں تھا۔ پوری عمارت میں گھومنے کے بعد میں چھت پر چڑھ گیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے بوریت دور کرنے کو سرگشت کر رہا ہوں۔

چھت مجھے خالی نظر آئی تھی۔ وہاں سے عمارت کے چاروں جانب کی نگرانی ہو سکتی تھی، مگر وشال گپتا نے پہرے دار مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یقیناً اسے کسی سے اتنی جرأت کی توقع نہیں تھی کہ وہاں ہلہ بول سکتا۔

گھنٹے ڈیڑھ کی مفید چہل قدمی کے بعد میں واپس کمرے میں آ گیا تھا۔

وشال گپتا سے شام کو ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے میری نشانہ بازی دیکھنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔ البتہ شاباش دے کر راجیو کو خوش ضرور کر دیا تھا۔ راجیو کو جانے کا اشارہ کر کے اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور کام سمجھانے لگا۔ میرے علاوہ اس

کے تین محافظ اور بھی تھے۔ تینوں کی رہائش اسی عمارت میں تھی۔ وشال اپنے کارندوں سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا
لیکن احسان مند ہونے کی وجہ سے مجھے زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ ضروری باتیں اور سینئر کارندوں کی عزت و احترام کا
بھاشن دینے کے بعد وہ مجھے اپنے کوت میں لے گیا۔ (کوت کا لفظی معنی ہتھیاروں کی الماری ہے۔ آرمی میں کوت اس
کمرے کو کہتے ہیں جہاں ہتھیار رکھے جاتے ہیں)

ڈرائینگ روم سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ ہتھیاروں سے سجا تھا۔ وہ نت نئے ہتھیار جمع کرتا رہتا تھا۔ راجیو سے پتا
معلوم ہوا تھا کہ وشال گپتا ایک شوٹنگ کلب کا باقاعدہ ممبر تھا۔ اور ہتھیاروں کا جنون کی حد تک شیدائی تھا۔ جب جیب میں
پیسہ ہو اور قانون کا خوف نہ ہو تو ایسا کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ اس کا کوت دیکھتے ہوئے مجھے راجیو کی بات پر عین الیقین حاصل
ہو گیا تھا۔ دیواروں پر بیسیوں اقسام کے اعلیٰ کوالٹی کے پستول اور رائفلیں ٹنگی
تھیں۔ ڈریگنوو، گلیل، بیرٹ 107، وِدوانسک یہ چار قسم کی سنائپر رائفلیں اور اس کے علاوہ چند اقسام کی یورش
رائفلیں (اسالٹ رائفلیں) تھیں جن میں انڈیا کی انساس، AK47 یعنی کلاشن کوف اور جی ٹو قابل ذکر ہیں۔ ان میں
وِدوانسک انڈیا کی اپنی بنی ہوئی سنائپر اور اینٹی میٹریل رائفل ہے۔ جو آرڈیننس فیکٹری ترو چرا پالی کی تیار کردہ ہے۔ اس کی
خاص بات یہ کہ اسے کھولے بغیر تین قسم کی بیرل 12.7، 14.5 اور 20 ایم ایم استعمال کی جا سکتی ہیں۔ مگر
بیرٹ 107 کارکردگی اور درستی کے لحاظ سے اس سے کئی گنا بہتر تھی۔ وِدوانسک وزن میں بھی، بیرٹ سے کافی بھاری
ہے۔ یوں اس کی اہمیت اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ مجھے وِدوانسک استعمال کرنے موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ باقی تینوں رائفلیں
میں استعمال کر چکا تھا۔

"ان میں سے اپنی پسند کے دو پستول لے لو۔" وشال گپتا میری محویت میں مخل ہوا۔

"ج... جی سر۔" میں ہکلا گیا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "تم تو یوں آنکھیں پھاڑ کر ہتھیاروں کو دیکھ رہے ہو جیسے پہلی بار موقع ملا ہو۔"

میں نے بات بنائی۔ "فلموں میں کافی بار دیکھے ہیں سر۔"

وہ ہنسا۔ "فلموں میں اصل ہتھیار نہیں ہوتے بے وقوف۔"

میں خفیف ہوتے ہوئے بولا۔ "مجھے کیا پتا سر۔"

"مجھے سر نہیں باس بولا کرو۔" نرم لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے اس نے دوبارہ دعوت دی۔ "اپنی پسند کے پستول لے
لو۔"

میں سادگی سے بولا۔ "جس پستول کے ساتھ آج فائر کیا ہے، اسی جیسا ٹھیک رہے گا۔"

وشال گپتا نے قہقہہ بلند کیا۔ "اچھا انتخاب ہے۔" اور دو گلاک میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک ہی کمپنی کے ہیں۔"

ورنہ بھی بتاتا تو نیم خودکار (سیمی آٹومیٹک) گلاک سیون ٹین اور خودکار (آٹومیٹک) گلاک ایٹین کو پہچاننا میرے
لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا کسان چنے و گندم کے فرق کو پہچانتا ہے۔

میں پستول پتلون میں اڑسنے لگا۔

"ٹھہرو۔" کہہ کر اس نے مجھے روکا اور چمڑے کا نفیس و ملائم ہولسٹر پکڑوا دیا۔ جس میں دو پستول رکھے جا سکتے
تھے۔ ساتھ ہی باندھنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔

اگلے دن سے میری ڈیوٹی شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے ہی وشال کے کہنے پر راجیو کالے رنگ کے تین تھری پیس سوٹ میرے لیے لے آیا تھا۔ کوٹ کے نیچے ہولسٹر باندھ کر میں خود کو سچ مچ محافظ محسوس کر رہا تھا۔ مجھ سے پہلے وشال کے محافظوں میں اجیت سنگھ اور موہن سنگھ دو سکھ اور ایک ہندو شنکر داس شامل تھے۔ تینوں لمبے تڑنگے اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ انھوں نے تمسخرانہ نگاہوں سے میرا استقبال کیا تھا۔ مگر میں نے توجہ دیے بغیر خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا۔ ان کی کار وشال گپتا کی کار کے عقب میں ہوتی تھی۔ وہ اپنی کار میں کبھی اکیلا اور کبھی ڈرائیور کے ہمراہ ہوتا تھا۔ میری آمد کے پہلے دن اس نے ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری کار سندیپ ہی ڈرائیو کرے گا۔''

اگلے چند دن کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا۔ میری کوشش تھی کہ وشال گپتا کے محافظوں سے تعلقات خوش گوار رہیں کیوں کہ ان سے کافی معلومات مل سکتی تھیں۔ دھیریندر شکلا کے بارے معلومات لینے کو مجھے وشال کے ہاں نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ اس کا محافظ بننے کا مطلب ممبئی میں آزادی سے گھومنے کا پروانہ حاصل کرنا تھا۔ وشال گپتا، راجپوت دادا کا چھوٹا بھائی تھا اور راجپوت دادا کی ممبئی میں خاص پہچان تھی۔

کوشش کے باوجود میں وشال گپتا کے محافظوں سے بے تکلف نہیں ہو پایا تھا۔ نہ جانے انھیں مجھ سے کیا پرخاش تھی۔ شاید وشال کا مجھے بہت زیادہ توجہ دینا انھیں اچھا نہیں لگا تھا یا شاید مجھے خود سے کمتر سمجھتے تھے۔ کیوں کہ تینوں کے قد نکلتے ہوئے تھے، صحت مند اور ہٹے کٹے، جبکہ میں درمیانے قد اور چھریرے بدن کا ہوں۔

اس دوران چند بار راجپوت دادا کا سامنا بھی ہوا۔ مگر اس نے مجھے قابل توجہ نہیں جانا تھا۔ گو اس نے مجھے سلطان دادا کے ہاں دیکھا تھا لیکن تب میری چھوٹی داڑھی، مونچھیں اور لمبے بال تھے۔ اب میں نے کلین شیو کرا کے سر کے بال فوجی کٹ کے ترشوائے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے حلیہ کافی بدل گیا تھا۔ چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہی انسان کے حلیے کو بدل دیتی ہیں۔ یوں جس سے سرسری ملاقات ہوئی ہو وہ شناخت نہیں کر پاتا۔ البتہ دیرینہ آشنا آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔ اور وہاں مجھے اچھی طرح پہچاننے والا صرف ڈینو ہی تھا جو باقی نہیں رہا تھا۔

وشال گپتا کے ہمراہ کئی اہم اور خاص شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔ جرائم کے دھندوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلحے، نشہ آور اشیاء اور ولایتی شراب کی اسمگلنگ میں پیش پیش تھے۔ بھتہ خوری، چھوٹی موٹی ڈکیتیاں، اغواء برائے تاوان کی وارداتیں نچلے درجے کے کارندے اپنے طور پر کرتے رہتے تھے۔ چونکہ لوگوں کو رعب میں رکھنے کو یہ کارروائیاں ضروری سمجھی جاتی ہیں اس لیے راجپوت دادا اور وشال گپتا اپنے کارندوں کی حرکات سے آنکھیں میچے رکھتے تھے۔

ایک دن شوٹنگ کلب جانے کا اتفاق ہوا۔ کلب ممبئی کے مضافات میں بنا تھا۔ کلب کی عمارت کے احاطے ہی میں پارکنگ بنی ہوئی تھی۔ قیمتی گاڑیوں کی بہتات دیکھ کر مجھے لگا کوئی خاص پروگرام ہے۔ سیکیورٹی کا خاص انتظام بھی میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ باقی محافظوں کو پارکنگ میں رکنے کا کہہ کر وشال مجھے ساتھ لیے کلب کی اندرونی عمارت کی طرف بڑھا۔ دروازے پر ہم سے ہتھیار اور موبائل فون جمع کر کے ٹوکن دے دیئے گئے تھے۔ اندر ایک بڑے ہال میں کافی رونق نظر آ رہی تھی۔ قیمتی صوفہ سیٹ اور آرام دہ کرسیاں ایک ترتیب سے لگی تھیں۔ سامنے ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا جیسے کوئی سبق چلنا ہو۔ اسٹیج پر ایک بڑی سکرین لگی تھی ساتھ ہی روسٹرم رکھا تھا۔ حاضرین میں عربی لباس میں بھی چند افراد نظر آئے۔ یقیناً ان کا تعلق خلیجی ریاستوں سے تھا۔

اہم افراد کے ہمراہ آنے والے محافظوں اور ملازموں کے لیے دیوار کے ساتھ اسٹول رکھے تھے۔ وشال گپتا کے اشارے پر میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ خود وی آئی پی نشستوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

صورت، مگر لباس میں ملبوس لڑکیاں مختلف مشروبات اور لوازمات کے بھرے ہوئے ٹرے اٹھا کر ادھر ادھر
میں گھوم رہی تھیں۔ جن میں مختلف قسم کی شرابیں، کولڈ ڈرنک اور جوس شامل تھے۔ کھانے میں پھل، خشک میوہ جات، بھنا
اور ابلا ہوا گوشت، بسکٹ، کیک، وغیرہ کی بہتات تھی۔ مگر اس میں سے کچھ بھی ملازموں کے لیے نہیں تھا۔ میں غور کر رہا
قدیم کی کسی روی تقریب کا حصہ بن رہا تھا جہاں غلام اپنے آقاؤں کو کھاتے پیتے دیکھ سکتے تھے، لیکن انھیں کچھ کھانے
چھونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی۔ میری نگاہیں کسی مطلب کے
بندے کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔ عربی شیخ اپنے ترجمانوں کے ہمراہ ایک انگریز لڑکی کو گھیرے نظر آئے۔ وشال کھیم کر
پرتپاک انداز میں لڑکی کو ملا تھا۔ سنہری بالوں والی لڑکی کافی خوش شکل و پرکشش تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے جینی یاد آگئی تھی گو کہ
جینی کا چہرہ سرخ و سفید تھا۔ اور یہ خالص گوری تھی۔ کندھے تک چھوٹے بال جنھیں نفاست سے تراشا گیا تھا۔ اپنی تہذیب
ثقافت کے مطابق مردوں سے بے باکی سے مصافحہ کر کے گپ شپ کر رہی تھی۔ نصف بازوؤں کی تنگ بنیان اور چست
پتلون میں جسمانی ابھار مزید اجاگر ہو رہے تھے۔ مگر مغرب کی عورت اپنے جسم کی نمائش پسند کرتی ہے۔ اور اس لیے حتی
الوسع ایسے لباس کے انتخاب پر زور دیتی ہے جو

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

کی عملی تفسیر ہوں۔ اس کا لباس بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ اس کے علاوہ بھی حاضرین میں چند خواتین نظر آ رہی تھیں مگر
لوگوں کی زیادہ توجہ گوری پر تھی۔ پاکستان اور انڈیا کے لوگوں میں ایک عادت بالکل مماثل ہے کہ دونوں قوموں کے افراد
گوروں سے خواہ مخواہ ہی مرعوب رہتے ہیں۔ آج تک بے چاروں کے خون سے گورے کی غلامی کا اثر زائل نہیں ہو سکا۔ وہ
لڑکی تو اچھی خاصی حسین و پرکشش تھی، اگر معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا تو توجہ کا مرکز اسی نے ہونا تھا۔ جیسے مشتاق احمد
یوسفی لکھتے ہیں کہ ”انگریزوں میں خال ہی بدصورت عورت پیدا ہوتی ہے اور ہمارے پاکستانی ڈھونڈ کر اسی سے شادی
کرتے ہیں۔“

اچانک لوگوں میں ہلچل مچی اور تمام استقبال کو کھڑے ہو گئے۔ میری نظر آنے والی شخصیت پر پڑی اور دل جوش
سے دھڑکنے لگا تھا۔ دھیرندر شکلا کی منحوس صورت پہلی بار میری آنکھوں کے سامنے آئی تھی مگر میں نے فوراً ہی پہچان لیا
تھا۔ انصاری صاحب کے پاس اپنی بیٹی کی تصویر تو موجود نہیں تھی البتہ انھوں نے شکلا کی کئی تصاویر دکھائی تھیں۔ اس کا چھے
فٹ دو تین انچ قد بھی اسے نمایاں کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر گوشت نام کو نہ تھا۔ سوکھا سڑا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ پہلی نظر میں
مجھے انگریزی فلموں کا مشہور کردار ڈریکولا لگا تھا۔ چھریرا بدن ہونے کی وجہ سے وہ اور زیادہ طویل قامت لگ رہا تھا۔
اس کے عقب میں چار چاق و چوبند مسلح محافظ نظر آ رہے تھے۔ چاروں تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ ان کی عقابی
نگاہیں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

دھیرندر شکلا سیدھا گوری لڑکی کی طرف گیا تھا۔ اس نے پرتپاک انداز میں لڑکی کا ہاتھ تھاما، مسکراہٹوں کا تبادلہ
ہوا۔ دونوں نے مدہم لہجے میں کوئی بات کی اور پھر مختلف افراد دھیرندر سے ملنے لگے۔ تین نشستی (تھری سیٹر) صوفے پر
اس نے لڑکی کے ہمراہ ہی نشست سنبھال لی۔

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا مگر کوئی ایسا طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ میں دھیرندر شکلا کے گندے وجود سے دھرتی
کو پاک کر سکتا۔ یقیناً تمام لوگوں سے ہتھیار اسی وجہ سے جمع کیے گئے تھے۔ لیکن میرے پاس پستول موجود بھی ہوتا تب
بھی اس بھیڑ میں کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہ ہر حال اس کے نظر آنے کے بعد امید کی کوئی کرن تو پیدا ہو گئی تھی۔ اب کم از کم کسی

کے متعلق سوال جواب کر رہا تھا۔

لورا کی آمد کے چند لمحوں بعد ایک ساؤنڈ پروف روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر حاضرین محفل کو متوجہ کرنے
اسپیکروں پر اس کی آواز یوں سنائی دی جیسے پہلو میں بیٹھا ہو۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔
''معزز مہمانوں کو خوش آمدید۔ یقیناً آپ لوگوں کو آج کے اکٹھ کی غرض و غایت معلوم ہوگی۔ براہ راست مدعے پر
آنے سے پہلے آپ کو خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان ایک ایسی شخصیت موجود ہے جو پھول سے نازک اور
بظاہر صنف نازک ہے مگر حقیقت میں مردوں سے بھی کئی قدم آگے ہے۔ اس نے افغانستان جیسے
خطے میں دہشت گردوں کے سر سے گولی گزاری ہے کہ ان کی کھوپڑیوں سے مینار تعمیر ہو سکتا تھا۔ کم عمری ہی میں تجربات
حاصل کر کے لندن چننے والی برطانیہ آرمی کی مایہ ناز سنائپر لورا براؤن جو آرمی نوکری سے مستعفی ہو کر ایک شوٹنگ کلب
کی ہٹی میں منسلک ہوئی ہیں۔ انڈیا میں محترمہ کی آمد اپنی غرض سے ہوئی لیکن کلب انتظامیہ کی درخواست پر آپ نے ممبران کے
لیے اپنے قیمتی وقت سے چند لمحات عنایت کرنے کی مہربانی کی ہے۔ آج ہم مس لورا براؤن کے تجربے اور فائرنگ تکنیکوں
سے مستفید ہوں گے۔ آپ کی تالیوں کی گونج میں تشریف لاتی ہیں، کیپٹن لورا براؤن۔'' لیپ ٹاپ روسٹرم پر رکھ کر وہ پیچھے
ہٹ گیا تھا۔

حاضرین نے پرتپاک انداز میں تالیاں بجا کر لورا کا استقبال کیا تھا۔ میں بھی گہری دلچسپی اور کسی قدر حیرانی سے
اسے دیکھنے لگا۔ ایک دوسرے کے شکل آشنا نہ ہونے کے باوجود ہم دونوں کافی گپ شپ کر چکے تھے۔ بلکہ جانی دشمن رہ
چکے تھے۔ یقیناً اس نے افغانستان کے محاذ پر کافی مجاہدین اور کثیر تعداد میں بے گناہ لوگوں پر گولی چلا کر خاصا نام کمایا
تھا۔ لیکن میرے ہاتھوں بری طرح شکست کھائی تھی۔ یوں بھی افغانستان محاذ پر ڈیوٹی سرانجام دینے والے امریکن اور
گورے واپس جا کر قوم میں ہیرو گنے جاتے ہیں۔ افغانستان کا تو نام ہی ان اقوام کے لیے موت کی علامت ہے۔ کبھی
ساری دنیا کے لیے پھنے خان بنا امریکہ آخر قلیل تعداد اور ناقص و ناکافی آلات جنگ رکھنے والے مجاہدین کے سامنے گھٹنے
ٹیک کر مذاکرات کی میز پر آ گیا ہے۔ جسے طالبان کا وجود ہی تسلیم نہیں تھا۔ جنھیں دہشت گرد اور غاصب قرار دیتا تھا۔ جن کا
نام و نشان مٹانے کو بڑے بڑے دعوے و ارادے کرتا تھا۔ جن کے خون کا پیاسا ہو کر ساری دنیا کی طاقت کو ان بے
سروسانوں کے سر پر اکٹھا کر لایا تھا۔ اور اب مذاکرات کر کے اپنی شکست پر مہر تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ اقرار کر رہا ہے کہ
مجاہدین کی کوئی حیثیت ہے۔ آخر معاہدہ برابر کی سطح والوں کے درمیان ہی ہوتا ہے، انھی سے ہوتا ہے جن کا کوئی وجود ہو۔

اقبال نے فرمایا تھا

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقیناً مجاہدین نے دنیا کی سب سے بڑی جنگ جیتی ہے۔ ورنہ پہلی جنگ عظیم دیکھیں، آدھی دنیا ایک جانب آدھی دنیا
دوسری جانب۔ دوسری جنگ عظیم کا جائزہ لیں؛ آدھی دنیا ایک جانب، آدھی دنیا دوسری جانب اور یہاں پوری دنیا ایک
جانب اور گنتی کے مجاہدین دوسری جانب۔ البتہ یہود نواز میڈیا، لبرل ذرائع ابلاغ ہمیں کبھی اپنے مجاہدین کی صحیح تصویر نہیں
دکھائیں گے۔ ٹی وی شو پر بیٹھ کر بھونکنے والے یا تو مجاہدین کمیاں کوتاہیاں بیان کریں گے یا پاک فوج کی جڑیں کھودیں
گے۔ یہ غدار لگے بندھے ایجنڈے و منصوبے کے تحت کام کرتے ہیں۔ اور سادہ عوام ان کی خرافات کو قرآن و حدیث جتنی
اہمیت دینے پر تل جاتی ہے۔ بہرحال یہ دکھڑے تو شاید ہمیشہ کا رونا ہیں جو اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتے۔

''شکریہ آپ لوگوں نے ناچیز کو اس قابل سمجھا''

تالیوں کا شور تھمتے ہی اس نے گفتگو کی ابتداء کی۔ اس کی لوچ دار آواز میری سماعتوں کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ مغلظات اور بے ہودہ گوئی سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ ملازموں کی کرسیوں پر بیٹھنے والوں میں ایسی بھی بیٹھا ہے تو یقیناً فخر سے بلند سر جھکنے پر مجبور ہوجاتا۔ اس نے فوج کیوں چھوڑی تھی، یہ تو معلوم نہ تھا البتہ شک تھا کہ اس کے پس پردہ نک سٹیورٹ کی موت تھی۔ میں نے اس کے الفاظ پر کان دھر دیئے۔ ''اور یقیناً مجھے فخر ہے کہ مَیں نے انسانیت دشمن عناصر کی سرکوبی کو بڑی قربانیاں دیں۔ اپنا بہت پیارا دوست بھی کھویا۔ سپاہی نک سٹیورٹ ایک مایہ ناز اور بے مثال سنائپر تھا۔ جونیئر ہونے باوجود وہ میرا استاد تھا، مگر ایک حادثے میں اتفاقاً دشمن کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس سے میں نے کافی کچھ سیکھا تھا۔ ہم دونوں نے دشمن کے گھٹنے لگوا دیئے تھے۔ نک اور لورا براؤن کا نام سن کر ان کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ کیوں کہ جب آپ سنائپر رائفل کا استعمال جانتے ہوں تو اس سے نتائج بھی صحیح اخذ ہوتے ہیں۔

سنائپنگ میں جدید رجحانات نے نشانہ بازی کو سائنس کی شکل دے دی ہے۔ ایک سنائپر جتنا باریک بینی سے گولی چلائے گا اتنی ہی کامیابیاں سمیٹے گا۔ ایک فائرر کو صرف یہ جاننا کافی نہیں کہ اس کا ہدف کتنے فاصلے پر ہے اور اس نے ہتھیار پر کیا رینج لگائی ہے۔ ہوا کی رفتار، موسم کی صورت حال، بلندی یا پستی اور زمین کی کشش یہ تمام عوامل فائر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب فائرر ہزار میٹر سے زیادہ لمبے فاصلے پر فائر کرتا ہے تب یہ عوامل زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ زمین کی مداری گردش کا فائر پر جو اثر پڑتا ہے اسے کیرولس افیکٹ (Coriolis Effect) کہتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ جب کم اونچائی پر فائر کیا جائے تو ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے اس وجہ سے گولی کی رفتار پر اثر پڑتا ہے اور رفتار کم ہوجاتی ہے۔ اونچے علاقے میں ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے اور گولی کی رفتار میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ درجہ حرارت بھی فائر پر بہت اثر ڈالتا ہے۔ یونہی سامنے سے چلنے والی ہوا گولی کی رفتار پر اثر انداز ہوتی ہے اور عقب سے چلنے والی ہوا گولی کو مزید آگے لے جاتی ہے۔ ہوا کے حساب کا ایک فارمولا ہے جسے گرینرز (Greener's) فارمولا کہتے ہیں''

وہ شستہ انگریزی میں فائرنگ کے جدید طریقوں کی وضاحت کرنے لگی۔ عام فہم انداز میں اس نے کافی مفید اور قیمتی معلومات حاضرین کے گوش گزار کی تھی۔ گو میں اپنے استادوں سے بہت تفصیل سے یہ سب سیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود اس کا بھاشن (لیکچر) اچھا لگا۔ بلاشبہ وہ سنائپنگ کے بارے کافی معلومات رکھتی تھی۔ سونے پہ سہاگا اس کا لڑکی ہونا، خوب صورت دپرکشش ہونا اور اس سے بھی بڑھ کر حکمران قوم سے متعلق ہونا تھا۔ تبسم و مسکراہٹ بکھیرتے ہونٹ اور خوش اخلاقی سے لبریز لہجہ مگر میرے دماغ میں اس کے ماضی کے مغلظات اور بے ہودہ گوئی گونج اٹھی۔ انگریزی زبان کی ایسی بہت سی گالیاں تھیں جو پہلی بار اسی کے ہونٹوں سے سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ اردو زبان میں گالیوں کا ذخیرہ انگریزی زبان سے زیادہ ہونے کی غلط فہمی تبھی ہوا ہوئی تھی۔ اور اب اسے قریب سے دیکھ کر لگتا ہی نہیں تھا کہ وہی گالیاں اگلنے کی مشین کھڑی ہے۔

تمہید کے بعد اس نے یو ایس بی لیپ ٹاپ میں لگا کر ''پریزنٹیشن'' کھولی اور فائرنگ کے عملی مظاہرے دکھانے لگی۔ تمام وڈیوز اور تصاویر میں وہ خود ہی نظر آرہی تھی۔ اور ایسی نظر آرہی تھی کہ کسی کے پلے سنائپنگ پڑ رہی تھی یا نہیں، اس کے جسم کے نشیب و فراز، زاویے و قوسیں اور ابھار و گہرائیاں ازبر ہوچکی تھیں۔ کم بخت سنائپر سے زیادہ ماڈل لگ رہی تھی۔ ادھ پون گھنٹے کا درس اختتام پذیر ہوا۔ اور سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ سوالوں کے جواب نہایت اعتماد اور لیاقت سے دیتی رہی۔ اچانک ایک شناسا سا آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں چونک پڑا تھا۔ مہینا بھر پہلے ہی اس کی آواز سنی تھی اور ایک سنائپر کی یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ جلد بھول جائے۔ وہ کرن چاولہ تھا۔

''مادام! آپ نے اپنے بڈی (ساتھی) نک سٹیورٹ کی بڑی تعریف کی ہے۔ کیا بتا سکتی ہیں وہ کس کی گولی سے قتل

بھی اچھا سنا ئپر تھا۔''
...بعد ...مطلب کیا اسے مارنے والا اس سے
...اورا براؤن کی زبان میں پہلی بار رکاوٹ آئی تھی۔ گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر سیاسی انداز

...ضروری نہیں ہوتا کہ قاتل، مقتول سے زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہو۔ کبھی کبھی قسمت بھی ساتھ دے جایا کرتی

...کرن نے اگلا سوال پوچھا۔
''کیا آپ قاتل سے واقف ہیں۔''
...متبسم ہوئی۔ ''نام کی حد تک۔''
''...نے اپنے دوست کے قتل کا انتقام کیوں نہیں لیا؟''
''...میدان جنگ میں دو ملکوں کی دشمنی چلتی ہے انفرادی نہیں۔ اور میدانِ جنگ کے قتل کا بدلہ شہر میں جا کر لینا یقیناً
...اور بہت بڑی زیادتی کہلائے گا۔ باقی نک کی موت کے بعد مجھے واپس آنا پڑا اور دوبارہ افغان محاذ پر نہ جا سکی کہ
...ہمیشہ کو خیرباد کہہ دیا تھا۔''
...کرن چاولہ نے مزید سوال سے گریز کیا تھا۔ ''شکریہ مادام۔''
''...اسے ایس ایس کہتے تھے اور وہ پاکی (پاکستانی) تھا۔''
...ورا براؤن نے جانے کیا سوچ کے سچ اگلا۔
...شال گپتا نے پوچھا۔
''مادام! سب سے اچھی سنائپر رائفل کون سی ہے؟''
...ورا متبسم ہوئی۔ ''جواب تفصیل کا متقاضی ہے۔ اور میرا اگلا سبق (پریزنٹیشن) اسی متعلق ہے۔''
...کسی منچلے کی آواز آئی۔ ''مادام! ہم ہمہ تن گوش ہیں، شروع کریں۔'' یقیناً لورا براؤن جیسی استاد کے ہوتے ہوئے
...بہت کم بخت شاگرد کو ہو سکتی تھی۔ اس کی لوچ دار آواز سماعتوں کی تسکین کا سامان کر رہی تھی تو صورت بصارتوں کو رونق
...بخش رہی تھی۔
''یقیناً، آپ مجھے ایک ڈرنک کا وقت دیں گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے اسٹیج سے نیچے آئی، تب تک ویٹرس نے مختلف
...مشروبات سے بھری ٹرے اس کے سامنے پکڑ لی تھی۔ سنہری مشروب سے بھرا لبوترا گلاس اٹھا کر وہ دھیرندر شکلا کے پہلو
...میں بیٹھ گئی۔ کافی دیر سے چھائی خاموشی ہلکی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ویٹرسوں کو ایک بار پھر چابی لگ گئی
...تھی۔ حاضرین پسند کے مشروب سے دل بہلانے لگے۔ چند ایک ہال کے کونے میں بنے جدید طرز کے غسل خانوں کی
...جانب بڑھ گئے تھے۔
اس چھت کے نیچے کم از کم میرے دو جانی دشمن موجود تھے۔ اگر لورا براؤن کے دل میں بھی کوئی میل تھا تو دشمنوں کی
...گنتی تین گنی جا سکتی تھی۔ البتہ میں صرف دھیرندر شکلا کی جان کے درپے تھا۔ کرن چاولہ اور لورا براؤن سے مجھے کوئی غرض
...نہ تھی۔
ہلکی ہلکی چسکیاں لے کر لورا براؤن نے گلاس خالی کیا اور دوبارہ روسٹرم کی طرف بڑھ گئی۔ حاضرین میں زیادہ تر کی
...نگاہیں اس کی چست پتلون کی سلائی پر غور کر رہی تھیں، شاید ڈیزائن زیادہ پسند آیا تھا۔ ان کی پرشوق نگاہیں دیکھ کر میں
...ظاہر کر رہا ہوں، ورنہ کسی اور وجہ کا ہونا بھی ممکن ہے۔

جب ہلکی نئی لغری گولی کا حجم کم ہوتا ہے اس لیے اس پر ہوا کا اثر کم پڑتا ہے لیکن وہ وزن میں ہلکی ہوتی ہے کہ ہوا سے
خلاف مزاحمت کم ہوتی ہے۔ اور لمبے فاصلے پر جب گولی کو تین چار سیکنڈ ہوا میں رہنا پڑے تو گولی کا ہدف سے دور ہونے کا
امکان بڑھ جاتا ہے۔ ایس آر ون کی گولی (بلٹ) میں اس الجھن کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 7.12 ایم ایم کے
مقابلے میں 9.11 ایم ایم حجم، کافی کم ہے۔ اور وزن بڑھانے کو لیڈ (سیسہ) کے بجائے لیڈ ایٹیمنی کا استعمال کیا گیا
ہے۔ یوں گولی ... ٹیکنیکل باتیں دہرانے لگی۔ ایسے کئی سبق میں امریکہ میں اور اپنے استادوں سے پڑھ چکا
تھا۔ یہ ساری باتیں پہلے سے جانتا تھا۔ (یہ طوالت کے خوف سے میں پورا لیکچر درج نہیں کر رہا کہ قارئین
کا شوق کہانی کے ساتھ ہے۔ اور میرا ابھی یہی خیال ہے ہمیں کہانی تک ہی محدود رہنا چاہیے) SR1 کی مزید
خوبیاں گنوانے کے بعد اس نے آخر میں انکشاف کیا۔ "اتنی خصوصیات کی حامل رائفل کا وزن صرف ساڑھے آٹھ کلوگرام
ہے۔ سترہ سے پچیس کلوگرام وزن والی رائفل کی مار دو کلومیٹر تک ہوتی ہے۔ اور SR1 کئی کلوگرام کم وزنی ہونے کے
باوجود ڈھائی کلومیٹر تک آسانی سے مار کر لیتی ہے۔ اس کی ٹیلی اسکوپ سائیٹ بھی خصوصی طور پر تیار کی گئی ہے جس کی دیکھنے کی
طاقت عام انسانی آنکھ سے تیس گنا زیادہ ہے۔ یقیناً اس کی خریداری کی مد میں زیادہ خرچ ہونے والی رقم کا اعتراض اس کی
خوبیوں تلے دب جائے گا۔"

جانن کے اختتام پر حاضرین نے تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اگر رائفل میں واقعی وہی خوبیاں موجود
تھیں جو اس نے گنوائی تھیں تو یقیناً وہ لاجواب رائفل تھی۔ وہ پیک بھی بہت چھوٹے سے جھولے میں ہو جاتی تھی کیوں کہ
رائفل کی لمبی بیرل دو حصوں میں کھولی جاسکتی تھی۔ عموماً سنائپر رائفلوں کی بیرل میں جوڑ نہیں ہوتا۔ مگر SR1 اور بہت سے
انکشاف کے ساتھ یہ خصوصیت بھی رکھتی تھی۔

اگلے مرحلے میں اعلان ہوا کہ لورا براؤن ایس آر ون سے فائر کا عملی مظاہرہ کرے گی۔ شوٹنگ کلب کی اپنی فائرنگ
رینج موجود تھی، جہاں پندرہ سو میٹر تک فائر کیا جاسکتا تھا۔ ہال کی بغل ہی میں اس کا دروازہ تھا۔ حاضرین اس طرف بڑھ
گئے۔ ایک چھوٹا سا پیک لورا براؤن نے کندھے پر لٹکایا ہوا تھا جو ایک ملازم نما شخص نے بااصرار لینے کی کوشش کی مگر
لورا نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

دروازے سے نکلتے ہی جدید طرز کی لمبی رینج نظر آئی۔ جہاں ہر سو میٹر کے فاصلے پر ہدف لگے تھے، جنھیں، فائرنگ
اڈوں سے کنٹرول کر کے سیدھا یا دائیں بائیں کیا جاسکتا تھا۔

ایک اڈے پر اکڑوں بیٹھ کر لورا نے جھولا کھولا اور مہارت سے رائفل کے پرزے جوڑنے لگی۔ بیرل کو درمیان
سے جوڑنے کو چوڑیاں لگی تھیں اور وہ جگہ باقی بیرل سے دگنی موٹی تھی۔

رائفل کو دو پائی پر لگا کر وہ پیچھے لیٹ گئی۔ اور تب نظارا کرنے والوں کی اکثریت شش و پنج میں پڑ گئی تھی کہ رائفل کو
دیکھیں یا رائفل والی کو۔ میں البتہ حسرت بھری نظروں سے ایس آر ون کو گھور رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہوگئی
تھی یوں جیسے عاشق کے دل میں محبوب کو چھونے کی تمنا مچلتی ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ لورا کو دھکا دے کر خود رائفل
کے پیچھے لیٹ جاتا۔

لورا نے میگزین میں گولیاں بھر کر ہزار میٹر پر ہدف کو سامنے کیا، ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے ایلی ویشن ڈرم کے ساتھ
چھیڑ خانی کی اور شست لے لی۔ اس کا دایاں ہاتھ پسٹل گرپ پر تھا اور دو پائی کی وجہ سے بایاں ہاتھ آگے پھیلنے کے بجائے
اس نے اپنے گال سے آگے ٹیکا تھا۔ چند سیکنڈ شست لے کر اس نے لبلبی دبائی ہلکی سی "ٹھک" ہوئی جو اس کے دعوے
تصدیق کر گئی تھی کہ رائفل کی بیرل پر عمدہ سائیلنسر جڑا ہوا ہے۔

ہدف کیمرے کی زد میں تھا اور بڑی سی سکرین پر واضح نظر آ رہا تھا۔ گولی ہدف کے درمیان، چندی میں ...
تھی۔ تمام نے بے ساختہ تالیاں بجائی تھیں۔ وہ گولیاں اس فاصلے سے فائر کر کے لورا نے پندرہ سونیڈ تک ہدف ...
مسلسل تین گولیاں ہدف پر ہٹ کیں۔ اور زبردست داد وصول کرتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔
اس نے دعوت دی۔ ''اگر کسی کو فائر کا شوق ہو تو پورا کر سکتا ہے۔''
میرا دل آگے بڑھنے کو مچلا، مگر لورا نے یہ دعوت معززین کو دی تھی ان کے ملازموں کو نہیں۔
ایک عرب شیخ خوشی سے چہکتے ہوئے آگے بڑھا، نا معلوم حضرت کو لورا کی قربت کا شوق تھا یا ... میں ...
شیدائی تھا۔ یوں بھی شیخوں کی انگریزی بولنے کی استعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ تبھی اس نے ترجمان ساتھ ... رکھا
تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ عربی زبان پر فخر کرنا ہے۔ ان کے نزدیک عربی زبان کا مقابلہ کوئی زبان نہیں کر سکتی۔ اور یہی ...
بھی اعتقاد ہے۔ باقی یہ بھی حقیقت ہے کہ آزاد اقوام کی پہلی ترجیح ہمیشہ اپنی زبان ہوتی ہے۔ جتنی بڑی قومیں ہیں ...
انگریزی بولنے کو سخت معیوب سمجھتے ہوئے اپنی زبان میں گفتگو کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ جن میں چائنہ، فرانس، عرب ...
سرفہرست ہیں۔ اور ہماری طرح (یعنی انڈیا، پاکستان) غلام اقوام جو آج بھی برطانیہ کی قید سے ذہنی طور پر آزاد نہیں ہو
سکیں۔ ہم نہ صرف انگریزی کی برتری تسلیم کرتے ہیں بلکہ جن خواتین و حضرات کو جتنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی ہے وہ بھی
پھیلائے اس کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ ٹی وی اینکر اردو پروگراموں میں ساٹھ فیصد انگریزی بولتے ہیں۔ حد یہ کہ اردو
ناول نگاروں کی اکثریت جن میں خواتین ناول نگار پیش پیش ہیں ان کی اولیں ترجیح انگریزی قابلیت کا اظہار ہوتا
ہے۔ اور ان کی تحاریر پڑھ کر ایسی ذہنی کوفت ہوتی کہ چند سطروں سے زیادہ پڑھنا کار دار ہو جاتا ہے۔ جس طبقے نے اردو
کی خدمت کرتے ہوئے عوام میں اردو کی ترقی و ترویج کا کام کرنا تھا ان کی یہ حالت ہے تو عام لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ اردو
بے چاری کا تو حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا ہے۔ اللہ پاک ہی ہمارے حال پر رحم کرتے ہوئے ہمیں صحیح سمجھ اور اردو سے محبت کا
ذوق عطا فرمائے۔

لورا براؤن نے اس کی حالت (پوزیشن) درست کی، یقیناً اس کا وہ التفات کئی اوروں کو فائرنگ کی دعوت دینے والا
تھا۔

شیخ نے چار سو میٹر سے ہدف کو نشانہ بنایا اور خوشی سے چہکتا واپس لوٹا۔ اس کے بعد کافی لوگوں نے ارادہ ظاہر کیا مگر
شکلا نے وقت کی کمی کا اعلان کر کے واپس چلنے کو کہا۔
تمام ہال میں لوٹ آئے تھے۔ تب خریداری کے شوقین حضرات اپنی مانگ بتانے لگے۔ وشال گپتا کو بھی
خریداروں کی صف میں دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی تھی۔
دھیرندر شکلا چند لمحے مزید گزار کر چلا گیا تھا۔ میں حسرت بھری نظروں سے اپنے شکار کو گھورتا رہ گیا۔ جو اتنے قریب
... تھی کہ لورا براؤن کے التفات کا بہاؤ اس کی جانب زیادہ رہا۔ باقی حضرات ذاتی شوق کی خاطر ایک دو رائفلوں سے
... آ کر لوٹ گیا تھا۔ لورا کا بھی سب سے بڑا گاہک وہی تھا، کیوں ہندوستانی فوج کے لیے اسی نے خریداری کرنا تھی۔ اور یہی
... دہ خریدنے میں دلچسپی نہ لیتے۔ البتہ ان میں اسلحے کی تجارت والے شاید چند ہتھیار خرید لیتے۔ لورا کافی دیر لوگوں میں
... ی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر تسلسل سے دل آویز مسکراہٹ کھلتی رہی۔ اسے کمپنی نے خوب تربیت دے کر بھیجا تھا کہ
... کان دار (سیلز وومن) کا گاہکوں سے کیا رویہ ہونا چاہیے۔ یقیناً لورا کی موجودگی تک بھیڑ چھٹنے والی نہیں تھی۔ زیادہ تر
... ے عشائیے (ڈنر) کی دعوت دے رہے تھے ... انکشاف ہوا کہ اس کا آج کا عشائیہ عرب شیخوں کے ساتھ

لورا براؤن جب رخصتی کے ارادے سے اٹھی تو وشال گپتا بھی اس کے ہمراہ ہولیا تھا۔ پارکنگ میں جب وہ اپنی قیمتی کار کے ساتھ رکی، تب وشال گپتا نے مجھے آنکھ کے اشارے سے دروازہ کھولنے کا حکم صادر فرمایا اور میں نے ادب سے دروازہ کھول دیا۔ مجھ پر سرسری نگاہ ڈال کر اس نے حاکمانہ انداز میں سیٹ سنبھال لی تھی۔ ظالم نے ہلکے سے تبسم کی سوغات دینا بھی گوارا نہ کیا۔ اور دیتی بھی کیسے کہ میں شکل وصورت میں انوکھا تو نہیں تھا۔ مجھ سے بہتر کئی امراء اس کے آگے پیچھے دم ہلا رہے تھے تو ایک نچلے درجے کے ملازم کو وہ خاک گھاس ڈالتی۔

وشال گپتا آخری وقت تک اس سے ملاقات طے کرنے کی کوشش میں مصروف رہا مگر وہ ہنس کر ٹال گئی تھی۔ بلاشبہ اپنی دعوتوں کا فیصلہ اس نے کاروباری فوائد کو مدنظر رکھ کر ہی کرنا تھا۔

—— ● ——

وشال گپتا کو مایوس لوٹنا پڑا۔ البتہ یہ کہہ کر اس نے مجھے خوش کر دیا تھا کہ اس نے ایس آر ون رائفل خریدنے کا فیصلہ
کرلیا تھا۔ گو وہ اسلحے کی اسمگلنگ کرتا تھا، مگر اتنی مہنگی سنائپر رائفل وہ کاروباری نقطہ نظر سے نہیں خرید سکتا تھا۔ دہشت گرد
اور حکومت مخالف ٹولوں میں عام ہتھیاروں، خصوصاً پستول، کلاشن کوف وغیرہ کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔ سنائپر رائفلیں کم
پسند کی جاتی ہیں۔ اس کی وجوہات میں ایک تو مہنگا ہونا ہے۔ دوسرا سنائپر رائفل ہر شخص استعمال بھی نہیں کر سکتا۔ تیسرا
ایمونشن عام رائفلوں سے بہت زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ چوتھا یہ صرف مخصوص مقاصد کو استعمال ہوتی ہیں۔ گو آج کل صورت
حال تبدیل ہو رہی ہے کہ دہشت گرد بھی جسمانی حملوں سے زیادہ دور سے فائرنگ کو زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ خصوصاً
پاک افغان سرحد پر تو دہشت گرد سنائپروں کی بڑی تعداد پاک آرمی کے خلاف مصروف نظر آتی ہے۔ یوں بھی مخصوص مقاصد
کے لیے ملک دشمن تنظیمیں بھی اس سے بے بہرہ نہیں ہو سکتیں۔ البتہ یورشی ہتھیاروں (اسالٹ رائفلوں) کی مانگ سنائپر
رائفل سے زیادہ ہوتی ہے۔

''تم نے کبھی سنائپر رائفل استعمال کی ہے۔'' دوران گفتگو اس نے اچانک پوچھا۔

''پہلے آپ سنائپر رائفل کی وضاحت تو کریں۔'' میں نے معصومانہ لہجے میں پوچھا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میرا خیال ہے تم بھاشن سننے کے بجائے گوری کے خدوخال میں گم تھے۔''

میں نادم ہوا۔ ''اس کی باتوں سے تو یہی اندازہ ہوا کہ لمبے فاصلے پر مار کرنے والی رائفل کو سنائپر رائفل کہتے ہیں۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ راجیو تمھارے پستول کے فائر کی کافی تعریف کر رہا تھا، کوشش کرو شاید رائفل بھی اچھی چلا
سکو۔''

''جی باس۔'' میں خوش دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب اسے کیا بتاتا کہ حضور سنائپر رائفلیں مجھے اتنی ہی عزیز ہیں
جتنی پلوشے پیاری ہے۔ مگر وہ کم بخت نہ تو میرا مزاج آشنا تھا اور نہ پلوشے سے واقف تھا کہ دشمن جاں کیا بلا ہے۔

اس نے فراخ دلی سے ارادہ ظاہر کیا۔ ''موقع ملا تو تمھیں سکھاؤں گا۔''

میں نے حقیقی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انسان کو اپنے مشغلے کے بنا زندہ رہنا دشوار لگتا ہے۔ سنائپر رائفل
سے جدائی کو کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اور صرف پلوشہ کی موجودگی ہی میں سنائپر رائفل سے دوری برداشت کی جا سکتی تھی۔

اگلے دن سہ پہر کو گھر لوٹتے وقت وشال نے شام کی دعوت کا بتا دیا تھا۔

''ٹھیک ہے باس۔'' میں نے خوش دلی سے سر ہلا دیا۔ ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے اسے اندرونی عمارت کے سامنے
تارا اور کار کو گیراج میں کھڑا کرنے لے گیا۔ باقی محافظ اپنی جیپ کو براہ راست گیراج میں لے آئے تھے۔ کار کو قفل
کے میں ان کے پیچھے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اجیت سنگھ اور موہن سنگھ ایک کمرے رہتے تھے، جبکہ مجھے مہمان خانہ چھوڑ
شنکرداس کے ساتھ منتقل ہونا پڑا تھا۔

دوہرا ہو کر رہ گئی۔ وہ دھڑام سے پیٹھ کے بل گرا۔ لیٹے لیٹے ہی اس نے اپنی آزاد ٹانگ پیچھے کھینچی، مجھے ایک دم اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا کیا ارادہ ہے۔ جونہی اس کی ٹانگ دباؤ سہے سپرنگ کی مانند آگے بڑھی۔ میں نے فوراً اس کی دوسری ٹانگ کو گرفت سے آزاد کر کے لوٹ لگائی۔ ٹانگ کے میری گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے توازن برقرار رکھا تھا۔ سہارا چھوٹتے ہی وہ دوبارہ نیچے گرا اور اس سے پہلے کہ اٹھ پاتا میں نے اسے چھاپ لیا تھا، اس کی چھاتی گھٹنوں سے دباتے ہوئے میرے ہاتھ مشینی انداز میں مسلسل چلنے لگے۔ پہلے چند مکے اس نے کہنیوں پر سہارے تھے لیکن جونہی اس نے دائروی مکے کھائے اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ اسی وقت اجیت سنگھ نے مجھے عقب سے تھام کر پیچھے کھینچنے کی کوشش کی، میں نے ایک دم کہنی اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔

''اُف...'' کی آواز کے ساتھ وہ رکوع کے بل نیچے جھکا۔ اس کی گرفت میرے جسم سے ہٹ گئی تھی۔ پیچھے مڑتے ہوئے میں نے مخصوص انداز میں گھٹنا اٹھایا جو اس کی ٹھوڑی پر لگا تھا۔ کولہوں کے بل نیچے گرتے ہوئے وہ لمبا پڑ گیا۔

میں تیسرے مخالف موہن سنگھ کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں اپنے ساتھی کی درگت بنتے دیکھ کر وہ مشتعل ہو کر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح حرکت میں آ چکا تھا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے بازو گھمایا، نشانہ میری کنپٹی تھی۔ گھٹنوں میں خم دے کر میں نیچے جھکا، اس کا مکا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ وہ ہلکا سا لڑکھڑایا اور اس سے پہلے کہ سنبھلتا، میرا دایاں گھونسا ٹھیک اس کی پسلیوں کے نیچے بائیں جانب لگا۔ باکسنگ کی زبان میں اسے ''انڈر کٹ'' کہتے ہیں۔ باکسر کو پچھاڑنے (ناک آؤٹ) کو یہ تیر بہ ہدف مکا ہے۔ چند لمحوں کو انسان کے حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ ٹھوڑی کے بالکل نچلے کنارے پر دائروی مکا مارنا اور پسلیوں کے نیچے بائیں جانب اندر و اوپر کی جانب مکا اٹھانے سے مخالف تھوڑی دیر کو حواس کھو دیتا ہے۔ حالاں کہ باکسنگ گلاؤز بھی ہاتھوں پر چڑھے ہوتے ہیں جن میں فوم استعمال کر کے مکے کی سختی کو کم کیا جاتا ہے۔ اور اس وقت تو میرے ہاتھ ننگے تھے اس لیے اثر بھی زیادہ ہوا تھا۔

منہ سے زوردار ''اوغ......'' نکالتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل گر کے دوہرا ہو گیا۔ شور سن کر راجیو اور ایک دوسرا شخص کمرے سے باہر نکلے۔

''یہ سالا کاہے کا جھگڑا شروع ہے۔'' پریشانی سے کہتے ہوئے وہ شنکر کے قریب ہوا۔ ''ابے کوئی کھلاس تو نہیں ہو گیا۔ مونے بھاگ کے باس کو بلا لا کوئی بڑی گڑبڑ چل رہی ہے۔''

مونا بھاگ پڑا تھا۔ راجیو شنکر کا چہرہ ہلا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اطمینان سے کھڑا رہا۔ شنکر نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور راجیو، اجیت سنگھ کی طرف بڑھ گیا۔ موہن بھی گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالنے لگا۔ وشال گپتا کے آنے تک تینوں بیٹھ گئے تھے۔

''کیا ہو رہا ہے۔'' وشال گپتا قریباً بھاگتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''کچھ نہیں باس، انھی کوئی غلط فہمی ہوئی تھی، دور کر دی ہے۔''

مجھ پر خفگی بھری نگاہ ڈال کر اس نے شنکر سے پوچھا۔ ''تم بتاؤ، کیا ہوا۔''

''کک...... کیا بتاؤں باس؟'' وہ گڑبڑا گیا تھا۔

''تیری ماں کا سر!'' وشال دھاڑا۔

اجیت بولا۔ ''باس! سندیپ نے ہماری بے خبری میں حملہ کر کے ہمیں چوٹ پہنچائی۔''

وشال نے مجھے گھورا...... میں صفائی دینے لگا۔ ''باس یہ آپ کے التفات کو غلط نام دے رہے تھے۔ ان کے تئیں میں آپ کی حفاظت کے قابل نہیں ہوں اور آپ نے فقط میرا احسان اتارنے کو محافظ کی ذمہ داری سونپی ہے۔ تبھی میں نے

شنکر کو چنوتی دی، اس نے حملہ کیا۔ باقی دو نے بھی بجائے انہیں چھڑانے کے شنکر کا ساتھ دیا اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔''

موہن بولا۔ ''باس اس نے بے خبری میں حملہ کیا۔''

وشال کے ہونٹوں پر تبسم ابھرا۔ ''چلو اب لڑلو۔''

موہن نے ندامت سے سر جھکا لیا تھا۔ میرے ایک دو مکوں نے انھیں باور کرا دیا تھا کہ میرے بارے ان کے اندازے ٹھیک نہیں تھے۔

''سندیپ! آئندہ ایسی بے ہودگی برداشت نہیں کروں گا...... اور تم تینوں کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وشال گپتا کسی کا احسان اتارنے کو اسے اپنی جان نہیں سونپ سکتا۔ سندیپ کو لڑتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ اس میدان میں نیا ہے لیکن لڑنے کا فن جانتا ہے۔ مخلص ہے اور احسان فراموش نہیں تبھی اس ذمہ داری کا اہل سمجھا ہے۔ کسی کو اعتراض ہے تو مجھ سے بات کرے۔ اب دفع ہو جاؤ اپنے کمروں میں۔'' وہ واپس مڑ گیا۔

راجو، موہن سنگھ کو سہارے دے کر اٹھانے لگا۔ میں نے قدم بڑھا کر شنکر کی طرف ہاتھ لمبا کیا۔ مجھے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ دور دھکیلا۔

میں معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''شما کر دو یار! بھائیوں میں ایسی لڑائیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ آج میرا تکا لگ گیا، کل آپ میری پٹائی کر دیں گے...... ایک ساتھ رہتے ہوئے یہ تو چلتا رہے گا۔''

ایک دم اس کا موڈ تبدیل ہوا۔ ہلکی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھاما اور کھڑا ہو گیا۔ میں نے فوراً اسے گلے سے لگایا اور پھر اجیت کی طرف مڑ کر بازو پھیلا دیے۔ لڑائی کی ابتداء شنکر اور میرے درمیان ہوئی تھی، ہمیں راضی بہ رضا دیکھ کر ان دونوں نے خفگی ختم کر دی تھی۔ سکھ ویسے بھی یار باش قوم ہے۔ دماغ سے زیادہ دل کی سنتے ہیں۔ یقیناً کسی پر اپنی برتری ثابت کر کے عاجزی و ندامت کا اظہار کرنے پر خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اب ان کے دلوں میں میری دھاک بیٹھ گئی تھی۔ پہلے مجھے کمتر سمجھ کر وہ کسی خاطر نہیں لاتے تھے اور اب ایک ساتھ تینوں کی ٹھکائی کر کے میں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کی جسامت اور لمبے قد میرے نزدیک کسی اہمیت کے حامل نہیں تھے۔ تبھی انھوں نے خوش دلی سے سب کچھ بھلا دیا تھا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے شنکر سے پھر معافی مانگی تھی۔ ''آپ بڑے بھائی ہیں۔ اور غلطی میری تھی۔ مجھے یوں مشتعل نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''کوئی بات نہیں یار۔'' شنکر نے خوش دلی سے میری پیٹھ تھپکی۔ ''مجھے تو بس باس کی فکر تھی کہ جس کا دیا کھاتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو وقت آنے پر خدمت کا حق ادا نہ کر سکیں۔ اب تمھاری لڑنے کی صلاحیت دیکھ کر مجھے فکر نہیں رہی۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''بس تکا ہی لگ گیا تھا۔ اگر آپ کا بھاری گھونسا میری کنپٹی پر لگ گیا ہوتا تو شاید کل تک ہوش نہ آتا۔''

شنکر کھل کھلا کر ہنسا۔ ''لڑائی بھڑائی میں تو بس داؤ چلنے کی بات ہوتی ہے۔''

''صحیح کہا بھائی۔'' میں نے تائید میں سر ہلا دیا تھا۔ اب اتنا بچہ تو وہ بھی نہیں تھا کہ اسے معلوم نہ ہوتا کہ تکا کسی ایک شخص کے خلاف تو لگ سکتا ہے ایک ساتھ تین افراد پر اتفاقی داؤ کیسے چل سکتا ہے۔ لیکن ایسا باور کرا کے میں کیے کرائے پر پانی نہیں پھیر سکتا تھا۔

اس نے موضوع تبدیل کیا۔ ''آج تو کافی دیر لگا دی۔ کوئی خاص پروگرام تھا شاید۔''

رخصت کرنے کو باس باہر آیا تھا۔"
"وہ گوری دیکھی تھی نا جسے... شنکر نے اوباشانہ انداز میں قہقہہ بلند کیا۔
"اس کے علاوہ وہ دیکھنے کو تھا ہی کیا۔ اس کے بارے انگریزی میں کمنٹ کرلی ہی۔ بہتر
"اس کے علاوہ وہ ... رائفل لائی ہوئی تھی۔ اسی کے بارے انگریزی میں کمنٹ کرلی تھی۔
"لمبے فاصلے تک مار کرنے والی رائفل بازار میں لانا چاہتی ہے۔"
بہت میری سمجھ آیا، وہ نئے قسم کی رائفل بازار میں لانا چاہتی ہے... شنکر کے استفسار نے میرے دل کی دھڑکن تیز...
"دھیریندر شکلا صاحب بھی اسی گوری کو ملنے آئے تھے۔"
تھی۔ انجانے میں وہ میرے دل پسند موضوع پر آ گیا تھا۔
"دھیریندر شکلا کون ہیں؟" میں نے مصنوعی حیرانی ظاہر کی۔
"تم شکلا صاحب کو نہیں جانتے، وہ باس کا بھی باس ہے۔" اس بار شنکر مجھے حقیقت میں حیران کرنے میں کامیاب

گیا تھا۔
"باس کا باس۔" میں بوکھلا گیا تھا۔
وہ میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ "راجپوت دادا، دھیریندر شکلا صاحب کے کاروباری ساتھی (بزنس
پارٹنر) ہیں۔ اور راجپوت دادا تو صرف ممبئی کا بڑا دادا ہے۔ شکلا صاحب بین الاقوامی دادا ہیں۔ بہت بڑے اور اونچا یا ...
والے شخص ہیں۔ سرکاری طور پر بھی پہنچی ہوئی شخصیت ہیں۔ فوج سے کوئی جنرل، کرنل ریٹائرڈ تھا۔" بے چارہ فوجی
عہدوں کو نہیں جانتا تھا تبھی جرنیل کو کرنل کے درجے تک لے آیا تھا۔ ورنہ کرنل کا عہدہ جنرل سے بہت نیچے ہوتا ہے۔
"یہ وہی موصوف ہوں گے جس کے ہمراہ چار کالے سوٹوں والے محافظ تھے۔ باقیوں سے اسلحہ جمع کر لیا گیا تھا لیکن
اس کے محافظوں کے پاس گنیں موجود تھیں۔"
"بالکل وہی۔" شنکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
میں نے اپنی سادگی ظاہر کی۔ "میں نے تو کوئی عام کاروباری شخص سمجھا تھا۔"
شنکر نے میری بے وقوفی پر قہقہہ بلند کیا۔ "اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ اسے قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اور یہ کہ باس
کی وجہ سے تھا ورنہ ہم جیسے اسے دور سے بھی نہیں دیکھ سکتے۔"
"صحیح کہہ رہے ہو بھیا۔" اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے میں دھیریندر شکلا کے بارے مزید کریدنے لگا۔ گو
طبیعت جھاڑنے کے چکر اور مجھے متاثر کرنے کے شوق میں میری معلومات میں کافی اضافہ کرتا رہا۔ بھولے پن اور انجان
بننے کا ناٹک کر کے میں نے اس سے کافی کچھ اگلوا لیا تھا۔ یوں کہ دھیریندر شکلا کی ذات سے متعلق میرا شوق ظاہر ہونے کے
بجائے فطری تجسس لگے۔ شنکر اس کی ممبئی میں بنی محل نما کوٹھی کو دیکھ چکا تھا۔ اس کی بیویوں اور اولاد وغیرہ کے بارے استفسار
پر کوئی خاص سراغ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ خاص کر پرما انصاری کے بارے تو شنکر بالکل لاعلم تھا۔ لیکن اتنی معلومات بھی بہرحال
کافی تھیں۔ اپنے اپنے بستر پر لیٹے ہم گپ شپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شنکر کو نیند آنے لگی۔ چوں کہ رات گئے تک
جاگنا پڑتا تھا اس لیے ہم سہ پہر کو تھوڑی دیر آرام کر لیتے تھے۔ شنکر کی جان بخشی کر کے میں نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لی
تھیں۔

اٹھ کر غسل کر کے تازہ دم ہوئے۔ اور کھانا کھا لیا کہ وشال گپتا کسی بھی وقت بلا سکتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم گپ شپ
کرنے لگے۔ موہن سنگھ اور راجیت سنگھ کا رویہ بھی بہت بدلا ہوا تھا۔
پھر شنکر کے مشورے پر ہم تاش کھیلنے لگے۔ یہ ایسا کھیل ہے جو مجھے کبھی کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ
... گیا تھا۔ البتہ معدے کی خرابی کا بتا کر میں نے شراب پینے سے معذرت کر لی تھی۔ ورنہ وہ تینوں

بحاشا پینے والے تھے۔

اندھیرا گہرا ہوتے ہی وشال کا بلاوا آ گیا تھا۔ ہم باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں جیپ میں اور میں باس کے ہمراہ کار میں بیٹھ کر ٹھکانے سے نکل آئے تھے۔ مجھے جانے کی سمت کا بتا کر وشال گپتا نرم لہجے میں نصیحت کرنے لگا۔

''تم اکیلے ہو اور وہ تین ہیں۔ تمہیں جھگڑا مول لینے میں احتیاط برتنا چاہیے تھی۔ دشمنی میں لوگ بہت کچھ کر جاتے ہیں خاص کر اس وقت جب اتنی قربت ہو۔ کوشش کر کے صلح کر لو۔ یہ نہ ہو وہ میری لاعلمی میں تمہیں نقصان پہنچا دیں۔''

''جی باس۔'' میں نے سعادت مندی ظاہر کی۔ ''تینوں سے معافی مانگ لی ہے۔ اور اب ہمارے تعلقات کافی بہتر ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں ان سے تاش بھی سیکھتا رہا ہوں۔ بلکہ دو سو روپے ہارنے پڑے کہ یہ کھیل میرے لیے نیا ہے۔''

وشال نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''سمجھدار ہو۔ آگے تک جاؤ گے۔''

''آپ کی آشرباد چاہیے باس۔ بھگوان کی کرپا سے اتنی جلدی مار نہیں کھاؤں گا۔ کم عمری ہی سے ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے۔''

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

ہم گھنٹے بھر بعد ایک عالی شان کوٹھی کے دروازے پر پہنچے۔ کوٹھی کیا پورا محل تھا۔ جانے کیوں مجھے لگا وہ دھیرندر شکلا کی ہوگی ہے۔ لیکن میں نے وشال گپتا سے پوچھنے کی کوشش نہ کی کہ یہ مناسب نہیں تھا۔ اگر واقعی وہ شکلا کی رہائش گاہ تھی تو تھوڑی دیر بعد حقیقت سامنے آ جانا تھی۔

دعوت کا اہتمام کوٹھی کے سبزہ زار میں کیا گیا تھا۔ شکر لوگ پارکنگ ہی میں رک گئے تھے۔ میں وشال گپتا کے ہمراہ اندر پہنچا تو سرخ بجری کی روش پر سبزہ زار کے بالکل آغاز میں ''واک تھرو گیٹ'' (ایسا دروازہ جس سے گزرتے وقت اگر آدمی کے پاس دھات کی بنی اشیاء ہوں تو سیٹی بجنے لگتی ہے) رکھا ہوا تھا۔ وہیں ایک جانب بڑی میز رکھی تھی جس پر تمام مہمان اپنا اسلحہ وغیرہ رکھوا رہے تھے۔ یہ منظر بھی میرے اندازے کو تقویت دے گیا تھا کہ وہ دھیرندر شکلا ہی کی رہائش تھی۔ پستول جمع کرا کے میں نے ٹوکن لیے اور وشال گپتا کے عقب میں چلتا ہوا اندر پہنچ گیا۔ یہ ایک مخلوط تقریب تھی۔ مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ میں عادت کے برخلاف لڑکیوں کو تاڑنے لگا۔ ممکن تھا کہ پرما انصاری دکھائی دے جاتی۔ مگر وہاں اکثریت خواتین کی تھی ایک دو لڑکیاں ہی نظر آئی تھیں، ان کی عمر بھی میرے اندازے میں پرما انصاری سے زیادہ تھی۔ اور شکل بھی انصاری صاحب کے بتائے ہوئے حلیے سے کافی مختلف تھی۔ ایک لڑکی کے بال کافی لمبے اور آنکھیں موٹی تھیں۔ دوسری گہرے سانولے رنگ کی تھی۔ جبکہ تیسری کا قد ضرورت سے زیادہ لمبا تھا۔

وشال گپتا مختلف لوگوں سے علیک سلیک کرنے لگا۔ میں آنکھوں پر کالی عینک چڑھائے اس کے عقب میں چلتا رہا۔ اس کا بڑا بھائی راجپوت داوا بھی وہاں آیا ہوا تھا۔

یک لخت لوگوں میں ہلچل مچی۔ مڑ کر دیکھنے پر لورا براؤن نظر آئی۔ آج تقریب کی مناسبت سے اس نے خوب صورت سوٹ زیب تن کیا تھا۔ اب میں تو اس لباس کا نام ہی نہیں جانتا۔ میں صرف شلوار قمیص، ساڑھی اور پتلون کوٹ کا نام جانتا ہوں۔ سفید رنگ کا جسم سے چپکا ہوا ایسا لباس جس کا گلا اتنا کھلا ہو کہ عورت کے اندرونی لباس کی جھلک واضح نظر آئے۔ کمر پر صرف دو تسمہ نما لڑیاں جو لباس کو نیچے گرنے سے بچانے کو سہارا دیں۔ اور کمر وہاں تک برہنہ کہ اس سے آگے خطرے کی حدود شروع ہو جاتی ہو۔ ایک ٹانگ ران سے تھوڑا اوپر تک عریاں اور دوسری گھٹنے سے نیچے تک ڈھکی ہو۔ بازو کا کپڑا کلائیوں تک آئے مگر ایسا باریک اور چپکا ہوا کہ نہ تو بازو کی ہیئت چھپائے اور نہ رنگت۔ بہر حال لباس کا نام نہ جاننے کی وجہ سے مجھے اتنی وضاحت کرنا پڑی۔

کافی لوگ اس کے ہاتھ کی نرمی جاننے کو قریب سٹ گئے تھے۔ متبسم چہرے کے ساتھ ہر ملنے والے سے مصافحہ
کرتے ہوئے اس نے ایک صوفے پر نشست سنبھال لی۔ اس اکٹھ میں چند ایسے بھی تھے جنھوں نے اسے بالکل اہمیت
نہیں دی تھی۔ ان میں ایک راجپوت دادا بھی تھا کہ ایک صوفے پر بیٹھا شراب سے شغل کرتا رہا۔ وشال البتہ اس کے
سامنے بچھا بچھا جارہا تھا۔

سب سے آخر میں منحوس شکل شکلا کی آمد ہوئی تھی۔ اس کے پہلو میں چلنے والی لڑکی کو دیکھ کر میرا دل زور سے
دھڑکا۔ یہ دھڑکنا خدانخواستہ محبت یا اس کی شکل سے متاثر ہونے کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اپنا ہدف ملنے کی خوشی تھی۔ کمانے
قامت، سانچے میں ڈھلا متناسب بدن، کندھوں کو چھوتے سنہرے ریشمی بال، معصوم چہرہ، آنکھوں میں دنیا جہاں کی شوخی
، ہونٹوں پر خوب صورت مسکراہٹ بکھیرے وہ سچ مچ پری لگ رہی تھی۔ وہ انتہا کی خوب صورت نہیں تھی، مگر بے پناہ موہنی
ضرور تھی۔ ایسی لڑکی جسے دیکھ کر بے ساختہ پیار آجائے۔ میں فوراً ہی پرما انصاری کو پہچان گیا تھا۔ اس کا لباس بھی لورا
براؤن سے کم نہیں تھا۔ آدھی رانوں تک آتا ہوا سکرٹ، کمر کا بالشت بھر کا علاقہ کپڑے سے بے نیاز اور بالائی جسم پر کھلے
گلے اور بغیر بازوؤں کی چولی۔ گورے بازو بالکل عریاں تھے۔ چہرے کی سفیدی میں سرخی نمایاں تھی۔ یقیناً امارت حسن کو
نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

شکلا کے پہلو میں چلتے ہوئے وہ یوں لگ رہی تھی جیسے زرافے کے ساتھ ہرنی۔

اس نے شکلا کے ساتھ ہی نشست سنبھالی تھی۔ لورا براؤن نے قریب آکر شکلا سے مصافحہ کیا، پرما کو گلے سے لگا کر
ماتھے اور گالوں پر پیار دیا اور ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

میں دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگا کہ شکلا کو وہیں قتل کر کے اگر پرما کو اغواء کرلوں۔ مگر پھر مجھے اپنی سوچ پر ہنسی آئی
تھی۔ پوری عمارت میں جابہ بجا مسلح کمانڈ یوں چکرا رہے تھے جیسے ایٹمی پلانٹ کی حفاظت پر چاق و چوبند فوجی دیتے
ہوتے ہیں۔ میں نے کوٹھی سے باہر نگاہ دوڑائی، گو رات کا وقت تھا مگر تیز روشنی کی وجہ سے دور تک عمارات کی نشان دہی ہو
رہی تھی۔ البتہ رات کی وجہ سے کوئی ایسی مناسب جگہ نظر نہ آئی جہاں دور سے شکلا کو نشانہ بنانا ممکن ہوتا۔ شاید دن کو کوئی ایسی
عمارت نظر آجاتی۔

ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ حاضرین کے چہروں پر خوشی کی چمک تھی۔ اچانک کوئی قریب آکر کھنکارا۔
سر گھمانے پر مجھے مضبوط جسم کا جوان نظر آیا جس کی عقابی نگاہیں مخالف کو بدن چھیدتی محسوس ہوتیں۔
"تم شاید وشال گپتا کے محافظ ہو۔" اس نے ہاتھ مصافحے کو بڑھایا۔
اس کی گرفت میں ہاتھ تھماتے ہوئے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
اس نے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ یقیناً اس کا ہاتھ کافی سخت اور طاقت ور تھا۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ عملی زندگی میں سخت
حالات کی چکی میں پسے ہوئے سنائپر پر دھاک بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جوابی زور آزمائی کے بجائے بس
فاتحانہ انداز میں ہاتھ کو اتنا سخت کیا تا کہ اسے پتا چل جائے کسی اناڑی کا ہاتھ نہیں دبا رہا۔
اس نے زہریلے لہجے میں سرگوشی کی۔ "وہ شکلا صاحب کی نواسی ہے۔ جانتے ہو پچھلے ہفتے میڈیکل کے ایک طالب
کو سڑک کنارے روک کر ایک آنکھ سے محروم کر دیا گیا۔ کیوں کہ اس نے راج کماری پرما کی تنبیہ پر انھیں گھورنا نہیں
اتھا۔ اب سنا ہے اس نے وہ کالج ہی چھوڑ دیا ہے۔"
ایک دم میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ شکلا کی حیثیت جنگل
کے بادشاہ شیر کے بجائے ڈائنوسار کی سی تھی۔ میرے جیسے معمولی حیثیت کے آدمی کا قتل تو اس نزدیک چیونٹی مسلنے سے بھی

آسان تھا۔ شاید اس کی ایما پر محمود شال گپتا میری چھاتی میں گولی ٹھونکنا سعادت سمجھتا۔

میں نے فوراً شرمندگی ظاہر کی۔ ''شکریہ دوست یقیناً آپ میری حماقت کو معاف کرنے میں فراخ دلی سے کام لیں گے۔''

میرے مدافعانہ لہجے نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔ میرا ہاتھ آزاد کرتے ہوئے وہ نرم لہجے میں بولا۔ ''شاباش، سمجھدار ہو۔ لمبی زندگی گزارو گے۔''

''اس گوری کو دیکھنے پر تو پابندی نہیں ہے ناں باس۔'' میں نے مزاحیہ انداز اپنایا۔

''جب تک راجکماری پرما کے ساتھ بیٹھی ہے صبر کرلو، اس کے بعد گھورنا تو چھوڑو، کہیں بھگا لے جانا۔'' اطمینان سے بولا۔

''شکریہ باس۔'' کہہ کر میں نے اپنا رخ پرما کی جانب سے موڑ لیا تھا۔ مرد حضرات یقیناً پہلے سے پرمالی لی سے واقف تھے کہ کوئی اسے گھورنے کی ہمت نہیں جتا رہا تھا۔ دھیرندر شکلا ایسی بلا کا نام نہیں تھا کہ کوئی اس سے مخاصمت مول لینے کی جرأت کرتا۔

کھانا شروع ہوا۔ سب لوگ لوازمات سے سجے طویل اور وسیع و عریض دسترخواں کی طرف بڑھ گئے جو کئی میزوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اتنے قسم کے کھانوں کی بہتات تھی کہ تمام قسموں کو چکھنے والے کا پیٹ بھی بھر جاتا۔ میرے پیچھے محافظ بس اپنے آقا کا دم چھلا بنے چاک و چوبند اور چوکس رہنے کی اداکاری کر رہے تھے۔ ایسی محفل میں باس لوگوں کو کیا خطرہ درپیش ہو سکتا تھا۔

دعوت طعام کے بعد محفل موسیقی شروع ہوئی۔ گانے کے ساتھ ناچنے والیوں کا بھی بندوبست تھا۔

لورا براؤن، دھیرندر شکلا کے پہلو میں بیٹھ کر سر جوڑے مصروف گفتگو رہی۔ یقیناً اس کی آمد کا مقصد شرب و طعام سے زیادہ سودے بازی سے تھا۔ دھیرندر شکلا کو راضی کر کے وہ ہتھیاروں کی بہت بڑی مانگ حاصل کر سکتی تھی۔ کشمیر فوج کو بڑے عدد کی گنتی کے ہتھیار درکار ہو سکتے تھے۔ فوج کے علاوہ شکلا کے دہشت گردوں سے بھی تعلقات تھے۔ اور فی زمانہ سنائپر رائفلیں تو دہشت گرد بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ افغان سرحد پر پاک آرمی کے خلاف دہشت گردوں کے کافی سنائپر سرگرم عمل ہیں۔

پرما انصاری زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی اور شکلا سے اجازت لے کر اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گئی تھی۔ چار پانچ چست و چالاک کمانڈ تھوڑا سا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑے۔ اگر گھر کے اندر اس کی حفاظت کا یہ اہتمام تھا تو گھر سے باہر کیا حالت ہوتا تھی۔ انصاری صاحب نے صحیح مصیبت میں پھنسا دیا تھا۔

محفل موسیقی رات گئے تک جاری رہی اس دوران شکلا اور لورا بھی سر جوڑے مصروف گفتگو نظر آئے۔ میں اتنی دور تھا کہ ان کے مابین ہونے والی گفتگو کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر شاید ان کے درمیان کچھ طے ہو گیا کہ شکلا نے لورا سے الوداعی مصافحہ کیا اور اندرونی عمارت کی طرف چل پڑا۔ محافظوں نے اسے دائیں بائیں، عقب اور سامنے سے گھیر لیا تھا۔ وہ مخصوص فاصلہ رکھے آگے بڑھتے رہے۔ فوجی جرنیل یوں بھی اس پذیرائی کے عادی ہوتے ہیں۔ اور وہ تو جرنیل کے ساتھ اور بھی بہت کچھ تھا۔

طاقت و اختیار انسان سے بہت سے وہ کام بھی کرا دیتے ہیں جن کے بارے عام انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ اختیار ہی تو تھا جس نے فرعون و نمرود سے خدائی کا دعویٰ کرایا، شداد کو خدا کے مقابلے میں جنت بنانے پر اکسایا، ابرہہ کو خانہ کعبہ پر حملے کا حوصلہ دیا، ابوجہل کو کفر پر ثابت قدم رکھا، کسریٰ پرویز کو نبی پاک ﷺ کے نامہ مبارک کو چاک کرنے کی

ترغیب دی۔ یزید بد بخت کو جگر گوشہ رسول ﷺ کا سر قلم کرانے پر جری کیا، تیمور لنگ کو مسلمان سالار یلدرم کے خلاف میدان میں اترنے پر مجبور کیا، سلمان بن عبدالملک سے محمد بن قاسم جیسے مجاہد کی پھانسی کا حکم نامہ جاری کروایا۔ ابوجعفر منصور سے امام ابوحنیفہ جیسے ولی اللہ کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر کے زہر دینے کا گناہ کروایا، یہی تو طاقت و اختیار کی سب سے بڑی خامی ہے کہ انسان سے انسانیت چھین کر خدا بننے کی احمقانہ وحماقت بھری سوچ عطا کرتی ہے۔ اور جب مالک حقیقی ڈھیلی رسی کھینچتا ہے تو انسان کے پاس پچھتانے کی مہلت بھی نہیں ہوتی۔

لورا براؤن نے بھی دھیرندر کے اٹھتے ہی جانے کو پر تولے۔ وشال گپتا بھی شاید اسی کے انتظار میں تھا تیز قدموں سے اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں بھاگ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

واک تھرو گیٹ پر کھڑے ایک محافظ نے اسے کوئی پیغام دیا۔ ''میں شکلا سے مل کر آتا ہوں۔'' مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے اس نے حسرت بھری نگاہ لورا براؤن کی شفاف کمر پر ڈالی اور اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

میرا دل چاہا پستول اٹھا کر اس کے پیچھے چل دوں لیکن شکلا کے محافظوں کی کڑی نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ یقیناً وہ مجھے اندرونی عمارت کی طرف جانے کی اجازت نہ دیتے۔ وشال گپتا نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم کار میں بیٹھ کر ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

وہ سارے رستے خاموش رہا۔ مگر جیسے ہی اسے اتارنے کو کار روکی سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''کار پارک کر کے میرے کمرے میں آجاؤ۔''

''جی باس۔'' کہہ کر میں نے کار آگے بڑھا دی۔

وہ تینوں جیپ پارک کر کے میرے منتظر کھڑے تھے۔ ایک جھڑپ میں ہمارے فاصلے سمٹ گئے تھے۔ کار روک کے میں ان کے پاس پہنچا۔ ''آپ لوگ چلو مجھے باس نے بلایا ہے۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے اپنے کمروں کو بڑھ گئے۔ میں وشال گپتا کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ڈرائینگ روم میں نظر نہ آیا۔ اس سے متصل دو خواب گاہیں تھیں۔ ایک وشال کے استعمال میں جبکہ دوسری خالی پڑی رہتی۔ یقیناً وہ کسی خصوصی مہمان کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہ اپنی خواب گاہ میں تھا۔ دستک کے جواب میں اس کی۔ ''آجاؤ۔'' سنائی دی تھی۔

''بیٹھو۔'' میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دعوت دی۔

میں نے خاموشی سے نشست سنبھال لی۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا گلاس سے گھونٹ گھونٹ کر کے زہر معدے میں اتارتا رہا۔ میں خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''ایک اہم کام کو مجھے ایسے بندے کی ضرورت ہے جو راز داری برتنا جانتا ہو۔'' لحاتی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس کی گمبھیر آواز ابھری۔

میں محتاط انداز میں بولا۔ ''باس! صرف رازی رکھنے سے تو بات نہیں بنے گی مسئلہ تو اہم کام کی تکمیل سے حل ہوگا''

اس نے ترغیب دی۔ ''تم دولت بننا چاہتے ہو ناں...... اور خواہشات کی تکمیل قربانی مانگتی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''قربانی کا تعین کریں گے تو کچھ طے کر سکوں گا۔''

''کسی پر گولی چلانے کا کہوں تو کیا جواب ملے گا۔''

''بے گناہ آدمی کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا باس۔ ایسی دولت بھلا کب سکون دے گی جو کسی کی چتا جلا کر حاصل ہو۔''

اس نے فلسفہ جھاڑا۔ ''اخلاقیات کا وزن بہت زیادہ ہوتا ہے سندیپ! انھیں اٹھا کر ترقی و بلندی کی منازل طے نہیں

کی جا سکتیں۔اور یاد رکھو ضمیر ایسی رسی ہے جو ہمیشہ تمھیں غربت کے کھونٹے سے باندھ کر رکھے گی۔ پن (نیکی) اور پاپ (گناہ) فقط کمزوروں اور نکھٹوؤں کے حیلے ہوتے ہیں۔ورنہ انسان کی پہلی ترجیح اپنی ذات ہونا چاہیے۔"

نہ جانے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا۔اگر کسی بے گناہ کے قتل کا کہتا تو میں بعد میں انکار بھی کر سکتا تھا۔ میں نے کون سا ہیشہ وہیں رہنا تھا۔البتہ جب تک تھا اس کی ہاں میں ہاں ملانے ہی میں بہتری تھی۔ یہ بھی ممکن تھا اس کا ہدف میرا بھی دشمن ہوتا۔میں نے دو تین لمحے سوچنے کی اداکاری کی اور پھر کام کا پوچھنے کے بجائے انعام کے بارے جاننے کی جستجو کی جو پوچھا میرے کردار سے زیادہ میل کھاتا تھا۔"کتنی دولت ملے گی؟"

"شاباش،یہ ہوئی ناعقل مندوں والی بات..."خوشی سے چہکتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیاں اٹھا دیں۔"پانچ لاکھ۔"

"کسے قتل کرنا ہے۔اور کیا گولی چلانے کے بعد میرے بچنے کی امید ہوگی؟"میں نے ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔

"ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے سے گولی چلانے والے کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔"اس نے ہدف کا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔

میں چونک گیا تھا۔اپنے شک کو حیرانی میں ڈھالتے ہوئے پوچھا۔"اتنے لمبے فاصلے سے میں گولی کیسے چلاؤں گا؟"

وہ ہنسا۔"بھول گئے کل گوری حسینہ نے کتنی آسانی سے پندرہ سو میٹر کے فاصلے پر چھوٹے سے ہدف کو نشانہ بنایا تھا۔"

میں نے مصنوعی بے بسی ظاہر کی۔"باس!وہ پیشہ ور نشانے باز ہے۔اور میں بس پستول چلا لیتا ہوں۔"

"راجیو تمھاری نشانہ بازی کی تعریف کر رہا تھا۔یقیناً تم رائفل بھی آسانی سے چلا لو گے۔"

میں نے دلچسپی سے پوچھا۔"سکھائے گا کون؟"

وہ چہکا۔"سکھانے والے کا نام جان کر شاید تم خوشی سے پھٹ جاؤ۔"

الجھن آمیز انداز میں سر کھجاتے ہوئے میں اسے گھورتا رہ گیا تھا۔

مجھے خاموش پا کر اس نے تجسس ختم کیا۔"کیپٹن لورا براؤن کا شاگرد بننے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"وہ گوری... ؟"میں حقیقتاً اچھل پڑا تھا۔

"ہا... ہا... ہا۔"وشال گپتا نے بلند بانگ قہقہہ اچھالا۔"گویا تم بھی گھائل ہو چکے ہو۔"

میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے مطلب کے موضوع پر آیا۔"باس!شکلا صاحب کے پہلو میں بیٹھی ہوئی نوجوان حسینہ کون تھی۔"

"چپ..."اس نے ایک دم ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔"دوبارہ تمھارے منہ سے ایسا کچھ نہ سنوں۔"

"شش... شما چاہتا ہوں باس۔"میں نے ہکلانے کی اداکاری کی۔

"بے وقوف!وہ دھیرندر شکلا کی نواسی راج کماری پرما شکلا ہے۔اسے گھورنے والے کی آنکھیں پھوڑ دی جاتی ہیں،اس کے بارے بولنے والے کی زبان کاٹ دی جاتی ہے اور اسے سوچنے والے کا سر سلامت نہیں رہتا۔پہلی اور آخری بار تنبیہ کر رہا ہوں۔دوبارہ تمھارے منہ سے اس کا نام نہ سنوں۔"

"معافی چاہتا ہوں باس۔"میں نے ندامت ظاہر کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"تو تیار ہو۔"وہ موضوع کی طرف پلٹا۔

"آپ نے ہدف کا نہیں بتایا۔"

ں نے ی تیز لہجے میں پوچھا۔ ''بڑی جلدی ہے۔'' ...بڑی بڑی با...

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں کہ مزید غربت برداشت نہیں ہوتی۔''

''فکر نہ کرو بالک! اگر یہ کام کامیابی سے کر دیا تو چھپڑ پھاڑنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، اس کے بعد دولت کی بارش
میں نہاتے رہو۔'' یہ کہتے ہوئے ہوئے اس نے گہرا سانس لیا۔ ''اب آرام کرو کل یا پرسوں سے تمھاری تربیت شروع ہو جا
ے گی۔ اور یقیناً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہوگی کہ اس گفتگو تک کسی تیسرے کی سماعتوں کی رسائی نہیں ہونا چاہیے۔''

''جی باس۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں کمرے سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر چہل قدمی کر کے میں کمرے میں
ٹ گیا۔ وقتاً فوقتاً میں عمارت میں گھومتا رہتا تھا۔ اب تو عمارت کا چپہ چپہ از بر ہو گیا تھا۔ حالات کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کب
ں سے بھاگنا پڑتا۔ اور روشال گپتا کے پاس سنائپر رائفلیں دیکھ کر بھی میرے دل میں چور پیدا ہو گیا تھا۔ ضرورت پڑنے
ہاں سے سنائپر رائفل حاصل کی جا سکتی تھی۔

ٹھکر میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ ''کافی دیر لگا دی یار! کوئی خاص بات تھی کیا؟'' اس نے میرے بیٹھنے کا انتظار
کیا تھا۔

بستر سنبھالتے ہوئے میں نے پہلے سے سوچا ہوا جواب اگلا۔ ''باس چاہتے ہیں میں مزید تربیت حاصل
ا۔ جسمانی داؤ پیچ کے ساتھ وہ مجھے ہر قسم کے ہتھیار چلانا بھی سکھانا چاہتے ہیں۔''

ہ سمجھداری سے بولا۔ ''لازمی بات ہے اپنے خصوصی محافظ کی تربیت پر اس نے توجہ تو دینا ہوگی۔''

''تھک گیا ہوں یار! سوتے ہیں۔'' اس کے مزید سوالوں سے بچنے کو میں نے جمائی لیتے ہوئے کروٹ تبدیل کی۔
ں نے چپ رہ کر میری خاموش تائید کی تھی۔

—●—

اگلے دن ناشتا کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی وشال گپتا کا بلاوا آ گیا تھا۔میرے پہنچنے پر بلا تمہید باندھے مجھے کسی خاص جگہ جانے کا مژدہ سنایا۔مزید ہدایات اس نے موبائل فون پر دینے کا عندیہ دے کر تیار ہونے کا حکم سنا دیا۔

اپنا ضروری سامان لپیٹ کر میں نے سفری جھولے (بیگ) میں ڈالا اور جانے کو تیار ہو گیا۔فکر لوگوں کو میں نے تربیت والی کہانی دہرا کر مطمئن کر دیا تھا۔تھوڑی دیر بعد میں راجیو کے ساتھ انجان منزل کی جانب گامزن ہو گیا۔راستے میں راجیو عام گفتگو کرتا رہا۔میرے جانے کے مقصد اور کام وغیرہ کے بارے اس نے مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد ہم زیادہ بھیڑ سے نکل کر مضافات جانے والی سڑک پر رواں دواں تھے۔میں ممبئی شہر کے راستوں سے بالکل ناواقف تھا۔بس جتنا کچھ انصاری صاحب نے نقشوں کی مدد سے سمجھایا تھا وہی ذہن میں تھا۔اور نقشوں کی مدد سے کسی علاقے سے خاطر خواہ واقفیت حاصل نہیں کی جا سکتی۔راجیو سے بھی زیادہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ اس کے حساب میں ممبئی ہی کا باشندہ تھا۔زیادہ مشکل مجھے بات چیت کے وقت پیش آتی تھی کہ ہندی اور اردو کی اصل ایک سی بول چال میں کافی فرق ہے۔روزمرہ کے عام الفاظ جو کوئی اور بولے تو ہم بڑی آسانی سے سمجھ جاتے ہیں، مگر اپنی زبان میں روانی سے بولنا کافی دشوار تھا۔جاسوس بننا اتنا مشکل ہوگا یہ مجھے اب پتا چل رہا تھا۔جنگلوں بیابانوں میں بھی ایک سنائپر ہر لمحہ خطرے کی زد میں رہتا ہے مگر یہاں دگنا خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔راز فاش ہو جانے کے بعد بچنے کی امید صفر فیصد بھی نہیں تھی۔اتفاق سے وشال گپتا کا سہارا مل گیا تھا ورنہ میں اب تک اندھیرے ہی میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوتا۔انسان کے منصوبے اور تدابیر ہمیشہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتیں۔کبھی مقصد کو درمیان میں چھوڑنا پڑتا ہے اور کبھی اللہ پاک اپنی قدرت سے ایسی آسانیاں فرما دیتا ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

مجھے دھیرندر شکلا اور پربا انصاری کی تلاش کے بعد سب سے مشکل کام کسی معیاری سنائپر رائفل کی تلاش کا لگ رہا تھا۔اور اللہ پاک نے ایسی آسانی فرمائی کہ نہ صرف میں شکلا کے ٹھکانے تک پہنچ گیا بلکہ مجھے سنائپر رائفل تک بھی رسائی ہو گئی تھی۔اور سونے پر سہاگا کہ دشمن خود میری تربیت پر کمر بستہ تھا۔میں اب جلد از جلد نشانہ بازی کی تربیت مکمل کر کے وشال گپتا کا مقصد جاننے کا خواہاں تھا۔جہاں تک میرا اندازہ تھا اس کام کا منصوبہ ساز (ماسٹر مائنڈ) دھیرندر شکلا ہی تھا۔البتہ بہت زیادہ سوچنے کے بعد بھی ہدف کے بارے اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا۔

مزید ادھ، پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک ڈیرے (فارم ہاؤس) کے پاس پہنچ گئے تھے۔کافی وسیع اور کشادہ عمارت تھی۔ارد گرد سرسبز کھیت خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ممبئی شہر کی اونچی عمارتوں، شہر کی بھیڑ، چیخ و پکار وغیرہ سے دور ایک پرفضا مقام تھا۔ممبئی آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔اور اتنی بڑی آبادی میں شہر کی فضا کا کیا حال ہوگا اس کا اندازہ کرنے کو یقیناً عقل کل ہونا ضروری نہیں ہے۔

داخلی دروازے پر کار روک کر راجیو نے کہا۔''اپن سالا یہاں سے واپس جائیں گا۔''

چوکیدار باہر نکل آیا تھا۔ راجیو کو دیکھ کر اس نے شناسائی کا اظہار کیا تھا۔ کار سے نکل کر راجیو نے معانقہ کرتے ہوئے میرا تعارف کرایا۔

''سندیپ بابو کے بارے تمھیں باس کا حکم مل چکا ہوگا۔''

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور راجیو سے کھانے پینے کی بابت پوچھنے لگا۔ راجیو نفی میں سر ہلا کر کار میں گھسا اور ہاتھ لہراتا ہوا واپس مڑ گیا۔

میں چوکیدار کی معیت میں اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا جو دروازے سے کافی فاصلے پر بنی تھی۔ خوب صورت اینٹوں کی روش بنی تھی جس کے جوانب میں پھولوں کی کیاریاں بنی تھیں۔ ڈیرے کی چار دیواری زیادہ اونچی سے بلند نہیں تھی۔ البتہ اس کے اوپر مزید تین فٹ تک کا خاردار تار ایسے لگائی گئی تھی کہ تار کاٹے بغیر اندر داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ ڈیرے کا احاطہ آٹھ دس ایکڑ کے بہ قدر تو ضرور ہوگا۔ ایک کونے میں خوب صورت اور جدید طرز کی رہائش گاہ بنی تھی۔ جس کے بغل میں نہانے کا تالاب (سوئمنگ پول) تھا۔ رہائشی عمارت اور بیرونی دیوار کے ساتھ چوڑا گیراج بنا تھا جس میں بہ یک وقت سات کاریں ایک ساتھ کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ گیراج میں اس وقت دو قیمتی کاریں نظر آ رہی تھیں۔ رہائشی عمارت کے قریب ایک اور ملازم نظر آیا، چوکیدار مجھے اس کے حوالے کرکے واپس پلٹ گیا۔

رہائشی عمارت میں داخل ہوتے ہی ایک کھلا سا ہال نظر آیا جس کے ایک کونے میں باورچی خانہ بنا تھا۔ درمیان میں چار صوفہ سیٹ آمنے سامنے رکھ کر ڈرائنگ روم کی شکل دی گئی تھی۔ چاروں دیواروں کے ساتھ بڑی سکرین کی ایل ای ڈی نظر آ رہی تھیں، تاکہ کسی صوفہ نشین کو دائیں بائیں دیکھنے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔ باورچی خانے کی مخالف دیوار کے ساتھ چند کمرے بنے تھے۔ اور ان کے ساتھ دوسری منزل کے لیے اوپر سیڑھیاں جا رہی تھیں۔

ڈرائینگ روم میں لورا براؤن کو میز پر پاؤں رکھ کر ٹی وی گھورتے دیکھ کر مجھے حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ مجھ پر سرسری نظر ڈال کر وہ ٹی وی سکرین کی طرف متوجہ رہی۔ اس کے انداز و اطوار میں حکمران قوم سے ہونے کا فخر و غرور شدت سے ابل رہا تھا۔ سونے پر سہاگا کہ وہ صنف نازک بھی تھی۔ اور ایسی آزاد خیال عورتوں کا ناز نخرہ نہ کرنا باعث حیرانی و تعجب تو ہو سکتا ہے۔ ناز و ادا دکھلانا عجیب نہیں ہوتا۔ ہر خوب صورت بے حجاب عورت چاہے جانے کی متمنی ہوتی ہے، بلکہ اسے پیدائشی حق سمجھتی ہے۔ اور خیر سے مرد حضرات بھی ایسے قدر ناشناس نہیں ہوتے کہ انھیں مایوس کریں۔ یہ علیحدہ بات کہ صنف نازک ہی گھاس ڈالنے پر راضی نہیں ہوتیں۔

میں نے از خود تعارف کی کوشش نہ کی کہ مجھے اس کی ضرورت تھی نہ حاجت۔ ادھیڑ عمر ملازم سے اپنے کمرے کے بارے رہنمائی لے کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دوسری منزل پر ایک خوب صورت خواب گاہ میری منتظر تھی جس کی کھڑکی سے ڈیرے سے باہر کا علاقہ بھی دور دور تک نظر آتا تھا۔ جوتے اتار کر میں بستر پر لمبا پڑ گیا۔ جب تک وشال گپتا کی طرف سے کوئی ہدایت نہ ملتی مجھے از خود عقل مند بننے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں الجھن آمیز حالات کو سوچنے لگا۔ نہ جانے وشال گپتا کس کا قتل کرانا چاہتا تھا اور اس کی نظر انتخاب مجھ پر کیوں پڑی تھی۔ لورا براؤن کیسے مجھے تربیت دینے پر آمادہ ہوئی تھی۔ ایک دوررس سوچ یہ بھی ذہن میں جاگی کہ شاید ایس آر ون سنائپر رائفلوں کی خریداری کو دھیر ندر شکلا نے ایسی کوئی شرط لگائی ہو۔ بلاشبہ ہندو بنیا موقع سے فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔ اسی وجہ سے لورا براؤن کے چہرے پر بھی مجھے دیکھ کر جوش یا وارفتگی نہیں ابھری تھی۔ اگر اس کا اپنا کام ہوتا تو وہ ضرور مجھے خوش آمدید کہتی اور ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتی۔ مزید غور کرنے پر مجھے اپنی سوچ حقیقت کے قریب ہی لگی تھی۔ البتہ اپنے بچاؤ کے بارے مجھے کوئی قابل حل سوچ نہیں سوجھی تھی۔ کیوں کہ وشال گپتا میری اصلیت سے تو واقف نہیں تھا۔ یوں بھی

میرے بطور سندیپ چوپڑا ہونے کے میرے ماضی سے بھی واقف نہیں تھا۔ کہ میری وفاداری وغیرہ سے متاثر ہو کر اس نے میرا انتخاب کیا ہو۔ صرف پستول کا فائر اچھا ہونے سے کوئی سنائپر نہیں بن جایا کرتا۔ بہت زیادہ سوچنے کے باوجود میں وشال گپتا کے فیصلے کی توجیہہ نہیں کر سکا تھا۔ کبھی کبھی انسان بغیر جانے اور پرکھے کسی پر اندھا اعتماد کرنے لگتا ہے جو میرے خیال میں وشال گپتا بھی مجھ پر کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ میرے انتخاب کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بھی شہر میں کرائے کا قاتل ڈھونڈنا دریا کے کنارے بیٹھ کر پانی کی بالٹی بھرنے کی فکر کرنے جیسا تھا۔

پھر مجھے خیال آیا، صرف قاتل نہیں ڈھونڈنا تھا انھیں ایک سنائپر چاہیے تھا۔ اور جو [illegible] سے قاتل کا [illegible] نہیں ہوتے، جبکہ مجھ پر وشال اعتماد کر سکتا تھا۔ اور میری تربیت کو لورا براؤن میسر تھی تو انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھانا مناسب سمجھا، اگر میں اچھا ثابت ہوتا تو آئندہ بھی ان کے کام آ سکتا تھا۔ فی زمانہ ہدفی قتل (ٹارگٹ قتل) کا چلن ہے۔ اور مخصوص افراد کو نشانہ بنانے کو سب سے بہترین ذریعہ سنائپنگ ہی ہے۔

شام تک میں انھی خیالوں میں الجھا رہا۔ دن کا کھانا میں نے کمرے ہی میں منگوا کر کھا لیا تھا۔ میرا ارادہ تو شام کو بھی کمرے سے نکلنے کا نہیں تھا۔ اور ملازم کو کھانا کمرے میں لانے کا کہہ دیا تھا مگر اندھیرا چھانے کے تھوڑی دیر بعد بلاوا آ گیا تھا۔ وشال گپتا کو وہاں پا کر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کے نہ آنے پر کرید ضرور ہوتی۔ لورا براؤن کے آگے پیچھے پھرنے والے کا وہاں نہ آنا حیران کن ہی ہوتا کہ وشال کی حیثیت میزبان کی تھی۔

"تم نے کیپٹن کو اپنا تعارف نہیں کرایا؟" مجھے دیکھتے ہی وشال متبسم ہوا۔

"آپ کا منتظر تھا۔" اس کے اشارے پر نشست سنبھالتے ہوئے میں نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

اس نے خفگی ظاہر کی۔ "تمھیں سب کچھ بتا تو دیا تھا۔"

"باس! میں انگریزی سمجھنے کی حد تک ہی جانتا ہوں، بولنے میں دشواری محسوس کرتا ہوں اور مادام کو ہندی نہیں آتی ہے تو آپ کے بغیر کیسے کام چلتا۔" ہم ہندی ہی میں بات کر رہے تھے۔ لورا بے پروا بیٹھی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ ملازم کھانا لگا رہے تھے لورا کھیرے کی قاش اٹھا کر کھانے لگی۔ اس کے انداز میں جھلکتی بیزاری تھی جو ظاہر کر رہی تھی کہ وہ مجھے تربیت دینے پر مجبوراً ہی راضی ہوئی تھی۔

وشال گپتا، لورا کی طرف متوجہ ہوا اور میرا تعارف کرانے لگا۔ "سندیپ میرا خاص محافظ ہے۔ اس کا پستول کا فائر بہت اچھا ہے۔ امید ہے سنائپر رائفل کو بہت جلد سمجھ جائے گا۔"

"اسے انگریزی آتی ہے؟" وہ وشال ہی کو مخاطب ہوئی تھی۔

وشال نے اسے تسلی دی۔ "بے فکر رہو مادام، پڑھا لکھا جوان ہے۔ بھگوان کی کرپا سے ہمارا نوجوان ہندی سے زیادہ انگریزی سمجھتا ہے۔"

وہ بیزاری سے بولی۔ "میں ایک ہفتے سے زیادہ وقت نہیں دے پاؤں گی۔ کام مکمل کرنے کی ذمہ داری تمھارے اپنے آدمی کی ہوگی، اس کی نالائقی کو میرے حساب میں نہ ڈالا جائے۔"

"میرا کام ایک باصلاحیت جوان مہیا کرنا تھا۔ باقی آپ کے اور شکلا صاحب کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے اس سے میں لاعلم ہوں۔"

لورا طنزیہ لہجے میں بولی۔ "مسٹر شکلا موقع کا فائدہ اٹھانے کا ماہر ہے۔"

وشال پھیکے انداز میں بولا۔ "اس بارے کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا، البتہ ڈیلوائے اس کمپنی کے بڑے شکلا صاحب کے ہم خیال تھے۔"

لورا نے انکشاف کیا۔ ''میں خود ''واز'' کمپنی کے ڈائریکٹر بورڈ کا حصہ ہوں۔ بلکہ پچاس فیصد حصص کی مالک ہوں۔ فون پر شکلا صاحب نے کسی پریشانی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہاں شوٹنگ کلب کی انتظامیہ کے مجبور کرنے پر جب مسٹر نے حماقت کا ارتکاب کرتے ہوئے سنائپنگ کا مظاہرہ کیا تو اسے اپنی راہ کی رکاوٹ دور کرنے کی سوجھی۔ مگر ایک معاہدے کے حصول کو میں قاتل تو نہیں بن سکتی تھی۔''

وشال سہمے لہجے میں بولا۔ ''شکلا صاحب کے کسی فعل کی سزا مجھے تو نہ دیں۔''

لورا کھل کھلا کر ہنسی۔ ''تمھیں تو کچھ نہیں کہا۔''

وشال معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یہی تو دکھ ہے کہ ہمیں آپ نے توجہ کے قابل ہی نہیں سمجھا۔''

لورا بے باکی سے بولی۔ ''لگتا ہے تم مسٹر شکلا سے بھی بڑا مطالبہ پورا کرانے کی فکر میں ہو۔''

وشال نے لجاجت سے کہا۔ ''غریب مطالبہ نہیں درخواست کیا کرتے ہیں۔''

وہ بے باکی سے بولی۔ ''پہلے سے کافی امراء کے مطالبے اور بیسیوں غریبوں کی درخواستیں موصول ہو چکی ہیں۔ جن میں سر فہرست مسٹر شکلا ہیں۔ باقیوں کی طرح تم بھی معذرت قبول کر لو۔''

''شروع کریں۔'' وشال گپتا نے دعوت کی آڑ میں خفت چھپائی۔

لورا اطمینان سے لوازمات سے بھری میز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ آزاد خیال اور بے راہ رو معاشرے سے تعلق رکھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ وہ فاحشہ تھی اور جس کی مرضی ہوتی ہاتھ بڑھا کر دبوچ لیتا۔ یورپین عورت جسم دکھانے میں فراخ دل سہی، جسمانی تعلقات کے معاملے میں اپنی پسند کے تابع ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دھیر ندر شکلا اور وشال گپتا کو خوب صورتی سے ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے تھکن کا بہانہ کرتے ہوئے وشال گپتا سے معذرت کی اور مجھے صبح چھے بجے تیار ہونے کی ہدایت دے کر مٹکتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

وشال گپتا، خواب گاہ میں گم ہونے تک اس کے جینز میں مستور جسم کو حسرت بھری نظروں سے گھورتا رہا۔ دروازے کے بند ہونے کی ''کھٹک'' سن کر وہ میری طرف متوجہ ہوا اور پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمھارے پلے کچھ پڑا۔''

میں معصومیت سے بولا۔ ''کچھ زیادہ نہیں، بس اتنا کہ مادام نے شکلا صاحب کو بھی گھاس نہیں ڈالی۔''

مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے منہ بنایا۔ ''اور مجھے تو کھیت میں کھلا چرنے کی چھوٹ دے دی ہے نا؟''

''چھوڑیں باس! اس سے کئی گنا خوب صورت لڑکیاں اپنے دیش میں دھکے کھاتی پھر رہی ہیں۔''

''تمھیں بے وقوف کہنے کے علاوہ کیا تبصرہ کر سکتا ہوں۔ پاگل، دل آنے کی وجہ خوب صورتی نہیں پسندیدگی ہوتی ہے۔''

میں نے مزاحیہ انداز میں ترغیب دی۔ ''آسان حل یہی ہے باس کہ آپ خود نشانہ بازی سیکھنا شروع کر دیں۔ کم از کم ہفتہ بھر کا قرب تو مل جائے گا۔''

''کیا فائدہ رال ٹپکانے کا۔ خواہ مخواہ اپنا خون ہی جلاتا رہوں گا۔'' مایوسی ظاہر کرتے ہوئے وہ اٹھ گیا۔ ''تم پوری کوشش اور محنت سے سیکھو۔ یہ فن تمھیں آئندہ بھی کام آئے گا۔ ہمیشہ اپنا مقصد مقدم رکھنے والے فائدے میں رہتے ہیں۔ شیر اگر ہرن کی فکر کرنے لگے تو بھوکا مرے گا، بلی چوہوں پر ترس کھا کر اپنے ساتھ ظلم کی مرتکب ہو گی، چھپکلی کیڑے، پتنگے کھانا چھوڑ دے تو جان سے جائے گی۔ یاد رکھنا خود غرضی قانون فطرت ہے۔ سب سے پہلے انسان کا اپنا وجود ہے اس کے بعد کسی دوسرے کے بارے سوچا جا سکتا ہے۔ اخلاقیات کے علم بردار، پُن (نیکی) کمانے والے، دھرم کے ٹھیکے دار، انسانیت کی مالا جپنے والے بھی باتوں کی حد تک مخلص ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے منہ کا نوالہ بھوکے کے پیٹ میں نہیں

والے۔ میری نصیحت پلو سے باندھ لو۔ سلطا (کامیابی) کوشش کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔"

اس نے واپس جانا تھا۔ میں ساتھ چل پڑا۔ کار تک جاتے ہوئے نصیحتیں جاری رہیں۔ اسے رخصت کر کے میں کمرے میں آ گیا۔

دن کو آرام کرنے کی وجہ سے رات گئے تک کروٹیں بدلنا پڑیں۔ آگے کی صورت حال واضح نہیں تھی۔ جب تک وشال گپتا مجھے ہدف کے بارے مطلع نہ کر دیتا کچھ طے کرنا مشکل تھا۔ گویا سوچنے کو کوئی خاص موضوع نہیں تھا اور مجھے دل پسند مشغلے کی چھوٹ تھی۔

اپنی پلوشے کو یاد کر کے جہاں میرے ہونٹوں پر تبسم آ جاتا وہیں، اس کا ناراضی بھرا رویہ بھی دل کو اداس کر گیا۔ عجیب موڑ پر آ کر اسے خبط کی سوجھی تھی۔ بلاشک وشبہ میرا قصور تھا، غلطی تھی، حماقت تھی۔ لیکن اس کا اتنا شدید ردعمل ظاہر کرنا یقینا جذباتی فیصلہ تھا۔ مجھے صفائی کا موقع دینا چاہیے تھا۔ [illegible] یا نیت سے گلگارے پاس گیا تھا اور نہ اس ہی کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے [illegible] کے دل میں اپنی اہمیت اور قدر و قیمت دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ گلگارے بے چاری بھی اسی تمنا سے مغلوب ہو کر مجھ پر حق جتانے لگتی۔ اس کے رویے کو شرعی لحاظ سے جائز کہا جا سکتا تھا نہ اخلاقی لحاظ سے درست سمجھا جا سکتا تھا اور نہ ہماری تہذیب وثقافت اس کی اجازت دینے پر تیار تھی، یونہی مجھ سے بھی جلد بازی میں صحیح فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ رات گئے ایک نامحرم لڑکی کے ساتھ کمرے میں بند ہونا بغیر کسی شک وشبہ وتردد کے کھلی بے حیائی و بے شرمی تھی۔ قابل مواخذہ فعل تھا۔ مگر محبت کرنے والی بیوی کو کم از کم تحقیق کرنا ضروری تھا۔ اس کے جیسی اگر اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا تو میرے گناہ کے ثبوت کو اسی وقت کھوج سکتی تھی۔ شوہر کا جسم بیوی کے لیے کھلی کتاب ہوتا ہے۔ اور بے حیائی کے اثرات کو موقع واردات پر چھپانا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر اس نے مجھے صفائی کا موقع دیا تھا نہ میری منتوں پر پسیجی تھی۔ میری ہر غلطی، سستی اور درشتی کو غیر اہم و بے وقعت جاننے والی کا پانسا ایک دم پلٹ گیا تھا۔ ایک پل جدائی نہ سہنے والی پر میرے خطرناک مشن پر آنے کا بھی کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ حالاں کہ روما کو بھی میں نے گلگارے والے واقعے کی اطلاع دی تھی۔ مگر اس نے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ روما بلاشبہ مجھے بہت چاہتی تھی مگر پلوشہ کی محبت بھی روما سے کم نہیں لگی تھی۔ روما نے میری جدائی کو روگ بنا لیا تھا تو پلوشہ بھی ہر وقت جان قربان کرنے پر تیار رہتی۔ البتہ وہ روما سے بڑھ کر لاڈلی اور مجھے پیاری تھی۔ کیوں کہ دل پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔

کافی دیر یونہی پلوشے کے رویے کو سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ نیند نے ان سوچوں سے چھٹکارا دلایا۔ دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح جلدی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کو چھے بجے کا اعلان کرتے دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔ لورا براؤن نے چھے بجے ہی کا وقت دیا تھا اور ایک فوجی کو چھے بجے کا مطلب ہوتا ہے۔ "پانچ منٹ کم چھے بجے۔" گو لورا کی نظر میں میں فوجی نہیں تھا لیکن وہ جس قوم سے تعلق رکھتی تھی ان میں کم از کم وقت کی پابندی پائی جاتی ہے۔ اس معاملے میں پاکستان اور انڈیا کے لوگ ماشاء اللہ اتنے بے پروا ہیں کہ چھے بجے کا مطلب بغیر کسی ہچکچاہٹ یا تردد کے گیارہ بجے ہی لیتے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو دعوت نامے پر درج وقت پر شادی ہال میں جا کر دیکھ لے۔

خیر تازہ دم ہو کر میں کمرے سے نکلا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا۔ ملازم سے استفسار کرنے پر پتا چلا مادام تالاب (سوئمنگ پول) میں تیراکی فرما رہی ہیں۔ میں اسی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس وقت باہر نکل رہی تھی۔ تیراکی کا لباس یوں بھی

ع کوئی دیکھے یہ کیا ہے تو نظر صاف آئے

کی عملی تفسیر ہوتا ہے۔ اور اس نے تو پہنا بھی "ٹو پیس" لباس تھا۔ یعنی ایک دھجی بالائی اور دوسری زیریں بدن پر لپٹی

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور چوڑائی بھی [illegible] میری [illegible] جاتی ہے۔

''دیر کیوں ہوئی؟'' بولنے میں پہل اس نے کی تھی، لہجہ [illegible] برہم لگا تھا۔ اب [illegible] تھا رخ موڑ کر مس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ کر لے [illegible] بالآخر تھا میں اس کی طرف [illegible] بولا۔

''رات گئے تک جاگتا رہا، صبح آنکھ دیر سے کھلی۔''

''مخاطب کی طرف دیکھے بغیر گفتگو کرنا بدتہذیبی اور غیر اخلاقی حرکت ہے۔ تم میرے کان اور [illegible] طرف موڑو [illegible]'' آپ کے لہجے میں غصے کا عنصر مزید بڑھ گیا تھا۔

انسان کی نگاہ ایک سو اسی ڈگری کا میدانی نظارہ (فیلڈ آف ویو) رکھتی ہے۔ ادھر [illegible] بغیر [illegible] محسوس ہوا کہ اس نے تولیہ لپیٹ لیا ہے۔ میں مڑا۔ ''آپ کو گھورنا غیر اخلاقی اور بدتہذیبانہ حرکت لگ رہی تھی۔''

''گھورنے کا کس نے کہا ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

''اگر آئندہ وقت پر نہ پہنچا تو نتیجے کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔'' مجھے دھمکا کر اس نے رخ موڑا اور پتلون پہننے لگی۔

''معذرت خواہ ہوں مادام!'' میں نے معافی مانگنے میں عافیت سمجھی تھی کہ وہاں میری حیثیت وشال گپتا کے ملازم کی تھی اور کسی ملازم کی گوری مالکن سے بحث و تکرار قابل گرفت ہو سکتی تھی۔

ڈھیلی ڈھالی خاکی پتلون اور نصف بازوؤں کی بنیان پہن کر اس نے موٹے تلے والے مردانہ جوتے پہنے اور بالوں پر تولیہ رگڑنے لگی۔ منٹ بھر کی رگڑائی کے بعد اس نے تولیہ کرسی پر پھینکا اور میز پر رکھا ایس آر ون کا بیگ اٹھالیا۔ ساتھ ایک دوسرا بیگ بھی رکھا تھا جو اس نے مجھے اٹھانے کا اشارہ کیا۔

آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ڈیرے کی چھت پر پہنچے۔ وہاں ہم اردگرد کا علاقہ بہت اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔ اگر میں نے کسی کو تربیت دینا ہوتی تو چھت ہی کا انتخاب کرتا۔ بیگ نیچے رکھ کر اس میرے ہاتھ سے دوسرا بیگ لے کر کھولا اور ایک خاکی کپڑا نکال کر نیچے بچھا دیا۔ اس پر ایس آر ون کا بیگ کھول کر بوٹ اتارے بغیر ایک پاؤں بچھا کر اس پر تشریف ٹیک دی۔ میں بھی التحیات کی حالت میں کپڑے کے دوسرے کنارے پر ٹک گیا۔

ایس آر ون کے حصے (پارٹس) نکال کر کپڑے پر رکھتے ہوئے وہ مستفسر ہوئی۔ ''کبھی رائفل سے فائر کیا ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کلاشن کوف چلائی ہے۔''

"سب سے پہلے میں تمہیں رائفل کے حصوں کو جوڑنا سکھاؤں گی جہاں سمجھ نہ آئے بلاتکلف پوچھ لینا۔" لہجہ
انداز میں کہتے ہوئے وہ آسان اور قابل فہم انداز میں ایس آر دن کو جوڑنے کا طریقہ سکھانے لگی۔ ایک سنائپر کے لیے
کسی بھی نئی سنائپر رائفل کا کھولنا جوڑنا ایسا ہی ہوتا ہے جیسے لوگوں کا نئے جوتوں کے تسمے باندھنا۔ لیکن خود کو انجان ظاہر کر
کے میں دلچسپی سے سیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ سکھاتے وقت لورا براؤن کے لہجے میں درشتی، برہمی کے بجائے ملائمت و
نرمی جھلکنے لگی تھی۔ انداز میں نخوت و بے نیازی کے بجائے ایک معلم کا تدبر و تفکر در آیا تھا۔ مجھے تفصیل بتاتے ہوئے اس
نے رائفل کو مکمل بند کر کے کھولا اور مجھے جوڑنے کی دعوت دی۔
رائفل کو جوڑنے میں کوئی الجبراء یا سائنس تو تھی نہیں کہ مجھے اداکاری کی ضرورت پیش آتی۔ میں نے آسانی سے
رائفل کو جوڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکا "شاباش۔" کہہ کر اس نے مجھے میگزین میں گولیاں بھرنا سکھا
یا۔ پھر ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے بارے بتانے لگی۔ اس پر رینج اسی طرح ہی لگتی تھی جیسے رینج ماسٹر کی سائیٹ لیوپولڈ یا کسی
دوسری جدید ٹیلی اسکوپ سائیٹ پر لگتی ہے۔ ٹیلی اسکوپ سائیٹوں میں ہر سو میٹر کی رینج کے بعد سنائپر کو ایلیویشن ناب گھما
کر کلک لگانے پڑتے ہیں۔ کلکوں کی بڑھوتری میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ جیسے لیوپولڈ سائیٹ پر دو سو میٹر کے لیے چھ
کلک تھے تو تین سو میٹر کے لیے بارہ اور چار سو میٹر کے لیے اکیس۔ لورا کو ہر فاصلے کے کلک زبانی یاد تھے۔ وہ اطمینان
سے میرے سامنے دہراتی گئی۔ میں ساتھ ساتھ ذہن نشین کرتا گیا کہ زیادہ تر کلک لیوپولڈ سائیٹ ہی سے مماثل تھے۔ یہ
اور بات کہ کلک اگر لیوپولڈ سائیٹ سے بالکل بھی مختلف ہوتے تب بھی میں اس کے ایک بار بتانے پر یاد کر لیتا۔ اور اس
میں میری یادداشت سے زیادہ شوق اور تجربے کی وجہ ہوتی۔
"واپسی پر مجھ سے کلکوں کی ترتیب کا جدول (ٹیبل) لے لینا۔ دو دن کے اندر تمہیں ساری ترتیب یاد ہونا چاہیے
یعنی مطلوبہ فاصلے پر کتنے کلک لگائے جائیں گے۔"
"جی مادام۔" میں نے مؤدبانہ انداز میں سر ہلا دیا۔
وہ مجھے شست لینے کا طریقہ بتانے لگی۔ دھوپ تیز ہوئی تو اس نے تربیت ختم کرنے کا اعلان کیا۔ میں رائفل کو کھول کر
بیگ میں منتقل کرنے لگا۔ اس نے ایس آر دن مجھے اپنے کمرے میں رکھنے کا کہہ کر خوش کر دیا تھا۔
سہ پہر کو ہم نے پھر مشق کی۔ اس نے مجھے ونڈ میٹر سے ہوا کی رفتار ناپنے اور ڈیفلیکشن ٹاپ کا استعمال سکھایا۔
رات کا کھانا ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ "ڈیپ!" اس نے حسب معمول سندیپ نام کی مٹی پلید کرتے ہوئے الجھن
ظاہر کی۔ "مجھے لگتا ہے، ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔"
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی مادام! شوٹنگ کلب میں آپ کو رخصت کرتے وقت وشال صاحب کی ہدایت پر
میں نے کار کا دروازہ کھولا تھا۔"
اس کے چہرے پر تبسم نمودار ہوا۔ "احمق ہو یا بننے کی کوشش کر رہے ہو۔"
"کیوں مادام۔" میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ورنہ میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہ سنائپر تھی اور ایک
سنائپر کی یادداشت عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ گو ہماری بات چیت وائرلیس سیٹ پر ہوتی رہی تھی۔ اور وائرلیس پر آواز
اصل سے تھوڑا مختلف ہوتی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی اتنی زیادہ نہیں ہوتی۔ کوئی بھی باریک بین اندازہ لگا سکتا ہے۔ جیسے
دہشت گردوں کے کمانڈر روشن نے میری آواز وائرلیس سیٹ پر سنی تھی اور آمنے سامنے آتے ہی اسے مجھ پر شک ہو گیا
تھا۔ وہ اس کے ساتھ میں کافی گپ شپ کر چکا تھا اور بعید نہیں تھا کہ وہ میری اصلیت تک پہنچ جاتی۔ صرف حلیے اور میری حالیہ
شناخت ایسی تھی جس کی وجہ سے اس کا دماغ ایس ایس کی طرف نہیں جا رہا تھا ورنہ افغانستان میں آمنا سامنا ہونے پر اسے دماغ پر زیادہ

زور نہ دینا پڑتا۔

"کوئی ایسی چیز جس کے سمجھنے میں دقت پیش آ رہی ہو۔" وضاحت دینے کے بجائے اس نے موضوع تبدیل کرنا ضروری سمجھا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

خطرہ ٹلتے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس بھرا۔ گو یہ سکون عارضی تھا۔ کسی بھی وقت اسے میری آواز و انداز پہ ایلگر اس کا گمان گزر سکتا تھا۔ البتہ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی۔ اب تک میں نے بہت مختصر بات چیت کی تھی اور زیادہ تر اس کی سنتا رہا تھا۔ آگے اس گفتگو کو مزید مختصر کر کے میں اس خطرے کا تدارک کر سکتا تھا۔

"صبح دیر نہیں ہونا چاہیے۔" وہ ہدایت دے کر اٹھ گئی۔ میں چہل قدمی کو باہر نکل گیا۔

اگلی صبح میں پانچ بجے سے پہلے تیار ہو کر سبزہ زار کی طرف نکل گیا تھا۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کر کے میں نے الٹک بیٹھک کی، ڈنڈ پیلے، چند اور مشقیں کیں، کیوں کہ جسم کو تندرست و توانا اور قابل عمل رکھنے کو ورزش نہایت ضروری و اہم ہے۔ چھ بجے سے پہلے میں رائفل اور سنائپنگ کے سامان سمیت چھت پر پہنچ گیا تھا۔ وہ تیراکی میں مشغول تھی اور اس کا گزشتہ کل کا لباس ایسا نہیں تھا کہ مجھے وہاں جانے کی جرات ہوتی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی ہلکے گیلے سنہری بال لہراتے ہوئے پہنچ گئی۔ مجھے ایس آر ون کے ساتھ مشغول دیکھ کر اس نے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ تربیت شروع ہو گئی۔ اس دوران میں نے کافی اناڑی پن کا مظاہرہ کیا۔ کیوں کہ کل اس نے جس الجھن کا اظہار کیا تھا، مجھے محتاط ہونا پڑا تھا۔

پانچ دنوں تک تربیت کے ساتھ وہ مجھے ڈرائی ریہرسل (بغیر گولی چلائے فائر کی مشق) کرواتی رہی۔ میں نے اپنے اساتذہ سے بھی یہی سنا تھا کہ ایک نشانہ باز کے لیے ڈرائی ریہرسل بہت ضروری اور اہم ہوتی ہے۔ اور ڈرائی ریہرسل پرانے سنائپر کے لیے بھی اتنی ہی مفید ہوتی ہے جتنے نو آموز سنائپر کے لیے۔ وہاں چونکہ فائرنگ رینج نہیں تھی اس لیے چھٹے دن وشال گپتا کو کہہ کر فائر کرنے کو ہم شوٹنگ کلب پہنچ گئے تھے۔ کافی عرصے سے میرے کندھے نے سنائپر رائفل کے جھٹکے کا خوشگوار اور دوستانہ لمس محسوس نہیں کیا تھا۔ پہلے ہی دن میں نے تین سو، پانسو اور پھر ہزار میٹر پر فائر کر کے لورا کو اطمینان دلا دیا تھا۔ مزید دو دن کی مشق کے بعد میں پندرہ سو میٹر پر بھی ہدف کو نشانہ بنانے لگا۔ البتہ اس دوران میں جان بوجھ کر ہدف کے درمیان یا خاص چندی پر گولی نہیں مارتا تھا ورنہ لورا کو شک ہو سکتا تھا۔ میری اُس نشانہ بازی پر بھی وہ دو تین بار اعتراف کر چکی تھی کہ میرا فائر قدرتی طور پر اچھا تھا۔ اور اس کے تیئں ایسا ہونا، ناممکن یا تعجب انگیز نہیں تھا۔ بلاشبہ اچھی نشانہ بازی کی صلاحیت کسبی (کوشش سے حاصل کردہ) کے بجائے وہبی (قدرت کی طرف سے عطا کردہ) ہوتی ہے۔

ہفتے بھر کے بعد اس نے وشال گپتا کو "سب اچھا" دے دیا تھا۔ اسی شام وہ ہمارے پاس ڈیرے پر پہنچ گیا۔ رکی کلمات کے بعد لورا مطلب کی بات پر آئی۔ "میں نے تمھارے آدمی کو سکھا دیا ہے۔ بے شک امتحان لے کر جانچ سکتے ہو۔"

"مادام! مسئلہ صرف ہمارے آدمی کی سکھلائی سے حل نہ ہوگا۔ اگر یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو بات بنے گی۔"

وہ برہم ہوئی۔ "یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔"

وشال معنی خیز لہجے میں بولا۔ "یج میں اتنی سادہ ہو یا شکلا صاحب نے پوری بات نہیں بتلائی تھی۔"

اس کے لہجے میں درشتی سوا ہوئی۔ "تمھارا مطلب یہ ناکام ہو گیا تو معاہدہ نہیں ہو پائے گا۔"

"یہی عرض تو کی ہے، کہ راہ کا روڑا ہٹے بغیر معاہدہ کیسے ہو پائے گا۔"
وشال گپتا نے وضاحت کی۔"میں کسی پر گولی نہیں چلا سکتی۔"
لورا نے انکار میں سر ہلایا۔"آپ بالکل ایسا نہ کریں، مگر اپنے شاگرد کی حوصلہ افزائی کو ساتھ تو جا سکتی ہیں۔ گولی
وشال چاپلوسی سے بولا۔"آپ بالکل ایسا نہ کریں، مگر اپنے شاگرد کی حوصلہ افزائی کو ساتھ تو جا سکتی ہیں۔ گولی سندیپ چلائے گا بس تھوڑی سی رہنمائی اور نگرانی کی ضرورت پڑے گی۔"
لورا انکار پر ڈٹی رہی۔"ڈیپ، ڈیڑھ کلومیٹر تک آسانی سے کسی بھی شخص کو نشانہ بنا سکتا ہے۔"
"شوٹنگ رینج پر ہدف کو نشانہ بنانے والا ضروری نہیں عملی میدان میں بھی اتنا ہی کامیاب ثابت ہو۔ آپ کے بہ قول سنائپنگ سائنس ہے اور گولی چلانے سے پہلے کئی ایک تیاریاں کی جاتی ہیں۔ بے شک آپ گولی نہ چلائیں اور نہ آخر تک وہاں موجود رہیں۔ بس سندیپ کو گولی چلانے کی مکمل تیاری کروا کر واپس آجانا۔"
لورا نے الجھن ظاہر کی۔"تیاری کروا تو دی ہے۔"
وشال نے وضاحت کی۔"میرا مطلب ہدف کو نشانہ بنانے کی حتمی تیاری۔ ایلیویشن، ڈیفلیکشن وغیرہ کا جائزہ لے کر آجانا کہ اس نے سب کچھ صحیح طریقے سے لگایا ہوا ہے۔ اس سے تو شاید فاصلہ بھی ٹھیک سے نہ ناپا جائے۔"
لورا ہچکچائی۔"میں اس کام میں اتنا زیادہ ملوث نہیں ہونا چاہتی کہ قانونی طور پر مجرم ٹھہرائی جاؤں۔"
"مادام، یہ موقع بار بار نہیں ملے گا۔ اور یہ بھی جان لیں سندیپ کی ناکامی ہم سب کی ناکامی کہلائے گی۔ ہدف صرف زخمی بھی ہوا تو کام بگڑ جائے گا۔"
وہ بگڑ کر بولی۔"اگر مجھے ہی سب کچھ کرنا تھا تو وقت ضائع کیوں کرایا۔"
لورا کے لہجے میں لچک دیکھتے ہوئے وشال نے تسلی دی۔"آپ کو صرف رہنمائی کرنا ہے۔ باقی سب کچھ سندیپ کر لے گا۔"
"کب جانا ہے۔" لورا نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے لہجے میں مجبوری و بے بسی واضح جھلک رہی تھی۔
وشال گپتا کے چہرے پر فاتحانہ تبسم ابھرا۔"پرسوں۔"
"منصوبہ کیا ہے؟"
"کل شام کو میں حتمی منصوبہ لے آؤں گا۔" وشال کی گفتگو سے شک ہوا وہ ہدف سے لاعلم تھا۔ یا شاید منصوبہ لورا تک پہنچانے کو اسے کسی کی اجازت درکار تھی۔
لورا مزید سوال پوچھے بغیر اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی تھی۔
میں نے تبصرہ کیا۔"مادام خفا لگ رہی ہے۔"
وشال گپتا رکھائی سے بولا۔"اسے خوش کرنے کو ہم خطرہ نہیں مول سکتے۔"
میں شاکی ہوا۔"تو آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"
وہ صاف گوئی سے بولا۔"اگر تم اس سے اچھے بھی ہو تو یہ ثابت کرنے کو تمھیں کافی وقت چاہیے۔"
"میں اچھائی کا دعویٰ نہیں کر رہا، لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہیں۔"
میری شکایت کو دوسرا رخ دیتے ہوئے وہ معنی خیز لہجے میں مسکرایا۔"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمھیں معاوضہ ملے گا۔"
"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اپنا شکوہ واپس لیا کہ خواہ مخواہ کی تکرار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نہ مجھے کوئی ایس ایس کی بیت سے جانا تھا اور نہ شکلا کے دشمن کا خاتمہ کرنا ثواب کا کام تھا۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہاں لورا موجود نہ

ہو۔ کیوں کہ شکلا کے دشمن کو ختم کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ایس آر ون سمیت فرار کا منصوبہ سوچے ہوئے تو
لورا میرے منصوبے کی راہ میں روڑے اٹکا سکتی تھی۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھی۔ اتنا آسان ہدف ثابت نہ ہوتی۔
اسے رخصت کر کے میں کمرے میں لوٹا۔ بہ مشکل بیٹھ ہی سکا تھا کہ دروازہ بجا کر لورا اندر داخل ہوئی
گیا تھا۔

''جی مادام۔'' میں نے کھڑے ہو کر تعظیم دی۔''
مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے نشست سنبھالی۔ ''جانتے ہو کس پر گولی چلانا ہے؟''
میں نے نفی میں سر ہلایا۔
اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ ''مسٹر بکرم سنگھ پر۔''
''بکرم سنگھ؟'' میں نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔
''نہیں جانتے؟'' طنزیہ ہنسی استعجاب میں ڈھل گئی تھی۔
میں نے نفی میں سر ہلایا۔
اس نے قدرے درشتی سے پوچھا۔ ''جنرل بکرم سنگھ کو نہیں جانتے؟''
''آ... آرمی چیف...... '' میں ہکلا گیا تھا۔
''شکر ہے۔'' وہ کھل کھلائی۔
''م... مگر و شال جی ایسا کیوں کریں گے۔ کہیں وہ پاکستانی جاسوس تو نہیں۔''
''جاسوس بے چارے تو مفت میں بدنام ہوتے ہیں، اصل جنگ تو اندرونِ ملک اپنے مفادات کی لڑی جاتی ہے۔''
''یہ تو غداری ہے۔''
اس نے منہ بنایا۔ ''میں تمھارے پاس غداری یا دیش بھگتی کا مقدمہ لے کے نہیں آئی۔''
''مجھے اعتماد میں لینے کی وجہ؟'' میں مطلب کی بات پر آیا۔
اس نے پھلجڑی چھوڑی۔ ''تمھاری ہمدردی حاصل کرنا۔''
''یقیناً بہت چھوٹا آدمی ہوں۔'' میں نے حقیقت اُگلی۔
''انسان کی اہمیت کا تعین حیثیت و مرتبہ سے نہیں ہوتا۔ دروازے پر کھڑا چپڑاسی و چوکیدار بھی بعض اوقات بہت
،عہدے و مرتبے والوں سے زیادہ کام کر جاتا ہے۔''
میں معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اور یہ چپڑاسی آپ کے لیے کیا کر سکتا ہے؟''
''جانتے ہو شکلا، مسٹر سنگھ کو کیوں قتل کرانا چاہتا ہے۔'' وہ اس موضوع پر آئی جس بارے جاننے کو میں سخت بے چین

شتیاق دباتے ہوئے میں نے بہ ظاہر بے پروائی ظاہر کی۔ ''مجھے مقتول کا نام ابھی معلوم ہوا ہے تو وجہ کیسے جان سکتا

ں نے انکشاف کیا۔ ''مسٹر بکرم سنگھ، شکلا کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ ایس آر ون رائفلوں کی خریداری
،مسٹر بکرم سنگھ کی اجازت پر منحصر ہے۔ دو تین اور ہتھیاروں کے معاہدے بھی بکرم سنگھ کی وجہ سے نہیں ہو
ب یہ کانٹا نکال کر ہی شکلا مرضی کا چیف سامنے لا سکتا ہے۔''
ے دم مجھے حقیقت کا ادراک ہوا، شکلا اب اتنا طاقت ور ہو گیا تھا کہ چیف آف آرمی سٹاف پر ہاتھ ڈالنے پر تلا

تھی۔ لورا براؤن کی صورت میں اسے یہ تدبیر سوجھی تھی۔ اور لورا براؤن اپنے ہتھیاروں کو بیچنے کی وجہ سے کافی حد تک چلی گئی تھی۔ انڈین آرمی سے معاہدہ ہونے پر کثیر تعداد میں ایس آر ون رائفلیں کا سودا ہو سکتا تھا۔ البتہ وہ خود [illegible] نہیں سکتی تھی۔ صرف ایک آدمی کو سنائپنگ کی تربیت دینے پر یہ مشکل تیار ہوئی تھی۔ میں خود بھی اس حد تک نہیں جا سکتا تھا۔ انڈین آرمی کے چیف پر حملہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پاکستان آرمی ایسے کام کی اجازت ہاگز نہ دیتی۔ کیوں کہ ایسا ہونے پر جواب کی ایجنسیاں کے لیے صرف یہی کام باقی رہ جاتا کہ ایک دوسرے [illegible] منصوبہ بندی کرتی رہ جاتیں۔ عالمی سطح پر بھی پاکستان کی نہ صرف بدنامی ہوتی بلکہ جواب دہی مشکل ہو جاتی۔ [illegible] بعض اوقات اتنی لمبی جنگ چھیڑ دیتے ہیں جس کا اندازہ بھی عام آدمی نہیں کر سکتا۔ اس کی چھوٹی سی مثال پہلی جنگ عظیم ہے جو [illegible] آسٹریا، ہنگری کی دوہری بادشاہت کے شہزادے ولی عہد ''آرک ڈیوک فرینز فرڈیننڈ'' اور اس کی اہلیہ ''صوفیہ'' [illegible] جو بیک ہینڈ نامی دہشت گرد تنظیم کے ایک شخص گیوریلو پرنسپ نے سراجیوو کے مقام پر 28 جون 1914 کو کیا۔ گو اس جنگ کی در پردہ کئی وجوہات تھیں۔ مگر شروعات کے لیے یہی قتل وجہ بنا۔

البتہ دھیرندر شکلا کی بات اور تھی۔ وہ حکومتی عہدے دار نہیں تھا۔ آرمی سے ریٹائرڈ ہو چکا تھا لیکن دہشت گردانہ کارروائیوں کا روح رواں تھا۔ اس کے ساتھ ایک باپ کی شفقت و محبت کا قاتل تھا۔ پاکستان آرمی یا حکومت کو اس کے قتل میں دلچسپی نہ بھی ہوتی انصاری صاحب اسے معاف کرنے پر تیار نہیں تھے۔ اور اس کے مظالم کا جو نقشہ انصاری صاحب نے کھینچا تھا اس کے بعد اس کے قتل میں تاخیر کرنا خود مجھے بھی گوارا نہیں تھی۔ البتہ جنرل منگھ پر کسی صورت گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ بلکہ میں تو کسی عام بندے پر بھی گولی چلانے پر تیار نہیں تھا اور ذہنی طور پر فرار کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ اب لورا براؤن کی مصیبت گلے پڑ رہی تھی جو میری راہ میں روڑے اٹکا سکتی تھی۔

''کیا ہوا؟'' مجھے سوچ میں گم پا کر اس نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

میں چونکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

''تمھیں پریشان کرنے نہیں حوصلہ بڑھانے آئی ہوں۔ اور چاہتی ہوں تم مسٹر گپتا سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرو، کہیں شکلا مجھے دھوکے میں رکھ کر صرف اپنا الو سیدھا کرنے کے چکر میں تو نہیں ہے۔'' اس نے اپنی آمد کے راز سے پردہ ہٹایا۔

میں نے منہ بنایا۔ ''مادام! انھوں نے مجھے ہدف سے بے خبر رکھا ہے۔ اصل منصوبے کی خاک ہوا لگنے دیں گے۔''

دل آویز تبسم ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے اس نے امید ظاہر کی۔ ''تم کوشش کرو تو مسٹر گپتا سے اگلوا سکتے ہو۔''

میں معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''یہ کوشش آپ خود کریں تو کامیابی کا زیادہ امکان ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مسٹر گپتا بے ہودہ خواہشات کا واضح اشارہ کر چکا ہے۔ اور میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔''

میں نے طنز کیا۔ ''حالاں کہ آپ کے لباس اور انداز میں ایسی احتیاط نظر نہیں آتی۔''

اس نے حیرانی ظاہر کی۔ ''لباس کا اس سے کیا تعلق۔ پہناوا انسان کی خواہشات و کردار کو ظاہر نہیں کرتا۔''

اپنی تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے اس کی سوچ صحیح تھی۔ ہندو معاشرے میں بھی بدن ڈھانپنے اور عریاں لباس سے احتراز برتنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ ایک ہندو کے روپ میں میں اسلامی تعلیمات کا پرچار نہیں کر سکتا تھا۔ تائید میں سر ہلاتے ہوئے میں نے وضاحت کی۔

''کہنے کا مطلب ہے آپ کے ہاں ایک غیر شادی شدہ عورت کو جنسی تعلقات رکھنے پر روک ٹوک نہیں کی جاتی۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''تو تعلقات پسندیدہ شخص سے رکھے جاتے ہیں، کسی معاہدے کے حصول کو بدن کا دستر خوان نہیں

سجایا جاتا۔ میں فاحشہ (کال گرل) نہیں ہوں۔ ایسا ہوتا تو سفر شاہی ہوٹل میں گزار لیتی۔"

میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔" وشال گپتا میرا باس ہے۔ نہ وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ سے استفسار پر وہ بھی مجھے ہو جائے۔ البتہ اپنی سی کوشش کروں گا۔"

"کبھی کبھی لگتا ہے تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو۔" اس نے بھولپن سے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"ایسا کیوں؟" اپنی بدحواسی پر پردہ ڈالتے ہوئے میں نے بظاہر حیرانی ظاہر کی۔

وہ بے باکی سے بولی۔" تمھاری آنکھوں میں مجھے ایسی کوئی خواہش نظر نہیں آتی جو یہاں ہر مرد کی آنکھوں سے جھلک رہی ہے۔"

"کیوں کہ میں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہوں۔ ایک ملازم کی اتنی اوقات نہیں ہوتی کہ وہ سچے خواب دیکھے۔" گناہ کرنے پر صفائی دی جاتی ہے۔ مگر تب مجھے گناہ نہ کرنے کی وضاحت دینا پڑی۔

اس کا مترنم قہقہہ بلند ہوا۔" خواہشات و خواب حیثیت و مرتبے کے تابع نہیں ہوا کرتے۔"

میں نے بات بدلی۔" ضروری نہیں ایک لڑکی ہر مرد کے لیے باعث ترغیب ہو۔ پسند و معیار تو سب کا جدا جدا ہوتا ہے۔"

"خوب صورت عورتوں کے معاملے میں تمام جوان مردوں کی پسند لگی بندھی خواہش سے گردش کرتی ہے۔"

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔" شکر ہے آپ نے خوب صورت کہا "

وہ قدرے برہم ہوئی۔" تو میں بدصورت ہوں۔"

"سب کا وکیل نہیں ہوں کہ اپنی پسند کو بنیاد بنا کر آپ کی خوب صورتی یا بدصورتی کا پروانہ (سرٹیفکیٹ) جاری کروں۔"

اس نے موضوع تبدیل کیا۔" تو امید رکھوں کہ کوشش کرو گے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

اس کی استفہامیہ نظریں میری جانب متوجہ ہوئیں۔ میں نے کہا۔" زیادہ تو نہیں جانتا مگر جہاں تک اندازہ ہے ایکس آر ون بہترین رائفل ہے۔ اگر شکلا صاحب کو خریداری میں دلچسپی نہیں تھی تو آپ کہیں اور گاہک ڈھونڈ لیتیں۔ بلکہ براہ راست بکرم سنگھ سے بھی رابطہ کیا جا سکتا تھا۔"

مجھے ٹالتے ہوئے بولی۔" تمھاری کھوپڑی میں جو چھوٹا سا دماغ ہے، اس پر زور نہ دینا مفید رہے گا۔"

"حیرانی ہے کہ میری کم علمی سے آگاہی کے باوجود مجھے اتنی اہم ذمہ داری سونپنے چلی آئیں۔"

وہ طعنہ زن ہوئی۔" تمھاری استاد ہوں، میرا کام تمھاری پہلی ترجیح ہونا چاہیے۔"

میں نے منہ بنایا۔" اس سکھلائی کے پس پردہ آپ کا ذاتی مفاد ہے۔"

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے مجھ پر شاکی نگاہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"اپنی سی کوشش کروں گا۔" میں نے باآواز بلند کہا۔ مگر وہ رکی نہیں تھی۔

میں رات گئے تک جاگتا رہا۔ لورا کی رضامندی میری سمجھ سے باہر تھی۔ آخر ایسی کون سی مجبوری تھی کہ وہ اتنا خطرہ مول لینے پر تیار ہوئی تھی۔ آرمی چیف کی موت چھوٹا معاملہ نہیں تھا۔ بعید نہیں تھا کہ ایجنسیوں کی تحقیقات کا اختتام شکلا کی شخصیت پر جا کر ہوتا۔ اس میں لورا براؤن کی کمپنی کا نام آ جاتا تو عالمی عدالت کی طرف سے نہ صرف کمپنی کا لائسنس ضبط ہو جاتا بلکہ بھاری ہرجانے کے ساتھ کڑی سزا ملنے کا بھی امکان تھا۔

مجھے اپنی فکر بھی لاحق ہوئی۔ اب بھاگنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ بس وشال گپتا کی تصدیق کا انتظار تھا۔ گو جو بھی وہ ہدف کا انکشاف کرتا میں انکار میں سر ہلا سکتا تھا۔ اس ضمن میں آسان بہانہ تھا کہ آرمی چیف پر گولی چلانا جرم کے علاوہ دھرتی ماتا سے غداری کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن اس راز پر مطلع ہونے کے بعد وہ مجھے زندہ جانے کی اجازت نہ دیتے۔ اس لیے بہتر یہی ہوتا کہ میں دوران مشن بھاگنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح میں سنائپر رائفل بھی ساتھ لے جا سکتا تھا۔ صرف لورا براؤن کا مسئلہ تھا۔ اور اسے بے خبری میں بے ہوش کرنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔

اگلے دن لورا سے ملاقات نہ ہوئی۔ یقیناً وہ خفا تھی۔ میں نے بھی اس کے کمرے کا رخ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صبح سبزہ زار پر بھاگتے وقت میں نے دور سے اسے تیراکی کرتے دیکھا تھا۔ وہ صبح کے وقت باقاعدگی سے تیراکی کرتی تھی۔ میں دوپہر کو یہ شوق پورا کرتا کہ صبح کے وقت اس کی موجودگی میں ایسا کرنا مناسب نہیں لگتا تھا۔ دوسرا دوپہر کی گرمی میں تیراکی کا الگ ہی مزا تھا اور اس کے بعد بھوک بھی خوب کھل جاتی تھی۔

ہمارا اجتماع رات کے کھانے پر ہوا۔ وشال گپتا اپنے منصوبے کے ساتھ پہنچ گیا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے لورا کے کمرے میں بند ہو کر وشال گپتا کا منصوبہ سنا تھا۔ تفصیلات سنتے ہی میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ بکرم سنگھ، دھیرندر شکلا کے ہاں کسی خاص تقریب میں شرکت کو آ رہا تھا۔ وہاں اس نے ایک گھنٹا گزارنا تھا۔ گھنٹے کے دوران ایک سنائپر کو اسے نشانہ بنانے کے کئی مواقع مل سکتے تھے۔ حفاظت کا سخت انتظام تھا۔ شکلا کی محل نما کوٹھی کے ایک کلومیٹر کی حدود میں آنے والی اونچی عمارتوں پر تو سخت پہرہ تھا۔ اس سے زیادہ فاصلے کی عمارتوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یوں بھی بکرم سنگھ کی آمد مخصوص افراد کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں تھی۔ ''شری پتی آرکیڈ'' عمارت کا فاصلہ شکلا کی کوٹھی سے ڈیڑھ کلومیٹر کے بہ قدر تھا۔ اس کی اونچائی پانچ سو فٹ یا ڈیڑھ سو میٹر تھی۔ 45 منزلہ عمارت کی چھت سے دکھاوے کے عمدہ آلات کی موجودگی میں دھیرندر شکلا کی کوٹھی کا سبزہ زار واضح نظر آ سکتا تھا۔ منصوبہ بے داغ تھا۔ ایک اچھے سنائپر کو وہاں سے نشانہ سادھتے ہوئے ذرا بھی دقت نہ ہوتی۔ فائر کرنے بعد فرار ہونا بھی مشکل نہیں تھا۔ انڈیا کی پولیس یا ایجنسیاں اتنی تیز رفتار نہیں تھیں کہ آناً فاناً عمارت کو گھیر لیتیں۔

وشال گپتا نے ایک وڈیو کے ذریعے ضروری جگہوں کی وضاحت کی۔ لورا بھی سب کچھ دلچسپی سے سنتی رہی۔ میں نے ایک دم اپنی حکمت عملی تبدیل کر لی تھی۔ شری پتی آرکیڈ سے فرار ہونا بھی اتنا مشکل نہیں تھا۔

جتنی مشکلات میں سوچے ہوئے تھا۔ شکلا کا شکار اس سے کئی گنا آسان ثابت ہو رہا تھا۔ پورا منصوبہ دشمن نے خود ترتیب دیا تھا، ہتھیار بھی مہیا کر رہا تھا اور ہدف سامنے بٹھا کر نشانے بازی کی دعوت بھی دے رہا تھا۔ میں اب بھی ناشکری کرتا تو یقیناً مجھ سے بڑا بدبخت کوئی نہ ہوتا۔

ہم کافی دیر منصوبے کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ کئی جزئیات زیر بحث لائیں۔ اور آخر کار کارروائی کی ترتیب پر متفق ہو گئے۔ لورا نے مجھے فائر کے لیے تیار کر کے واپس لوٹ آنا تھا۔

مقررہ دن سہ پہر ڈھلے ہم شری پتی آرکیڈ میں پہنچ چکے تھے۔ رہائشی فلیٹوں پر مشتمل اونچی عمارت میں [illegible]
آمدورفت جاری تھی۔ ہمارے لیے پینتالیسویں منزل پر ایک فلیٹ مخصوص تھا۔ جس کا مکین عارضی طور پر کہیں گیا ہوا [illegible]
لفٹ میں داخل ہو کر ہم نے آخری منزل کا بٹن دبایا، لفٹ میں دو تین اور افراد بھی موجود تھے۔ ایک میاں [illegible]
جوڑا، کسی تکرار میں لگا تھا۔ ان کی نوک جھونک نے ہمارے لبوں پر تبسم بکھیر دیا تھا۔ لورا کی سمجھ میں ان کی گفتگو [illegible]
تھی۔ البتہ ہمیں ہنستا دیکھ کر اس کے ہونٹوں میں بھی خوشگوار کھنچاؤ آ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم مطلوبہ فلیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ چابی میرے پاس موجود تھی۔ اندر گھس کر ہم نے [illegible]
بند کیا۔ ایس آر ون اور سنائپنگ کے سامان کے تھیلے بیڈ پر رکھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ہمیں چھت سے [illegible]
تھا۔ لیکن کھڑکی سے شکلا کی کوٹھی کا جائزہ لیتے ہوئے لورا نے خیال ظاہر کیا۔ "چھت کے بجائے کھڑکی سے بیکام زیادہ [illegible]
رہے گا۔"

گو چھت سے فائر کرنا زیادہ آسان تھا۔ لیکن بہ ظاہر وہ میری استاد تھی اور میں جگہ کے انتخاب پر تکرار نہیں [illegible]
تھا۔ البتہ سیکھنے کے بہانے پوچھنے میں مضائقہ نہیں تھا۔ "چھت سے کرا بہتر ہے؟"

اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "سیکھ رہے ہو یا طنز کر رہے ہو۔" کیوں کہ کوشش کے باوجود میرے لہجے [illegible]
استفسار کے بجائے معاصرانہ (ہم پیشہ، ہم رتبہ) عجب در آیا تھا۔

میں نے بات سنبھالی۔ "کیا اتنا اچھا بن گیا ہوں کہ آپ پر طنز کر سکوں۔"

"چھت پر فائر بہتر طریقے سے کر سکیں گے، مگر وہاں مداخلت کا دھڑکا لگا رہے گا۔ اور یقیناً ہدف کی قریبی چھ[illegible]
پر تعینات محافظوں کے پاس شب دید آلات موجود ہوں گے۔" اس نے کشادہ دلی دکھاتے ہوئے وضاحت کی۔ یہ [illegible]
میری نظر سے بھی اوجھل نہیں تھا۔

"کیا اتنی بلندی سے فائر کرتے ہوئے کوئی احتیاط وغیرہ نہیں رکھی جاتی۔" میں نے بلندی و پستی (اپ ہل، ڈاؤن ہل
) سے فائر کرتے وقت رینج میں ہونے والی امکانی کمی کی طرف اسے متوجہ کیا۔ شری پتی آرکیڈ کی بلندی 150 میٹر تھی۔ [illegible]
اتنی بلندی سے فائر کرتے ہوئے فارمولے کے مطابق اصل فاصلے سے کم رینج لگنی تھی۔

مجھے گھورتے ہوئے اس کی آنکھوں میں شکوک کی لہریں نمودار ہوئیں۔ "تمھیں کیسے معلوم کہ اونچائی سے فائر کرتے
ہوئے ایسی احتیاط برتی جاتی ہے۔"

"ایسا کب کہا۔" میں گڑبڑا گیا تھا۔ "آپ نے فائر پر اثر انداز ہونے والے امور کے بارے اتنی جزئیات کا ذکر
کیا تھا۔ تبھی یہ پوچھ بیٹھا۔"

مجھے چند لمحے گھور کر اس نے گہرا سانس لیا اور بیگ سے زاویہ پیما نکال کر مجھے بلندی و پستی کا زاویہ ناپ کر رینج میں کی

کرنے کے طریقہ کار کے بارے سکھانے لگی۔ چند الٹے سیدھے سوال کر کے میں نے سمجھ جانے کا عندیہ دے دیا۔
رات کے وقت دکھاؤ کے حالات سنائپنگ فائر کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہوتے۔ لیکن شکلا کی کوٹھی میں اتنی تیز روشنیوں کا بندوبست کیا گیا تھا کہ دن کا سماں تھا۔ یونہی ایس آرون کی ٹیلی اسکوپ سائیٹ کے اندرونی منظر کو روشن کرنے کو بھی سائیٹ میں خصوصی بندوبست کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے رات کے وقت بھی سنائپر ہدف کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ بشرط ہدف کسی روشن جگہ موجود ہوتا۔ اس کے باوجود وشال گپتا نے مسٹر بکرم سنگھ کی نشست کی اچھی طرح نشان دہی کر دی تھی۔ شکلا نے اپنی جگہ بکرم سنگھ سے چند نشستیں دور رکھی تھی۔ اس سے اس کی بہادری و دلیری پر روشنی پڑتی تھی۔ ویسے بھی شکلا جیسے لوگوں کو میں نے عموماً بزدل و ڈرپوک ہی پایا ہے۔
یقیناً اس کے تیئں بکرم سنگھ سے فاصلہ بڑھانے سے گولی کے اس تک پہنچنے کا امکان نہ رہتا۔ لیکن یہ احتیاط برتتے وقت وہ یہ بھول گیا تھا کہ موت و زندگی کے فیصلے ہماری تدابیر و چالوں کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ یہ اختیار تو اس بااختیار کے قبضہ قدرت میں ہے جس کے سامنے کوئی رکاوٹ، منصوبہ بندی اور حفاظتی اقدام کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وہ جو چاہے وہی ہوتا ہے۔ زندگی دینے پر آئے تو موت خود محافظ بن جائے۔ اور موت کا ارادہ کرے تو حفاظت کا ہر اقدام موت کا پھندہ ثابت ہو۔

شکلا نے بکرم سنگھ کے قتل کا منصوبہ سوچا ہوا تھا اور میں شکلا کی زندگی کے درپے تھا۔ جبکہ مقدر بنانے والا فیصلہ کر چکا تھا کہ کس کی چال نے کامیاب ہونا تھا۔

"تمہیں مطلوبہ کرسی پر رائفل قائم (فکس) کر دیتی ہوں۔ بس ہوا کا خیال رکھنا ہے کہ تیز ہو جائے تو ڈیفلکشن میں مناسب تبدیلی کر دینا۔ یقیناً تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔" اس نے امید بھرے لہجے میں تصدیق چاہی۔

"فکر نہ کریں مادام۔" میں نے اعتماد ظاہر کیا۔

مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے اس نے لکڑی کی میز کھڑکی کے سامنے رکھی۔ اور ایس آرون کو جوڑنے لگی۔ میں بھی ہاتھ بٹانے کو قریب ہو گیا تھا۔ میرے تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مدہم تبسم ابھرا۔

"کبھی کبھی لگتا ہے تم بہت پہلے سے یہ جانتے ہو۔"

میں جلدی سے بولا۔ "آپ نے سکھایا ہی اتنے عمدہ طریقے سے ہے کہ کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔"

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ "تمھاری وضاحتیں میرے شکوک کو مزید پختہ کر دیتی ہیں۔"

میں نے تعجب ظاہر کیا۔ "کیسا شک۔"

"یہی کہ تم پہلے سے سنائپر رائفل کا استعمال جانتے ہو۔"

میں نے منہ بنایا۔ "اور آپ سے چھپانے کی وجہ۔"

"یہی کرید تو مجھے بھی ہے۔" وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

میں نے ٹیلی اسکوپ سائیٹ لگا کر گھٹنے قالین پر ٹیکے اور ایس آرون کا بٹ کندھے میں پھنسالیا۔ شکلا کی کوٹھی کا منظر اسے میری آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔ بہت سارے ملازم بندوبستی کارروائیوں میں مصروف تھے۔

لورا نے فاصلہ ناپنے والے آلے (لیزر رینج فائینڈر) سے ہدف کا فاصلہ ناپا۔ "1475۔" فاصلہ بتا کر اس نے یہ پیما اٹھا لیا۔ رائفل کا بٹ میرے کندھے میں ہونے کی وجہ سے اٹھ گیا تھا۔ اور نال (بیرل) کا رخ ہدف کی طرف زاویہ پیما سے اس نے پستی کا زاویہ دیکھا اور کیلکولیٹر پر انگلیاں مار کر مجھے ایلیویشن بتا دی۔

ایلی ویشن ناب گھما کر میں مطلوبہ رینج لگانے لگا۔ کھڑکی سے ہاتھ نکال کر وہ باد پیما (ونڈ میٹر) سے ہوا کی رفتار ناپنے

تھی۔

''عشاریہ پانچ کلومیٹر۔'' اس نے فی گھنٹہ ہوا کی رفتا بتائی۔ جو اتنی کم تھی کہ ڈفلیکشن ریڈنگ پر کوئی اثر نہیں پڑ رہی تھی۔

ایلیویشن کا جائزہ لے کر اس نے مجھے پیچھے ہونے کا اشارہ کیا اور خود رائفل کے پیچھے بیٹھ کر شست سادھنے لگی۔ پھر ہوکر اس نے بٹ میز پر ٹکایا اور جانے کے ارادے سے کھڑی ہوگئی۔

''مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی ہے۔ گھنٹے، آدھ گھنٹے تک مسٹر بکرم سنگھ پہنچ جائے گا۔ تیزی دکھانے کی بالکل ضرورت نہیں خوب اطمینان وسکون سے لبلبی دبانا۔

''بے فکر رہیں مادام۔'' میں نے اعتماد ظاہر کیا۔

''نجانے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ تم بڑی آسانی سے یہ کرلو گے۔ اور اس وضاحت کی ضرورت تو یقیناً نہیں ہوگی۔ مسٹر بکرم سنگھ کی موت میرے لیے نہایت ضروری ہے۔''

''استاد کو اپنے شاگرد پر اعتماد ہونا چاہیے۔''

''تمھاری کامیابی میرے لیے بڑے معنی رکھتی ہے۔ اور سچ کہوں تو میری انگلی سیکڑوں بار لبلبی دبا کر کمپاؤنڈ کی جھٹکا لے چکی ہے۔ مگر اس قتل پر میرا ضمیر مطمئن نہیں ہو رہا تبھی جا رہی ہوں۔ ورنہ یہ نہایت آسان ہدف تھا۔''

''کہا ناں یہ مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے تسلی دی۔

''مسٹر گپتا نے تمھیں کتنا معاوضہ دینے کا وعدہ کیا ہے؟''

''پانچ لاکھ۔''

اس نے فراخ دلی سے اعلان کیا۔ ''کامیاب ہوجاؤ، اتنی ہی رقم میں بھی دوں گی۔''

اس کی احتیاط کی تاکید اور انعام کی ترغیب پر میرے منہ سے نادانستگی میں نکلا۔ ''اگر انعام میں ڈیٹ پر جانے کا وعدہ بھی شامل ہوجائے تو سو فیصد کامیابی کی ضمانت دیتا ہوں۔'' ایسا میں نے بہ طور مزاح وشرارت کہا تھا ورنہ مجھے ان مسائل سے کوئی غرض نہیں تھی۔ نہ بکرم سنگھ پر گولی چلا کر میں حماقت کا ثبوت دے سکتا تھا۔ میرا ہدف رندھیر سنگھ کا وجود تھا۔ اور اس کی ہلاکت کے بعد میں نے وقتی طور پر غائب ہونا تھا۔ جونہی معاملہ ٹھنڈا ہوتا، پرما انصاری کو اس کی مرضی سے یا زبردستی پاکستان لے جانا تھا۔

ایک دم اس کے چہرے پر تحیر ابھرا۔ آنکھوں میں گہرے شک کی پرچھائیاں نمودار ہوئیں۔ مجھے لگا تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ افغانستان میں وائرلیس پر بات کرتے ہوئے میں اسے کئی بار ڈیٹ پر جانے کا کہہ چکا تھا۔ اور انداز بھی بعینہ یہی ہوا کرتا تھا۔ شرارتی ومزاحیہ۔

اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''کون ہو تم؟''

جواب دینے سے پہلے دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میں اس جانب متوجہ ہوا۔ دروازے میں چابی گھومنے کی آواز کے ساتھ ایک دم دروازہ کھلا اور چار افراد دندناتے ہوئے اندر آئے۔ تمام کے ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھیں، جن پر ''ریڈ ڈاٹ سائیٹ'' لگی ہوئی تھی۔ (ریڈ ڈاٹ ایسی سائیٹ ہے جو فائرر کو نشانہ سادھنے میں بے حد سہولت دیتی ہے۔ اس کا سرخ نقطہ ہدف سے ملا کر لبلبی دبا دو گولی ضائع نہیں جاتی)

کرخت لہجے میں کہا گیا۔ ''ذرا سی حرکت پر بدن میں اتنے سوراخ ہوں گے کہ شمار ممکن نہ ہوگا۔''

گو الفاظ لورا کی سمجھ میں نہیں آئے تھے کہ ہندی میں دھمکایا گیا تھا، لیکن کلاشن کوفوں کے خوفناک دہانے اور ان کا

اندازسب کچھ باور کرانے کو کافی تھا۔

"یہ کیا ہوگیا ہے؟" لورا نے ڈھنگ انداز اختیار کیا۔

"بے بی! تم کی تفصیل تمھیں بہت ساری الجھن ... [illegible] ہوئے انگریزی زبان میں ہدایت جاری کی۔ اس کا لہجہ اور ... [illegible] خصوصی ایجنٹ کرن چاولہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے بدن میں [illegible] رینگنے لگی تھیں۔

لورا پھیکے لہجے میں بولی۔ "تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے چہرے پر [illegible]

کرن چاولہ استہزائی لہجے میں بولا۔ "ہماری غلط فہمی دور کرنے کو تمھیں کافی وقت دیا جائے گا۔"

لورا ہکلائی۔ "م... مجھے پھانسا جا رہا ہے۔"

"نہیں بے بی! تم پھنس چکی ہو۔" اطمینان بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ لورا کے قریب ہوا۔ اس نے ہاتھ میں پانٹک کی مخصوص ہتھکڑی تھی۔ مجھے لگا اس نے غلطی کی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے آدمی اور لورا کے درمیان آ گیا تھا۔ [illegible] بے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔ لورا جیسی سنائپر جو عملی زندگی میں رگڑا کھا چکی ہو، سے بعید تھا کہ فرار کی کوشش نہ کرتی۔ میں بھی حرکت میں آنے کو تیار ہوگیا تھا۔ ایک بار میرے ہاتھ کی رسائی اپنے پستول تک ہو جاتی اس کے بعد بازی پلٹنا [illegible] نہ رہتا۔

کرن کے قریب ہوتے ہی حسب توقع لورا نے حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں بھی ایک دم چوکس ہوگیا تھا۔ لورا کی حرکت کے ساتھ میرے بازو نیچے ہوئے، لیکن اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ ہولسٹر تک پہنچ پاتا لورا ہوا میں اڑتے ہوئے مجھ سے آٹکرائی۔ کرن نے اسے گھما کر میری طرف پھینکا تھا۔ ہم دونوں گر گئے تھے۔

وہ استہزائی انداز میں بولا۔ "شاید تمھیں معلوم نہیں کرن چاولہ ان شعبدوں سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہے۔"

ہمارے سنبھلنے سے پہلے کلاشن کوفوں کی نالیں (بیرل) ہماری گردن سے لگ چکی تھی۔ دو آدمیوں نے ہمیں زد میں لے رکھا جبکہ دو تلاشی لینے لگے۔

لورا کی تلاشی لینے والے نے ذرا بھی رعایت نہیں برتی تھی، بلکہ کچھ زیادہ ہی باریک بینی کا مظاہرہ کیا تھا۔ لورا کے گریبان سے ایک چھوٹا سا پستول برآمد ہوا تھا۔ میرا گلاک بھی ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ کلائی کی گھڑی کے علاوہ انھوں نے میرے پاس کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ گھڑی کے بچ جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ وہ گھڑی ممتا باجی کی نشانی تھی۔ جو انھوں نے بہ طور راکھی میری کلائی پر باندھی تھی۔ گو مسلمانوں میں راکھی باندھنے کا رواج نہیں اور نہ میرا اس پر یقین ہے۔ لیکن اس رسم کے پیچھے جو پاکیزہ و مقدس محبت کا احساس پنہاں تھا اس کا کوئی بدل نہیں تھا۔ ہمارے ہاتھ پشت پر جکڑ دیے گئے۔

"کیا حال ہے سندیپ چوپڑا۔" اس نے شہادت کی انگلی سے میری ٹھوڑی اٹھائی۔

"سس... سس سر غلطی ہوگئی، شما کر دیں۔" میں نے گڑگڑانے میں تیزی دکھائی کہ موجودہ روپ اسی عاجزی کا متقاضی تھا۔

کرن چاولہ کا قہقہہ بلند ہوا۔ "تمھاری بڑی تعریف سنی تھی۔ کیا بکری کی طرح میں میں شروع کر دی ہے۔"

"م... میں لالچ میں آ گیا تھا سر!" اس کا معنی خیز انداز عجیب لگنے کے باوجود میں اداکاری پر ٹکا رہا۔

"کس کو نشانہ بنانے کا ارادہ تھا۔" وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا ایس آر دون کے قریب پہنچا۔ اور ٹیلی اسکوپ سائیٹ

سے آ کھلکائی۔بم نیچے رہے۔
جائزہ لے کر وہ دوبارہ میرے سامنے آیا۔"شکلا صاحب کی کوٹھی تک کتنا فاصلہ ہے۔"
میں دھیرے سے بولا۔"پندرہ سو میٹر۔"
اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔"اور تم تو دو ڈھائی کلو میٹر تک نشانہ بنانے کی اہلیت رکھتے ہو۔"
میرے چہرے پر حیرانی نمودار ہوئی۔اس کا طنزیہ واستہزائی لہجہ اور لورا سے زیادہ مجھے اہمیت دینا ششدر کرنے والا تھا۔
اس نے لمحہ بھر توقف کرتے جواب کا انتظار کیا اور پھر میرے سر پر بم پھوڑا۔"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں راجا ذیشان حیدر؟"
"آ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔میرا نام سندیپ چوپڑا ہے۔"میں نقلی شناخت پر بضد رہا۔
"مجھے غلط فہمی ہو سکتی ہیتھر ی کانت کو نہیں۔"(یقیناً قارئین کو شری کانت یاد ہوگا جو امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران سرداری کی گولی سے زخمی ہوا تھا)
میری آنکھوں میں بے چینی ابھری۔کرن چاولہ زہرخند ہوا۔"صحیح سوچ رہے ہو،تم ابتداء ہی سے ہماری نظر میں ہو۔مجھے بھی محسوس ہو گیا تھا کہ بیڈ کے نیچے کوئی نرگ واسی (جہنمی) چھپا ہے۔بس کچھ سوچ کر مہلت دی تھی۔"
وہ لورا کو مخاطب ہوا۔"بے بی!تم کیوں کو کمینے مسلسل گھور رہی۔بزدل پاکستانی جاسوس مجھ سے خوب صورت تو نہیں ہے۔"
یقیناً اسے لورا کے گھورنے کا اندازہ نہیں تھا۔
"میں نے کوئی جرم نہیں کیا،مجھے جانے دو ورنہ جواب دہی تمھارے لیے مشکل ہوگی۔"
کرن متبسم ہوا۔"ملک کے سپہ سالار کے قتل کی منصوبہ بندی کرنا اور سنائپر رائفل کے ساتھ یوں رنگے ہاتھوں گرفتار ہونا کہ رائفل سپہ سالار کی کرسی پر قائم (فکس) کی گئی ہو۔تمھاری نظر میں کوئی جرم نہیں ہے۔"
"یہ ثابت کرنا آسان نہیں ہوگا۔میں انڈیا میں رائفل کا سودا کرنے آئی ہوں اور بس "
کرن چاولہ اس کی بڑبڑ سے محظوظ ہوا۔"یہاں کیا کر رہی تھیں؟"
"مسز گپتا نے بلوایا تھا۔"لورا پہلے جھٹکے سے سنبھل گئی تھی۔
"پاکستانی جاسوس کی سہاتا (مدد) کر کے تمھاری مشکلات کتنی بڑھا چکا ہے اس کا اندازہ تمھاری سوچ سے بعید ہے۔"
"میں اسے نہیں جانتی۔"لورا مجھے پہچاننے سے مکر گئی تھی۔
کرن معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔"تو تربیت کیوں دے رہی تھیں۔"
"کوئی ثبوت۔"وہ انکار پر ڈٹی رہی۔
"بہت سارے ہیں۔"اطمینان سے کہتے ہوئے وہ اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔"بھاگنے والے کی لاش پا کر بھی تم سے باز پرس نہیں ہوگی،مگر کوئی نکل گیا تو ذمہ دار کی جان بھی ضرور نکلے گی۔"
"مسٹر کرن!یقیناً تم غلطی کر رہے ہو۔"لورا جان چھڑانے کی کوشش میں لگی رہی۔
"غلطی تو تم کر چکی ہو بے بی۔اب خمیازہ بھگتو۔اور یہ غلط فہمی بھی دل سے نکال دو کہ شکلا صاحب تمھاری مدد کر پائیں گے۔"
"پچھتاؤ گے۔"لورا ہار ماننے پر تیار نہیں تھی۔

اخلاقیات سکھاؤ گے۔"

میں ہونٹ بھینچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ کم ظرف دشمن سے اچھائی کی توقع عبث تھی۔

لفٹ کی حرکت رکنے پر میری خلاصی ہو پائی تھی۔ دروازے کی طرف دھکا دے کر اس نے میری تشریف پر لات رسید کی، میں بہ مشکل گرنے سے بچا تھا۔

اپنی بے عزتی اور میری ٹھکائی کرا کر لورا براؤن کے منہ پر بھی ڈھکن لگ گیا تھا۔

ہمیں لیے وہ پارکنگ میں پہنچے جہاں کالے شیشوں والی ویگن کھڑی تھی۔ اندر بٹھا کر انھوں نے ہمارے سروں پر موٹے کپڑے کے نقاب چڑھائے، یوں کہ کچھ بھی نظر آنا ممکن نہیں رہا تھا۔

ہلکے سے جھٹکے سے ویگن آگے بڑھی اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ہم گھنٹا بھر سفر میں رہے، اس دوران ٹریفک کی آواز، ہارن کا شور، انسانوں کی چیخ و پکار تسلسل سے ہماری سماعتوں میں گونجتی رہی۔ ویگن رکی اور لوہے کا بھاری دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ ویگن آگے بڑھی، ہلکی سی چڑھائی کے بعد تھوڑا سا ریننگی اور دوبارہ رک گئی۔ کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر بے دردی سے باہر گھسیٹا۔ میرا گھٹنا بری طرح سیٹ سے ٹکرایا تھا۔

ایسا ہی کچھ لورا کے ساتھ بھی ہوا تھا کیوں کہ اس کا زوردار انداز میں ''وحشی، جانور'' کہنا میری سماعتوں تک پہنچ گیا تھا۔ بے چاری کو دوہری اذیت کا سامنا تھا۔ ایک جوان عورت جو خوب صورت بھی ہو، اسے قیدی بننے کے بعد کیا کچھ سہنا پڑ سکتا ہے اس کا اندازہ کرنے کو زیادہ عقل مند ہونا نہیں، صرف بالغ ہونا کافی ہے۔ اور جب قید کرنے والے اخلاقی اقدار اور شرم و حیا کے تقاضوں سے ناواقف ہوں تب تو تبصرے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

''تمھیں بدتمیزی کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' لورا نے جھلائے ہوئے لہجے میں احتجاج کیا تھا۔ یقیناً کسی کم ظرف شہدے نے ہاتھوں کی آوارگی سے اپنی غلیظ سوچوں کو اجاگر کیا تھا۔

ہلکے سے قہقہے کے ساتھ مکروہ ارادہ ظاہر ہوا۔ جو یقیناً لورا کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ ہندی میں کیا گیا تھا۔

''کتی کے بچے، غلیظ سور......'' لورا کے ہونٹوں سے مغلظات نکلیں۔ جو ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ فراخ دلی سے اوباش فطرت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مجھے لورا براؤن سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ دھیر ندر شکلا جیسے بڑے شخص کو دھتکارنے والی نچلے درجے کے ملازموں میں پھنس گئی تھی۔ گو ان کا حوصلہ دست درازی سے آگے نہ بڑھتا، مگر ایسی گھٹیا حرکتوں کو برداشت کرنا بھی تو کسی عورت کے لیے کاردار ہوتا ہے۔ اور ان کے بڑوں کو تو یقیناً کوئی روک ٹوک نہیں ہونا تھی۔

دو تین موڑ مڑ کر ہمیں سیڑھیاں اترنا پڑیں۔ احتیاط سے قدم لیتے ہوئے میں سیڑھیاں گنتا رہا۔ بارہ قدمچوں کے بعد ہموار فرش شروع ہو گیا۔ دس پندرہ قدموں کے بعد ہمیں رکنے کی ہدایت ملی، تالے میں چابی گھومی اور دروازہ کھلنے کی آواز ابھری۔ کسی نے میری ہتھکڑی کھول کر سر سے غلاف ہٹایا، اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہوا۔

میری آنکھوں کے سامنے قریباً چھے فٹ چوڑا اور دس فٹ لمبا کمرہ تھا۔ جس کے ایک کونے میں تین مربع فٹ کا پانچ فٹ بلند بیت الخلاء بنا تھا۔ باقی کمرہ ہر قسم کے ساز و سامان سے عاری تھا۔ میں پیچھے مڑا۔ داخلی دروازہ حوالات کی طرح لوہے کی مضبوط سلاخوں کا بنا تھا اور پوری دیوار جتنا چوڑا تھا۔ میرے محبس (قید خانہ) کے سامنے ہی لورا کا زندان تھا۔ دونوں کوٹھڑیاں ایک ہی حجم، ساخت اور ہیئت کی تھیں۔ درمیان میں تین فٹ کی گلی تھی۔ جو اتنی چوڑی تھی کہ ہم سلاخوں سے ہاتھ نکال کر ایک دوسرے کو باآسانی چھو سکتے تھے۔

وہ مجھے گھور رہی تھی۔ بھوری آنکھوں میں فکر مندی اور تشویش اس کی اندرونی حالت کا پتا دے رہی تھی۔ ہمیں لانے والے واپس جا چکے تھے۔

وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی اور پھر سلاخوں کے قریب کمرے کی داخلی دیوار سے ٹیک لگا کر پاؤں پسارتے ہوئے متفسر ہوئی۔ ''مجھے پھانسنے کی سازش میں تم بھی شریک تھے۔''

میں ہنسا۔ ''پھانسا مجھے گیا ہے محترمہ۔''

''تو تم ایس ایس ہو۔'' اس کی نظریں کمرے کی چھت سے میرے چہرے پر منتقل ہوئیں۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا نام راجا ذیشان حیدر ہے۔''

''میجر ہیتھر ہنڈلے سے تمھاری بابت کافی معلومات ملی تھیں۔''

''وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''صرف دوست۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ایسی مخلص دوست جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتا ہوں۔ جس کے میری ذات پر کئی احسان ہیں۔ اور جو مجھے اتنی ہی پیاری ہے جتنا کسی کو محبوبہ ہو سکتی ہے۔''

''تم نے مجھے زندہ کیوں چھوڑا تھا، حالاں کہ تمھارے نشانے پر تھی۔'' یہ سوال اس نے مجھ سے تب بھی پوچھا تھا جب میں نک کو ٹھکانے لگا چکا تھا۔ بلکہ بہ قول جینی میرا یہ فعل لورا کے نزدیک کسی خاص احساس کے تابع تھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''کیوں کہ تم پر گولی نہ چلانے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اور ایک مسلمان کو وعدہ خلافی زیب نہیں دیتی۔''

اس نے انکشاف کیا۔ ''مجھے تم سے نفرت ہے۔''

میں نے صفائی دی۔ ''کیا لگتا ہے، میں نک کو چھوڑ دیتا تو موقع ملنے پر وہ بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کر پاتا۔''

''یہ فلسفہ میرے دل سے تمھاری نفرت کا گراف کم نہیں کر سکتا۔''

''مجھے تمھاری نفرت سے مسئلہ ہے نا محبت سے غرض۔ اتفاقاً ایک کشتی میں سوار ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہماری منزل بھی ایک ہے۔''

اس نے ارادہ ظاہر کیا۔ ''جب بھی موقع ملا میں نک کی موت کا بدلہ ضرور لوں گی۔''

''کوئی اور بات کرو۔'' بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگائی اور پاؤں پسار لیے۔

وہ برہم ہوئی۔ ''میری دھمکی تمھیں گیدڑ بھبکی لگ رہی ہے۔''

میں نے اسے موجودہ صورت حال کی طرف متوجہ کیا۔ ''تمھارے ساتھ آخر کیا مجبوری تھی کہ اس دلدل میں گردن پھنسالی۔''

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''تمھیں میری فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید لفٹ میں طبیعت صاف نہیں ہوئی تھی۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''فوج کی نوکری کیوں چھوڑی۔''

اس نے دانت پیسے۔ ''تاکہ تمھیں ڈھونڈ کر ٹھکانے لگا سکوں۔''

میں ہنسا۔ ''ڈھونڈا تو تمھیں میں نے ہے۔ بلکہ اپنا استاد بھی بنالیا ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''تربیت کی شروعات سے جانتی تھی کہ تم سنائپر ہو۔''

میں نے طعنہ کسا۔ ''جھوٹی۔''

''بکواس بند کرو۔''

''ٹھیک ہے مادام! اب جھگڑا چھوڑو اور اس صورت حال سے نکلنے کا حل سوچو۔''

"تمہیں چھوڑوں گی تو نہیں۔" اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

میں شرارت سے بولا۔ "کون کم بخت چاہے گا کہ تم جیسی لڑکی اسے چھوڑ دے۔"

"سوچ لینے دو، یہ ہمارا معاملہ ہے۔"

"یہ تو تمہیں صرف کہاں پتے کی مہارت ہے، آن بانا چار دھمکیاں دینے میں بھی عالی نہیں رکھتیں۔"

اس نے دانت پیسے "یہ تو وقت بتائے گا۔"

میں بیزاری سے بولا۔ "اچھا جتنی دھمکیاں یاد تھیں ایک ساتھ اگل دو تاکہ اس کے بعد کوئی بات کر سکیں۔"

اس نے آنکھیں بند کرکے خاموشی سادھ لی تھی۔ میں بھی سوچ میں کھو گیا۔ کرن چاولہ کا کہنا کہ میں شروع سے نظروں میں تھا مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اگر ایسا تھا تو شالی گپتا کی شخصیت بھی مشکوک ٹھہرتی تھی۔ سوال یہ تھا کہ مجھے پہلے گرفتار کیوں نہ کیا گیا۔ اور اب ایسا کرنا کیوں ضروری تھا۔ یہ تو بالکل واضح تھا کہ کرم سنگھ کے قتل کے منصوبے میں میری شمولیت شالی گپتا کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ایک خیال یہ بھی ذہن میں ابھرا کہ جب تک میں پھانسا گیا۔ ایک پاکستانی جاسوس جب انڈین آرمی چیف کو قتل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو عالمی برادری نے تو متوجہ ہونا تھا۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ نہ تو ان کے پاس ایسا کوئی ثبوت تھا کہ مجھ پر یہ جرم ثابت کر سکتے اور نہ کرم سنگھ کو قتل کرنے کی کوئی خاص وجہ تھی جس کے سہارے وہ پاکستان پر الزام عائد کرتے۔ ہمارا "شری چقی آر کئے تھے" مع سنائپر رائفل کے پکڑے جانا کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جو دنیا کو قابل قبول ہوتا۔ وہ فقط میرا پاکستانی ہونا یا زیادہ سے زیادہ جاسوس ہونا ثابت کر سکتے تھے۔ اور دونوں ممالک میں آئے روز ایسے جاسوسوں کی پکڑ دھکڑ ہوتی رہتی ہے۔ اتفاق سے مجھے کرم سنگھ کے قتل کی اصل وجہ بھی معلوم تھی۔ کہ دھیرندر شکلا اسے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔

قدموں کی چاپ نے مجھے خیالوں سے نکالا۔ وہ تین مسلح افراد تھے۔ لگا لورا براؤن کا بلاوا آگیا ہے۔ مگر انھوں نے میرے قید خانے کا دروازہ کھولا۔ دو آدمیوں نے ہتھیار تانے اور تیسرا میرے ہاتھ جکڑنے لگا۔

لورا انھیں کڑی نظروں سے گھورنے لگی۔ مگر انھوں نے لورا کو کچھ نہیں کہا تھا۔ میرے سر پہ سیاہ نقاب ڈال کر بصارتوں پر پردہ ڈالا اور قید خانے سے باہر لے آئے۔ میرا خیال تھا سیڑھیاں چڑھنا پڑیں گی۔ مگر ایک دو موڑ مڑ کر وہ نیچے اترنے لگے۔ بارہ، تیرہ سیڑھیوں کے اختتام پر چند قدم ہموار فرش پر لیے اور مجھے روک دیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" کرخت آواز میری سماعتوں میں گونجی، ساتھ ہی بازوؤں سے پکڑ کر نیچے کی طرف جھٹکا دیا گیا۔ میں دھپ سے نیچے بیٹھا۔ لوہے کی کرسی کا لمس محسوس ہوتے ہی میں نے جھرجھری لی۔ یقیناً وہ وقت آگیا تھا جس کا اندیشہ جاسوس کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے۔

ہتھکڑی کھول کر میرے ہاتھ کرسی کے دستے اور پاؤں کرسی کے پایوں سے باندھ دیے گئے۔ کرسی کے پائے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔

کسی نے نقاب کھینچا، میری نظر سب سے پہلے کرن چاولہ کی منحوس شکل پہ پڑی تھی۔ یقیناً بعض اچھی صورتوں کے عقب میں بھیانک چہرے چھپے ہوتے ہیں۔ وہ اچھا خاصا پرکشش اور وجیہہ مرد تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی مضبوط اور سڈول نظر آتا تھا۔ جس اطمینان سے اس نے لورا کا حملہ ناکام کیا تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اچھا لڑاکا تھا۔

دوسرے کے بارے دل میں پیدا ہونے والے احساسات شکل و صورت اور خوب صورتی و بدصورتی کی تمیز سے مبرا ہوتے ہیں۔ کبھی نہایت بدصورت نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر انسان کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے اور دل میں خوشی کی لہریں دوڑ پڑتی ہیں، جبکہ نہایت خوش شکل و خوبرو شخص کو دیکھ کر انسان بیزاری، کوفت اور تنگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس

کے چہرے سے ہٹا کر میں نے نظریں گھمائیں، دیواروں پر ایذا رسانی کے مختلف آلات لٹکے ہوئے تھے۔ چھت میں
لوہے کے مضبوط کڑے لگے تھے جن کے ساتھ زنجیریں لٹک رہی تھیں، جو قیدی کو الٹا لٹکانے کے لیے تھیں۔ چاروں طرف
سرسری نظر دوڑا کر میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
''کیا حال ہے جوان؟'' گفتگو کی ابتدا اس نے یوں کی گویا میرا انٹرویو لے رہا ہو۔
''الحمد اللہ۔'' میں نے منہ سے چپ کا قفل اتارنا غنیمت جانا تھا۔
''ایسی چوڑی تفصیلات میں پڑنے کے بجائے بس اتنا کہو، دوکھماری انڈیا آمد کا مقصد کیا ہے؟''
''بتانے کا فائدہ، جب تم نے یقین ہی نہیں کرنا۔''
وہ دوستانہ انداز میں متبسم ہوا۔ ''کوشش تو کرو۔''
''ذاتی کام سے یہاں آیا ہوں۔ جاسوسی کا ارادہ ہے، نہ دہشت گردی مقصود ہے۔''
وہ مزاحیہ لہجے میں بولا۔ ''اور ذاتی کام کی نوعیت انڈین آرمی چیف کا قتل ہے۔''
''اگر یہ تمھاری نظر میں تھا تو یقیناً اصل وجہ سے بھی واقف ہو گے۔''
''بدقسمتی ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''البتہ تمھارے مشن سے لاعلم ہوں۔''
''مجھے اپنے دشمن کی تلاش یہاں کھینچ لائی ہے۔''
''کون ہے؟''
''راج پال۔'' (راج پال امریکہ کورس میں ہمارے ساتھ تھا، بعد میں سردار کے ہاتھوں وزیرستان میں قتل ہوا اب میں نے اسی کا نام استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا)
''راج پال؟'' اس نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔
میں نے کہانی گھڑی۔ ''شری کانت کے ساتھ یہ صاحب بھی امریکہ کورس میں ہمارے ساتھ تھا۔ بعد میں افغانستان محاذ پر اس کی وجہ سے میری بیوی معذور ہوئی۔ اور اسے معلوم تھا کہ پلوشہ میری بیوی ہے تبھی اس نے گھٹیا حرکت کی۔ یقیناً بدلہ لینا میرا حق بنتا ہے۔''
مجھے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے نشست چھوڑی اور عقوبت خانے سے باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد واپس آ کر اس نے نشست سنبھالی۔
''کہانی اچھی گھڑی ہے۔''
میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''کہا تھا، یقین نہیں کرو گے۔''
وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر تمھارا خیال ہے، راج پال کی موت کی خبر بھارت سرکار تک نہیں پہنچی تو اسے سادگی کے علاوہ کوئی نام نہیں دے سکتا۔''
''راج پال کی موت؟؟؟'' میں نے گہرے تعجب کا اظہار کیا تھا۔
اس نے تنبیہ کی۔ ''جان بچانے کی کوشش میں خود کو مزید پھنسا رہے ہو۔ راج پال کا ذکر تمھیں اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے۔''
میں نے ڈینگ مارتے ہوئے ارادہ ظاہر کیا۔ ''اگر مر چکا ہے تو اللہ پاک کی قسم میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوا۔ اور زندہ ہے تو میری زندگی کی صورت میں اس کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔''
وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔ ''برخوردار! خالی خولی قسموں کو ثبوت نہیں مانا جاتا، بلکہ تمھارے مذہب میں بھی ملزم کو قسم

کھانے کے بل بوتے پر بے گناہ تصور نہیں کیا جاتا۔"
میں نے پوچھا۔" کیسے یقین آئے گا؟"
وہ اطمینان سے بولا۔" سچ سن کر۔"
میں نے اختتام کی مار دینا چاہی۔" سچ تو بتا دیا ہے،اب کون سا جھوٹ سنا ہے اس بارے رہنمائی کر دو، سے نا
دیر تسلیم کر دوں گا۔"
"سلطان دادا سے کیا تعلق ہے؟"
"کوئی نہیں،صرف سر چھپانے کو ٹھکانہ چاہیے تھا۔"
"جانتے ہو تم نے کتنے افراد کو قتل کیا تھا۔"
"قتل میرے مرنے والے ساتھی نے کیے تھے،میں بے قصور ہوں۔"
وہ کھل کھلا کر ہنسا۔" جس کے ہاتھ میں تم نے پستول پکڑا یا تھا اس کے گرنے کا انداز بتا رہا تھا کہ گولی چلانے والا
نہیں ہے۔ایک نظر ڈال کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اصل قاتل کوئی اور ہے۔تبھی تمھیں وہاں سے نکلنے کا موقع دیا تاکہ
تمھارا مشن کھل جائے۔"
"آپ جو سمجھیں،میرا بیان یہی ہے کہ گولی چلانے والا میں نہیں ہوں۔"
"عام آدمی یوں درست فائر نہیں کر سکتا،ایسا کوئی پیشہ ور سنائپر ہی کر سکتا ہے۔جو تم ہو۔"
میں نے رد کیا۔" سنائپر مخصوص رائفل سے اچھا فائر کر سکتے ہیں،پستول سے نہیں۔"
"میں نہیں مانتا عام مجرم اتنے منضبط طریقے سے ایجنسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔تمھیں یہاں
پہلے سے موجود جاسوسوں کی مدد حاصل تھی۔اور بہتر ہو گا تمام جاسوسوں کے ٹھکانے اگل دو۔"
"جب جاسوس پکڑا جاتا ہے تو کیا اس کے ساتھی اپنے ٹھکانوں پر ٹکے رہتے ہیں۔"
معنی خیز مسکراہٹ سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔" یقیناً ایسا نہیں ہوتا۔البتہ اپنے قتل ہونے والے ساتھیوں کی خبر پر
ٹھکانے تبدیل کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس کی جاتی ہے۔"
میں نے سلطان دادا کے اڈے اور اس سے متصل ہوٹل کے بارے صاف گوئی سے اگل دیا۔اس کے ساتھ ہی
دماغ میں ممتا باجی کا معصوم چہرہ لہرایا اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔یقیناً میرے وہاں چھپنے سے وہ ناواقف نہیں
تھے۔اور اگر تفتیش کے نام پر وہ باجی کو بھی پکڑ لیتے تو یقیناً اس سادہ گھریلو عورت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔اور
اس پر یہ مصیبت میری وجہ سے ٹوٹنا تھی۔
"تمھارے اور گوپال (ڈینو) کے ٹھکانے جانتے ہیں۔ہمیں دیپک کا ٹھکانہ بتاؤ۔" ڈینو کے ساتھ شہید ہونے
والے مجاہد کا شناختی نام دیپک تھا۔یقیناً اس کے اصل نام سے کرن بھی ناواقف تھا۔بلکہ اسے تو ڈینو کا نام بھی معلوم نہیں
تھا۔البتہ میرا نام اسے شری کانت سے معلوم ہو گیا تھا۔وہ منحوس جانے کہاں سے ٹپکا تھا۔
میں نے نفی میں سر ہلایا۔" معلوم ہوتا تو بتا دیتا۔"
کرن کا استفسار جاری رہا۔" تمھارے پاس ان کے رابطہ نمبر ہوں گے۔"
میں نے بے دھڑک پیش کش کی۔" میرے موبائل فون کو کھنگال سکتے ہو۔"
گردن ٹیڑھی کر کے اس نے ہاتھوں کو آپس میں مسلا،ترچھی نظر سے دیوار پر لٹکے چمڑے کے ہنٹر کو لمحہ بھر گھورا اور
پھر گہرا سانس لے کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔" تو تم نے طے کر لیا ہے۔"

میں نے بے چارگی ظاہر کی۔ "طے تو تم نے کرنا ہے۔ مجھے تو سہنا ہوگا۔" البتہ دلی طور مجھے اطمینان محسوس ہونے لگا تھا کہ اس نے استاد یدی کے ٹھکانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

وہ زہر خند ہوا۔ "تم چند منٹوں میں سب کچھ اگل دیتے، مگر میں بے بس ہوں۔"

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا، لیکن بے نیازی ظاہر کیے بیٹھا رہا۔

"گوتم۔" وہ نشست چھوڑتے ہوئے کھڑا ہوا۔

"جی سر۔" دیوار کے ساتھ کھڑا مضبوط تن و توش کا کرخت صورت شخص ہوشیار (اٹن شن) ہو گیا تھا۔

"یار! میرے ہاتھ تو بندھے ہیں، تم ہی کسی طریقے سے اگلوا لینا۔ ہدایت یہی ہے کہ پیار محبت سے پوچھنا۔ بلکہ یہ درخواست سمجھو کہ اسے جسمانی اذیت نہ دینا۔ میرا مطلب میں درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ تم میرے نہیں سرکار کے ملازم ہو۔" وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ "ذیشان صاحب اجازت چاہوں گا۔" اور لمبے ڈگ رکھتا باہر نکل گیا۔

گوتم کی تیز نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ نپے تلے قدم رکھتا ہوا وہ میرے قریب پہنچا۔ "پہلا مجرم دیکھا ہے جس پر کرنل صاحب اتنے مہربان نظر آ رہے ہیں۔" میں خاموش رہا کہ ان کے رویے کا سر پیر میری سمجھ سے باہر تھا۔

"خیر یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ ان کی مجبوری میرے قدموں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ اس لیے ہم کھیل جاری رکھتے ہیں... تمھارا نام۔"

میں شرافت سے بولا۔ "ذیشان حیدر۔"

"عہدہ؟" (رینک)

"سپاہی۔"

"انڈیا آمد کا مقصد؟" اس کے سوال جاری رہے۔

"اپنے دشمن کا خاتمہ۔"

وہ برہم ہوا۔ "دوبارہ پوچھ رہا ہوں۔ انڈیا آمد کا مقصد؟"

"جتنی بار پوچھو گے یہی جواب ملے گا کہ اس کے علاوہ بتانے کو کچھ نہیں ہے۔"

اس کا ہاتھ گھوما۔ "چٹاخ۔" کی آواز سے عقوبت خانہ گونج اٹھا تھا۔ "اب بتاؤ انڈیا کیوں آئے ہو۔"

"بتا چکا ہوں۔"

"حقیقت تیرا باپ بھی اگلے گا پتر۔" اس نے مجھے مسلسل تھپڑوں پر رکھ لیا تھا۔ میں نے سختی سے دانت بھینچ لیے تھے ورنہ خدشہ تھا کہ میرے جبڑے اتر جاتے۔ ہونٹوں کی اندرونی کھال پھٹ گئی تھی اور منہ میں نمکین ذائقہ پھیل گیا تھا۔ تھپڑوں کی بارش رکتے ہی میں نے خون ایک طرف تھوک دیا۔ ہونٹ اندر سے پھٹ گئے تھے۔

"سربن! زنجیر نیچے کرو۔" اس نے اپنے ساتھی کو آواز دی۔

"جی استاد جی۔" کہہ کر وہ ایک چرخی گھمانے لگا جس کے ساتھ زنجیر لپٹی تھی۔

زنجیر نیچے آتے ہی اس نے کرسی کے ہتھوں سے میری کلائیاں آزاد کر کے زنجیر کے حلقوں میں جکڑ دیں۔ چھت میں جڑے کڑے کرسی سے ہٹ کر جڑے تھے۔ میرے پاؤں بھی آزاد کر کے انھیں عین کڑوں کے نیچے کھڑا کیا اور سربن چرخی گھمانے لگا۔ جلد ہی میرے ہاتھ اوپر اٹھ گئے تھے۔

گوتم نے میری قمیص پھاڑ کر میرا بالائی جسم برہنہ کر دیا تھا۔

"رودی تمھاری باری۔" اس نے کالے ڈشکرے کو آواز دی۔

لذت بھرے انداز میں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے دیوار پر لگا ہوا کوڑا اتارا اور بلند کر کے ہوا میں لہرایا۔ "شڑاپ شڑاپ۔" کی بھیانک آواز نے مجھے آنے والے برے لمحات کی آگاہی دی۔ لیکن وہ عذاب مقدر میں تھا۔ مجھے ذرا بھی یقین ہوتا کہ اصل بات اگل کر میں اپنا چھٹکارا ممکن کر سکتا ہوں تو بتا دیتا۔ مگر یہ خام خیالی تھی۔ بلکہ الٹا مجھے جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔
روی کے ہنٹر پکڑنے کا انداز واضح کر رہا تھا کہ وہ اس میدان کا کھلاڑی تھا۔
گوتم کا۔ "انکار کس بات کا ہے۔" سنتے ہی اس نے چند قدم دور سے ہاتھ لہرا کر میری طرف بھیلا۔
اذیت کی شدید لہر اٹھی، کوشش کے باوجود میں اپنی کراہ نہیں روک سکا تھا۔ ہنٹر کی رسائی پیٹھ کے ساتھ پیٹ کے کچھ حصے تک پہنچی تھی۔ عقب کا تو معلوم نہیں البتہ پیٹ پر گہرے سرخ رنگ کی لکیر ثبت ہو گئی تھی۔ لگتا تھا کسی نے خنجر کی نوک سے لکیر کھینچ کر اندر سرخ مرچیں بھر دی ہوں۔
روی کا ہاتھ تسلسل سے چلنے لگا۔ ظالم کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا مجھ سے پرانی دشمنی ہے۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، لیکن رہ رہ کر سسکی و کراہیں ہونٹوں سے پھسل جاتی تھیں۔ چند منٹوں میں میرے پیٹ پر بھی چھائیاں (کوڑے لگنے کے نشان جو سرخ لکیروں کی صورت ظاہر ہوتے ہیں) پھیل گئی تھیں جن سے ہلکا ہلکا خون رسنے لگا تھا۔ پیٹھ کا تو جانے کیا حال تھا۔
اور پھر درد سے بے حال ہو کر میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ لیکن مدہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر تھا۔ ایک دم لگا پیٹھ پر تیزاب پھینکا گیا ہو۔ درد بھری کراہ سے میری آنکھ کھلی۔ وہ میری پیٹھ پر نمک چھینک رہے تھے۔ زخموں میں پہلے مرچیں بھری تھیں اب نمک نے تکلیف کو زیادہ کر دیا تھا۔
"کچھ یاد آیا۔" گوتم نے سامنے آ کر پرسکون انداز میں پوچھا۔
ہونٹ بھینچے ہوئے میں ناک سے گہرے سانس لے رہا تھا۔
"جوان یاد رہے، سب کچھ اگلنا پڑے گا۔ اس سے پہلے تمھیں مرنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی۔ تو بہتر ہے اذیتیں جھیلنے کے بغیر ہی سب کچھ بک دو۔"
میں کراہتے ہوئے بولا۔ "تم صرف اذیت رسانی کا شوق پورا کر رہے ہو۔"
وہ اطمینان سے بولا۔ "تمھیں جھٹلا نہیں سکتا، البتہ سچ بتا دو تو تھوڑے ہی پر اکتفا کر لیں گے۔ ضروری تو نہیں ہمیشہ شوق پورا ہو۔"
میں نے بے بسی ظاہر کی۔ "سچ، جھوٹ کی پہچان کیسے ہو گی۔"
"اتنا تجربہ تو رکھتے ہیں بالک۔"
"سچ تو بتا چکا ہوں جو تم مان ہی نہیں رہے۔"
وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہوا۔ "بھائیو اب تک رسی ہی نہیں جلی تو بل کیا دیکھوں۔"
سربن زہرخند ہوا۔ "رسی جلے نہ جلے بل ضرور نکلیں گے۔"
گوتم نے دعوت دی۔ "تو تمھاری باری۔"
وہ الماری کی طرف بڑھا واپسی پر ہاتھ میں لوہے کا گولا تھا جس کے ساتھ دو تین فٹ زنجیر جڑی تھی۔ زنجیر کے سرے پر حلقہ بنا تھا۔
"بندش ڈھیلی کرو۔" اس نے روی کو آواز دی۔ اور انتظار کیے بغیر میرے بالوں سے پکڑ کر بے دردی سے نیچے جھکا

دیا۔ جب تک دیکھ ڈھیلی نہ ہوتی وہ بالوں کو مسلسل تانے رہا ... [illegible] ... میں نے بہت اچھل کود کی ... [illegible]
جھٹک کا تھا میرے بالوں ... [illegible]

مرہٹی نے لواری ... میرے گلے میں ... [illegible]
گری بند ہا تھا اور پیچھے بھی کوئی نہیں ... [illegible]

مرہٹی دوبارہ الماری کی طرف بڑھا اور ایک ... [illegible] ... سے تین چار ... [illegible]
جڑی تھی۔ میرے سر پر تھیلے کا منہ ... [illegible] ... دی۔

سوچا تھیلے میں موجود ہوا جلد ہی ختم ہو جائے گی اور مجھے سانس گھٹنے لگے گا ... [illegible] ... پہنچ رہی تھی کہ وہ
ظالم بڑا اور ... ہوئے تھا۔ اس نے ماچس جیب سے ... [illegible] ... لگا دیا۔

تھیلے میں پانی تک کے ساتھ جڑی زنجیر کھول کر اس نے تین گولیاں اندر پھینکیں اور زنجیر چڑھا دی۔ وہ تین گولیاں بعد ہی گولیوں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا۔ جب انکشاف ہوا کہ وہ آنسو گیس پیدا کرنے والی گولیاں تھیں۔ مختلف ٹریننگ کورسوں کے دوران ہمیں کیمیائی ماحول کا اور اس کے ... آنسو گیس ... سے بھی واسطہ پڑتا تھا جہاں یہی گولیاں جلا کر زہریلی گیس کی تباہ کاری کے بارے سمجھایا جاتا تھا۔ مگر وہاں پر ایک دو منٹ کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ پہلے تو میں نے سانس روک کر دو تین لمحے اذیت کو ٹالا، مگر کب تک سانس روک پاتا۔ گولیاں تیزی سے دھواں اگل رہی تھیں۔ وہی تھیلے میں گنجائش بھی کم تھی اس لیے دھواں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جونہی میں سانس لینے پر مجبور ہوا میرے تنفس کی نالی میں مرچیں بھر گئی تھیں۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود آنسو تسلسل سے بہنے لگے، نیز ناک سے پانی بہہ نکلا۔ میں بری طرح کھانس رہا تھا، جھٹکے دے کر تھیلے سے سر نکالنے کی کوشش کی مگر وزنی گوا۔ مجھے گردن ہلانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں زیادہ دیر اس اذیت کو برداشت نہ کر سکا اور بے دم ہو کر زنجیر سے جھول گیا۔ ناک میں گھسنے والا زہریلا دھواں مدہوش بھی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اگر چند لمحے مزید یہ حالت رہتی تو یقیناً مر جاتا، مگر وہ یہ سہولت دینے پر بھی تیار نہیں تھے۔ میرے تڑپنے کی شدت میں کمی آتے ہی انھوں نے گردن کی بندش ڈھیلی کر کے تھیلے کو اوپر سے پکڑ لیا تاکہ دھواں کمرے کی فضا کو آلودہ نہ کر دے۔

تازہ ہوا ملتے ہی میں گہرے سانس لینے لگا۔ ناک سے رینٹ اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ تنفس کی نالی اور پھیپھڑوں میں جیسے مرچیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ظالم نے میری کھال ادھیڑ کر جلد کو اذیت پہنچائی تھی تو دوسرے نے اندرونی نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔

اس نے مجھے زیادہ آرام کا موقع نہیں دیا تھا۔ تین چار گہرے سانس ہی لے پایا تھا کہ اس نے پھر میرے سر پر تھیلا چڑھا دیا۔ کھانس کھانس اور چھینک چھینک کر میں بے حال ہو گیا تھا۔ لگ رہا تھا صدیوں سے اس اذیت میں پھنسا ہوں۔ اور یہ کھیل تب تک شروع رہا جب تک میں زنجیر سے جھول نہیں گیا تھا۔

پانی کا جگ میرے چہرے پر انڈیل کر وہ ہوش میں لائے تھے۔ اندرونی اذیت میں مجھے جسمانی تکلیف بھول گئی تھی۔

گوتم رضا ”بتا دے شہزادے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بنے ہوئے ہو۔“
مگر میں جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ گہرے سانس لے کر آنسو گیس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔
وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”دونوں ہی ڈھیٹ ہو مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“
میں ذہنی طور پر نئی اذیت کا سامنا کرنے پر تیار ہو گیا تھا کہ اب یوں بھی یہی میرا مقدر تھا۔ اس نے بہت سادہ

طریقہ اپنایا تھا۔ میری کلائیوں سے بجلی کی ننگی تار لپیٹ کر کرنٹ دینا شروع کر دیا۔ پہلے جھٹکے کے ساتھ میری حلق سے گو چیخ نکل تھی۔ اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ دل پسند مشغلہ آ گیا تھا۔ جس شخص کو ظلم کر کے سکون ملے وہ کس بلا میر ہوتا ہے۔

بجلی کے جھٹکوں سے میرا بدن رعشے کے مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ یہ سلسلہ بھی میری بے ہوشی تک جاری رہا۔ دوبارہ آنکھ زندان میں کھلی تھی۔ میں اوندھے منہ لیٹا تھا اور سماعتوں میں لورا براؤن کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھی۔ ''ریحا ریحا ''(راجا)

میں نے سیدھا ہونا چاہا اور ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ خارج ہوئی۔

''آرام سے آرام سے ''اس کی آواز میں فکر مندی و ہمدردی گھلی تھی۔

میرا بالائی بدن برہنہ تھا۔ اور اب تک زخموں پر نمک لگا تھا۔ حد درجے کی کمزوری و نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ گھڑی پر نگاہ دوڑائی، رات کے تین بج رہے تھے۔ آزمائشی رات کی چند گھڑیاں اب تک باقی تھیں۔

''نہا لو۔'' لورا براؤن نے میرے زخموں پر لگے نمک کی وجہ سے مشورہ دینے میں تساہل نہیں برتا تھا۔ اچھی خاصی گرمی تھی۔ بلب کی پیلی روشنی ماحول کو مزید پر اسرار بنا رہی تھی۔

مجھے اس کا مشورہ مناسب لگا تھا۔ میں دیوار کے سہارے کھڑا ہوا اور آہستہ روی سے بیت الخلاء کی طرف بڑھ گیا۔ تین مربع فٹ کے بیت الخلاء کے کونے میں کموڈ لگا تھا۔ ساتھ ہی جستی لوٹا رکھا تھا۔ پتلون و زیر جامہ اتار کر میں نے دیوار پر رکھا اور پانی کا لوٹا بھر کر جسم پر بہایا۔ اذیت کی تازہ لہر جسم میں دوڑ گئی تھی۔ میں درد کو خاطر میں لائے بغیر لوٹے بھر بھر کر جسم پر بہاتا رہا۔ نہانے سے طبیعت کافی سنبھل گئی تھی۔ میں پتلون پہن کر باہر نکل آیا۔

''مجھے نہیں لگتا یہ انسان ہیں۔'' میرے بیٹھتے ہی لورا نے زبان کھولی۔ نفرت کی دعوے دار میری حالت دیکھ کر ہمدردی کرنے لگی تھی۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''اچھا ہوا تمھیں تو سکون پہنچا۔''

اس نے صفائی دی۔ ''اتنی ظالم نہیں ہوں۔''

''میں تو باری بھگتا چکا ہوں لگتا ہے اگلی باری تمھاری ہے۔''

''لاوارث نہیں ہوں کہ تشدد کا نشانہ بنائیں گے۔'' بہ ظاہر اس نے بے پروائی ظاہر کی تھی مگر اس کا لہجہ اعتماد سے خالی تھا۔

میں نے حقیقت اگلی۔ ''بے وقوف ان کے پاس ہمارے خلاف ثبوت موجود ہیں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''مجھے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میرے ہونٹوں پر شرارتی مسکراہٹ ابھری۔ مجھے برہمی سے گھورتے ہوئے اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ ''میرا مطلب انھیں سب کچھ بتا دوں گی۔''

''تمھارا کیا خیال ہے میں نے سب کچھ نہیں بتایا۔''

وہ گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ اسے ڈرانے کا ارادہ نہیں تھا، مگر حقیقت یہی تھی کہ اسے مجھ سے زیادہ خطرہ درپیش تھا۔ حوا کی بیٹی جب درندوں میں گھر جائے تو اس کی بے بسی سے یہ ظالم کیسے کھیل سکتے ہیں، وہ انجان نہیں تھی۔ شاید اسے اپنی کمپنی ''ڈبلیو اے ایس'' سے تھوڑی بہت امید تھی ورنہ وہ سرکاری دورے پر نہیں آئی تھی کہ برطانیہ حکومت اس معاملے میں دخیل ہوتی۔ گو بڑے ممالک اپنے شہری کو آزاد کرانے کی خاطر کافی حد تک چلے جاتے ہیں۔ لیکن ایسا تب ہوتا ہے

کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تشدد یا اذیت انسان کی بھوک کو ختم نہیں کرسکتی۔ سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں
نے پہلے بیت الخلاء میں جا کر ہاتھ منہ دھویا اور پھر ناشتا کرنے لگا۔ ناشتے میں دو توس ایک ابلا ہوا انڈا اور چائے کی پیالی
تھی۔ اتنی سخت بھوک کے سامنے اس ناکافی غذا کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ میں سب کچھ چٹ کر گیا تھا۔ لورا براؤن نے صرف
ایک توس کو ہلکا سا کاٹ کر چھوڑ دیا تھا۔ شاید پریشانی نے اس کی بھوک ختم کر دی تھی۔
''کھاؤ گے؟'' میری پلیٹ میں جھاڑ و پھر ادیکھ کر وہ مستفسر ہوئی۔
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ٹرے میری طرف دھکیل دی تھی۔ دروازے کے نیچے سے ہاتھ گزار کر میں
نے پلیٹ پکڑی اور اس کا ناشتا بھی چٹ کر گیا۔
بمشکل ناشتے سے فارغ ہوا تھا کہ چند افراد کے قدموں کی چاپ ابھری۔ لمحہ بھر بعد وہ ہمارے سامنے تھے۔ مجھ
پر سرسری نظر ڈال کر انھوں نے لورا براؤن کا دروازہ کھولا۔ وہ بدک کر کھڑی ہو گئی تھی۔
''میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''
تین ہتھیاروں کے دہانے اس کی طرف سیدھے ہوئے۔ چوتھا جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی، انگریزی میں بولا۔
''مادام جانا تو پڑے گا، چل کر نہیں جاؤ گی تو اٹھا کر لے جائیں گے۔''
''میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ خوفزدہ تھی۔
''اگر یہ حرکت کرے تو ٹانگ میں گولی مار دینا۔'' اپنے ساتھیوں کو کہہ کر اس کے قدم لورا کی طرف بڑھے۔ وہ دیوار
کے ساتھ سمٹ گئی تھی۔ اس نے زبردستی لورا کو ہتھکڑی پہنا دی۔
جونھی دروازے کی طرف دھکیلا وہ مچلتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگی۔
سرغنہ نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ ہتھیار کندھے پر لٹکا کر انھوں نے لورا کو دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔
''تم زبردستی نہیں کر سکتے..... تم پچھتاؤ گے..... میں برطانیہ کی آزاد شہری ہوں بغیر کسی ثبوت کے تم مجھے زدوکوب نہیں
کر سکتے۔'' لورا برہمی سے بولتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر دونوں ڈشکروں کے سامنے اس کی ایک نہیں
چلی تھی۔
''ریجا! مجھے بچاؤ..... ریجا..... '' اچانک وہ مجھے مدد کو پکارنے لگی۔ اسے یہ بھول گیا تھا کہ راجا بے چارہ خود کو
نہیں بچا سکا اسے کیا چھڑائے گا۔ لیکن اس کے بار بار پکارنے پر میں سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہوا۔
''سر! آپ کو ایک لڑکی کا احترام مدنظر رکھنا چاہیے۔'' میں ان کے سرغنہ کو مخاطب ہوا تھا۔
''اپنی فکر کرو بالک ''مجھے جھڑکتا ہوا وہ آگے بڑھ گیا۔
مچلتی، بدکتی لورا کو وہ سیڑھیوں سے اوپر لے جانے لگے۔ یقیناً کسی سے ملوانے جا رہے تھے۔ یا کم از کم لے جانے کا
مقصد تفتیش نہیں تھا، کیوں کہ عقوبت خانے میں جانے کو تو مزید نیچے اترنا پڑتا تھا۔
اگلے ایک گھنٹے میں میرا بھی بلاوا آ گیا تھا۔ مجھے لے جانے والے وہی پرانے جلاد تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں اسی
منحوس کرسی پر بندھا بیٹھا تھا۔
''جوان رات کو تم جیت گئے تھے۔ اور میں تمھیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔'' زہریلے لہجے میں کہتے ہوئے گوتم
تالیاں پیٹنے لگا۔ سربن اور روی نے بھی استہزائی ہنسی سے اس کا ساتھ دیا تھا۔
''لیکن کیا ہے کہ مقابلہ ختم نہیں ہوا۔ اور اب اگلا مرحلہ آن پہنچا۔'' وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم لوگ
تیار ہو دوستو۔''

''تیار ہیں استاد جی۔'' دونوں یک زبان بولے تھے۔
''تمہارا جواب تو معلوم ہے۔ لیکن مقابلہ شروع کرنے سے پہلے پوچھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ کچھ یاد آیا کہ نہیں۔''
''جواب تو میں شروع سے دے چکا ہوں۔ اس کے علاوہ جو سننا ہے بتادو، میں دہرا دوں گا۔''
''جوان ڈٹا ہے جی۔'' کرن چاولہ صاحب کہہ رہے تھے کہ موصوف سنائپر ہے اور سنائپر بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ بھیا کرن صاحب نے ہماری صلاحیتوں کو للکارا ہے۔''
وہ اپنے ظلم و ستم اور شقی القلبی کو صلاحیتیں گردان رہے تھے۔ اور وقت ان کے ہاتھ میں تھا اس لیے میں بحث وتکرار نہیں کر سکتا تھا، نہ خاطر خواہ جواب دینے کی حالت میں تھا۔ ان بڑھکیں وڈیکیں ایک بندھے ہوئے قیدی کے لیے تھیں اور یہی ان کی ہار تھی۔

مجھے خاموش پا کر وہ اپنے مشغلے کو جڑ گئے۔ ابتداء روبن سے ہوئی تھی۔ مجھے الٹا لٹکا کر پانی کے بھرے ٹب میں میرا سر بار بار ڈبویا گیا۔ جب سانس اکھڑنے لگتا تب اوپر اٹھا دیتے۔ روی نے اپنی باری پر نئی گولیاں استعمال کی تھیں جن کا اثر کل والی گولیوں سے بھی زیادہ تھا۔ میں نے صبح کا ناشتا بھی الٹی کر دیا تھا۔ وہ باری باری مختلف عذاب آزماتے رہے۔ میں کئی بار بے ہوش ہوا۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ بے ہوشی ہی کی حالت میں وہ مجھے زندان میں پھینک گئے تھے۔

پھر مجھے پلوشہ دکھائی دی۔ میرا سر گود میں رکھ کر موہنی مسکراہٹیں نچھاور کر رہی تھی۔
''اب تک خفا ہو۔'' اس وقت بھی میرے دماغ سے اس کی خفگی کا احساس زائل نہیں ہوا تھا۔
''اپنے راجو سے خفا ہو سکتی ہوں۔'' ماتھے پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے اس نے مجھے خوشی سے ہمکنار کیا۔
میں شاکی ہوا۔ ''موڈ جو بنایا ہوا تھا۔''
''تنگ کر رہی تھی نا آپ کی لاڈلی جو ہوں۔''
''اگر تمہاری خفگی میری جان لے لیتی پھر؟'' میں نے اسے ڈرانے کی کامیاب کوشش کی۔
''ایسا تو نہ بولیں، سچ میں خفا ہو جاؤں گی۔'' وہ میرے چہرے پر جھک گئی تھی۔
''دوبارہ اذیت دوگی۔''
''کبھی نہیں۔'' اس نے منہ بسورا۔ ''مگر جلدی آئیں نا، کب سے آپ کی آواز نہیں سنی۔ ذرا سا مذاق کرنے پر اتنی بڑی سزا تو نہ دیں۔''
میں دھیرے سے مسکرایا۔ اس نے چاہت سے پوچھا۔ ''راجو، پلوشے کا ہے نا؟''
میرے دل سے آواز نکلی۔ ''اللہ پاک کی قسم ایسا ہی ہے۔''
''میرے راجو.... میرے راجو.... میرے راجو....'' وہ وارفتگی سے پکارنے لگی۔ اور میں سرشاری کی کیفیت میں پڑا اس کے روشن چہرے کو گھورتا رہا۔ اچانک روشنی مدہم ہونے لگی، اس کا پیارا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ آواز و انداز بھی تبدیل ہونے لگا۔ ''ریجا.... ریجا.... ریجا.... ریجا....'' میرا شعور بیدار ہوا۔ میں اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا اور ساتھوں میں لورا براؤن کی تشویش بھری آوازیں آرہی تھی۔ بے وقوف نہیں جانتی تھی اس کی ہمدردی نے مجھ سے راحت و سکون کے کیسے لمحات چھینے تھے۔ بہت عرصے بعد جانِ حیات خواب میں آئی تھی۔ جسمانی طور پر بدحال ہونے کے باوجود روحانی طور پر میں بہت آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا دوبارہ آنکھیں میچ کر اس کی گود میں پہنچ جاؤں، لیکن لورا کی ''ریجا.... ریجا۔'' کی گردان مجھے بے چین کر رہی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر اٹھنے کی کوشش کی، ہونٹوں سے بے ساختہ کراہ خارج ہوئی تھی۔
لورا ہمدردی سے بولی۔''آرام سے۔''
میں نے زندہ دلی ظاہر کی۔''یہ نصیحت انھیں کرو نا کہ آرام سے درگت بنایا کریں۔''
اس نے مشورہ دیا۔''جو پوچھ رہے ہیں، انھیں بتا کیوں نہیں دیتے۔''
میں نے منہ بنایا۔''یہی تو معلوم نہیں کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔''
''کیا مطلب؟''اس نے حیرانی ظاہر کی۔
میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''تمھاری سمجھ میں نہیں آتا۔اس تشدد کے پس پردہ طویل وجوہات ہیں۔انیس سو سینتالیس کی آزادی، اڑتالیس کی جنگِ کشمیر، پینسٹھ کا معرکہ، اکہتر کی لڑائی، کارگل کا جھگڑا اور بہت ساری سرحدی جھڑپیں ہیں۔''
''اگر سیدھے انداز میں وضاحت کر دیتے تو تمھارا کیا جاتا۔''
''چھوڑو مادام!
میری بات اتنی ضروری نہیں ہے
تسلی سے تم بات اپنی سنالو
میں نے ایک دم اردو کا شعر پڑھا۔اور ساتھ وضاحت کی۔''میرے مسائل تمھارے پلے نہیں پڑنا اس لیے اپنی سناؤ، کیا ہوا تھا؟''
وہ نفرت انگیز لہجے میں بولی۔''مسٹر شکلا سے ملاقات ہوئی ہے، بے غیرت، گھٹیا انسان بلیک میل کر رہا ہے۔''
''ذرا تفصیل سے مادام۔''
گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے دیوار سے ٹیک لگائی۔''سارے ڈرامے کے پسِ پردہ اس منحوس کے دو مقاصد ہیں۔ایک تو وہ ایس آر ون کی خریداری کوڑیوں کے مول کرنا چاہتا ہے۔ذرا سوچو پانچ ہزار پاؤنڈ کی رائفل کے پانچ سو پاؤنڈ لگا رہا ہے۔''
میں مستفسر ہوا۔''دوسرا مطالبہ؟''
''مجھے ایک ماہ اس کا کھلونا بننا ہوگا۔''لورا کے چہرے پر گہری نفرت پھیل گئی تھی۔
گو دوسرا مطالبہ پورا کرنا کسی آزاد خیال یورپین لڑکی کو اتنا مشکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔مگر ہر کسی کی عزت نفس، انا اور خودداری ہوتی ہے۔یورپ فریقین کی رضامندی سے جسمانی تعلقات کی آزادی کا علم بردار سہی، مگر زبردستی کرنے یا کسی عورت کو بلیک میل کرنے کی اجازت ان کا قانون بالکل بھی نہیں دیتا۔
میں نے مشورہ دیا۔''تم ڈیوڈ کو بیچ میں لا کر اس پر مقدمہ کر سکتی ہو۔''
''اس کے پاس کافی وڈیو کلپس موجود ہیں، جن میں میں تمھیں تربیت دے رہی ہوں۔چند جگہوں پر یہ بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ تمھاری تربیت کا مقصد مسٹر بکرم سنگھ کا قتل ہے شری پتی آرکیڈ کا فلیٹ جہاں سے ہم نے فائر کرنا تھا وہاں بھی خفیہ کیمرے نصب تھے۔اور ہماری گفتگو بھی بالکل واضح ہے کہ ہم کیا کر رہے تھے۔رائفل پر ہماری انگلیوں کے نشان ثبت ہیں۔اس قصے میں سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ تم پاکستانی جاسوس ہو اور انڈیا میں تمھاری آمد غیر قانونی ہے۔باقی اتنا تو تم اچھی طرح جانتے ہو گے کہ وڈیو میں سے ہمارے حق میں جانے والی باتیں کاٹ دی گئی ہیں۔''
میں نے حیرانی ظاہر کی۔''مگر ہمارا منصوبہ تو چھت سے فائر کرنے کا تھا۔پھر انھوں نے کمرے میں کیوں کیمرے

لگانے۔" انھوں نے چھت اور کمرہ دونوں جگہوں پر کیمرے نصب کیے تھے، کیوں کہ وہ ہماری ؛ وقت کی گفتگو ریکارڈ کرنا
چاہتے تھے۔ تاکہ میرے خلاف زیادہ سے زیادہ ثبوت حاصل کر سکیں۔"
"اب کیا سوچا ہے؟"
وہ برہم ہوئی۔ "سوچنے کے قابل غلیظ سؤر نے چھوڑا کہاں ہے۔"
میں نے چوٹ کی۔ "سچ کہتے ہیں، لالچ بری بلا ہے۔"
وہ جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ زخمی لہجے میں بولی۔ "رہنما! تم میرے حالات سے ناواقف ہو۔"
ایسا ہی کچھ یا وہ پہلے بھی کہہ چکی تھی۔ میں نے طعنہ زنی سے گریز کرتے ہوئے پوچھا۔ "ڈیوڈ سے مشورہ کیا ہے؟"
وہ افسردگی سے بولی۔ "اسے شکلا سب کچھ بتلا چکا ہے۔ مجھ سے بھی مختصر گفتگو ہوئی۔ چپکے لہجے میں تسلی دینے کے
علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔"
"اب کیا ہوگا؟" میں نے الفاظ بدل کر سوال دہرایا۔
"اس کا مطالبہ تسلیم کرنے کی صورت ہم صرف فٹ پاتھ پر نہیں آئیں گے بلکہ سلاخوں کے پیچھے جانا پڑے
گا۔ ہمارے پاس پانچ ہزار تیار شدہ رائفلیں موجود ہیں اور شکلا دس ہزار رائفلوں کا مطالبہ کر رہا ہے۔ جو ناممکن ہے۔ کیوں
کہ پہلی کھیپ کی تیاری ہی میں کمپنی گردن گردن قرض کی دلدل میں دھنس چکی ہے۔ مزید پانچ ہزار رائفلیں کیسے تیار ہو
سکیں گی۔" لورا نے شکلا کے صرف پہلے مطالبے پر روشنی ڈالی تھی۔
میں نے پوچھا۔ "ڈیوڈ تمھارے لیے کس حد تک جا سکتا ہے۔"
وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی۔ "عملی زندگی میں ماضی کے دعوں کو کم ہی پورا ہوتے دیکھا گیا ہے۔"
"پھر بھی تمھارا ساتھی ہے، یقیناً کچھ سوچ کر ہی تم نے حصے دار (پانٹر) بننا قبول کیا ہوگا۔"
اس کے ہونٹوں پر مجبوبانہ تبسم ابھرا۔ "محبت کا دعوے دار ہے۔"
"پھر تو اچھے کی امید رکھنا چاہیے۔"
"شکلا کا مطالبہ اس کے بس سے باہر ہے۔ وہ بے چارہ تو میری کامیابی کا منتظر تھا۔ اور ہمیں لینے کے دینے پڑ گئے
ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "بکرم سنگھ کے بارے اسے اعتماد میں لیا تھا۔"
لورا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"پھر اس کا گلہ کرنا نہیں، نقصان میں شامل ہونا بنتا ہے۔"
وہ افسردگی سے بولی۔ "وہ انکار نہیں کر رہا، بس پریشان لگ رہا تھا۔ ہم پہلے ہی مالی پریشانی کا شکار تھے، شکلا نے نیا
بم سر پر پھوڑ دیا ہے۔"

میرے منہ سے پھر حقیقت پھسلی۔ "سچ کہوں تو یہ بے صبری کا انجام ہے۔"
وہ خفگی سے بولی۔ "جب اصل بات معلوم نہ ہو تو بکواس نہیں کرنا چاہیے۔"
"مجھے سخت بھوک لگی ہے۔" میں نے موضوع تبدیل کیا۔
"میں شکلا کے ساتھ زہر کھا کر آئی ہوں، مگر چند نوالے سے زیادہ نہیں لے پائی کہ بھوک ہی اڑ گئی ہے۔"
میں نے پھل جڑی چھوڑی۔ "کہیں دوسرے مطالبے پر عمل درآمد تو شروع نہیں ہو گیا۔"

"تذلیل کے علاوہ کیا ہی کیا جا سکتا ہے۔"

پھر سوچ کر اس نے مشورہ دیا۔ "تم بھاگنے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

میں بے بسی سے بولا۔ "میری حالت ایسی نہیں ہے کہ ایک ساتھ تین آدمیوں کا مقابلہ کر سکوں، البتہ کوئی ساتھ دے تو دور کی بات ہے۔"

میری بات پر تفکر جتاتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "فی الحال مجھے تو بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو تم نے ٹلا کی شرائط ماننے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

وہ تلخی سے بولی۔ "ایسا کب کہا۔"

میں نے حقیقت کھولی۔ "کیا خیال ہے وہ تمہاری مرضی کا منتظر رہے گا، پہلے مطالبے کی تکمیل تمہارے ہاتھ میں تھی دوسرا مطالبہ وہ بہ زور بازو پورا کر سکتا ہے۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "برطانیہ کی آزاد شہری ہوں، جواب دہی اسے مشکل میں ڈال دے گی۔"

"اگر تمہیں آزاد کرنے کا ارادہ ہوا تو تم سچ کہہ رہی ہو۔"

"کہنا کیا چاہتے ہو۔" اس کے چہرے پر تفکر ابھرا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ "جن کے پاس ضمیر نہ ہو ان کا کچھ بھی کرنا غیر متوقع نہیں ہوتا۔"

"یہ ہونا ممکن نہیں ہے۔" اس نے سختی سے جھٹلا دیا تھا۔

میں خاموش ہو گیا۔ وہ بھی گہری سوچ میں کھو گئی تھی۔ کھانا کھانے کی وجہ سے مجھ پر خماری چھانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پلوشہ دھم سے کود کر نگاہوں کے سامنے آئی اور میرا سر گود میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی ملائم ہاتھ میرے بالوں پر پھیرنے لگی۔ اس عنایت کے بعد نیند کس کم بخت کو نہ آتی۔

— ● —

''تو م ... پہلے مطالبے کی تعمیل تمھارے ہاتھ میں ہے

''تلخی سے بولی۔ ''ایسا کب کہا۔

میں نے حقیقت کھولی۔ ''کیا مطلب ہے وہ تمھاری مرضی کا منتظر رہے گا،

پورا کر سکتا ہے۔''

''اور مطالبہ وہ بزور بازو پورا کر سکتا ہے۔''

وہ ضدی سے بولی۔ ''برطانیہ کی آزاد شہری ہوں، جواب دہی اسے مشکل میں ڈال دے گی۔''

''اور تمھیں آزاد کرنے کا ارادہ ہوا تو تم سچ کہہ رہی ہو۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو۔'' اس کے چہرے پر تفکر ابھرا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''جن کے پاس ضمیر نہ ہو ان کا کچھ بھی کرنا غیر متوقع نہیں ہوتا۔''

''ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔'' اس نے سختی سے جھٹلا دیا تھا۔

میں خاموش ہو گیا۔ وہ بھی گہری سوچ میں کھو گئی تھی۔ کھانا کھانے کی وجہ سے مجھ پر خماری چھانے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پلوشہ دھم سے کود کر نگاہوں کے سامنے آئی اور میرا سر گود میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی ملائم ہاتھ میرے بالوں پر پھیرنے لگی۔ اس عنایت کے بعد نیند کس کم بخت کو نہ آتی۔

—●—

03015271006

ہو رہی تھیں۔ میرا زخموں سے چور بدن نت نئے مصائب اور تکالیف سے آشنا ہو رہا تھا۔ مگر نہ احتجاج کا حوصلہ تھا اور نہ
بچنے کی تدبیر۔ چیخنے چلانے سے بھی کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ البتہ پیار بات کہتی چیخ کر یہ اگلا ایلچی جاتا تھا۔ اور یہ
میرے لیے باعث سکون و اطمینان ہوتی تھی۔

دوران تفتیش میں کئی بار بے ہوش ہوتا۔ ان کے غیر انسانی تشدد نے اب میری مدافعاتی قوت کم زور کر دی تھی۔ صرف زندہ
رہنے کا حوصلہ اور دوبارہ سے اپنی پلوشے کو ملنے کی امید تھی کہ میں ڈٹا ہوا تھا۔ اب وہ باقاعدگی سے خوابوں میں آنے لگی
تھی۔ شاید بچھڑنے کا وقت قریب تھا یا حوصلہ بڑھانے آتی تھی۔ اس رات بھی میری واپسی ہوش و خرد سے بیگانہ حالت میں
ہوئی تھی۔

پلوشے حسب معمول خوشی سے چہکتے و کھل کھلاتے میرے پاس پہنچی تھی۔ میں جسم پر چادر لپیٹے لیٹا تھا۔ مجھے پر کبھی
نہ وہ میرے کانوں میں رس انڈیلتی رہی۔ جانے کون کون سے پرانے قصے اسے یاد آرہے تھے۔ دوران گپ شپ
اچانک میرے جسم سے کپڑا ہٹا، میرے زخم دیکھتے ہی وہ تڑپ اٹھی تھی۔

"یہ ... کیا ہے راجو" وہ ہکلا گئی تھی۔

"کچھ نہیں چندا، معمولی سے زخم ہیں۔" میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

"وہ اتنا ظلم کر رہے ہیں میرے راجو پر، میں انہیں چھوڑوں گی تو نہیں۔" دانت پیسے ہوئے وہ سسک پڑی تھی۔ اور
پھر اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔

"پلوشے ... پلوشے" اسے پچکارتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھایا، نجانے کس زخم میں کھاؤ آیا تھا کہ میرے
منہ سے بلند کراہ خارج ہوئی اور آنکھ کھل گئی۔ لیکن پلوشہ کی سسکیاں اب تک کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آج لورا کا۔" ریکا
ریکا" نے بغیر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ شاید وہ نیند میں تھی۔

بازوؤں پر زور دے کر میں اٹھ بیٹھا، تبھی سسکیوں کی آواز زیادہ صاف سنائی دینے لگی۔ وہ لورا تھی، گھٹنوں میں سر
دیے سسک رہی تھی۔

"کیا ہوا ... رو کیوں رہی ہو؟" سلاخوں کے قریب ہو کر میں نے آواز دی۔

اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر مظلومیت سے مجھے گھورا۔ میرا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا۔ سفید گالوں پر دانتوں
کے نشان یوں ثبت تھے جیسے کسی درندے سے پالا پڑا ہو۔ یقیناً میری غیر حاضری میں اس پر قیامت بیت چکی تھی۔ میرا
اندیشہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔ شکلا جیسے گھٹیا انسان سے اس کے علاوہ امید بھی کوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔

"یہ کیسے ہوا؟" گو اس کا چہرہ چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ اس پر کون سی قیامت ٹوٹ چکی ہے، لیکن اس کے علاوہ
مجھے کچھ سوجھا ہی نہیں تھا۔

"میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ کسی بھی قیمت، کسی بھی صورت اسے قتل ضرور کروں گی۔" دانت پیستے ہوئے وہ غضب
ناک ہوئی۔

اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اپنے اندازوں کی درستی پر داد طلب کرسکتا۔ میں پچکار کر اس کا حوصلہ بڑھانے
لگا۔ عورت مشرقی ہو یا مغربی، مرد کی درندگی کا سامنا کرتے ہوئے بے چاری ٹوٹ، بکھر جاتی ہے۔ شکلا جیسے مرد ذہنی
مریض ہوتے ہیں۔ اور اس کے مرض کی شدت مجھے لورا کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ نجانے باقی جسم کے ساتھ
درندے نے کیا کچھ سلوک کیا ہوگا۔

میرے مسلسل تسلی دینے اور حوصلہ بڑھانے پر وہ کچھ سنبھلی۔ اور جو کہانی سنائی اس کا لب لباب یہی تھا کہ میرے

جانے کے تھوڑی دیر بعد اس کا بلاوا آ گیا تھا۔ اس نے معمول کی ملاقات تصور کیا۔ مگر اسے لے جا کر ایک بیڈ پہ ڈال د
نشے میں دھت ... آیا اس کے ماضی کا روپ یاد دلا کر اپنی ہر من مانی پوری کی۔ اور ساتھ یہ بھی اعلان کر
گیا۔ بعد میں ... مسلسل ... کی درندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔
ایک ہوا سے ... لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہیں تھا۔
اب لورا کو وہاں سے بھاگنے کی سوجھ رہی تھی۔ لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہیں تو
قید خانے کے دروازے وہ ایک ساتھ نہیں کھولتے تھے کہ ہم مل کر محافظوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے تھے۔ لورا بھی
مجھ سے بہتر تھی کہ ہاتھا پائی کر سکتی تھی۔ میرے بدن میں تو مقابلے کی سکت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بقیہ رات ہم
منصوبے سوچتے اور رد کرتے رہے۔ تالے کھولنے کے ہمیں کئی طریقے سکھائے گئے تھے، لیکن اس کے لیے کم از کم ایک
مضبوط تار کا حصول ضروری تھا۔ ہمارے پاس تو انھوں نے لوہے کی کوئی چیز ہی نہیں چھوڑی تھی۔ کھانا بھی پلاسٹک کے
برتنوں میں آتا تھا۔

کافی دیر مغز ماری کے بعد ہم نے وقتی طور پر ہار مانی اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ صبح کے چار بج چکے
تھے۔ بھوک کی شدت، اور جسمانی تکالیف میں سونا تو محال تھا، بس ہلکی غنودگی آ جاتی تھی۔ جو چند لمحوں کے لیے درد
افاقے کا باعث بنتی۔ سونے جاگنے کی کیفیت میں ناشتا لانے والوں کے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں اٹھ کر بیت الخلا کی
طرف بڑھ گیا۔ تازہ دم ہو کر آیا اور ناشتے کو جت گیا۔ لورا نے اپنی ٹرے میری طرف کھسکائی اور صرف چائے کی پیالی اٹھا کر
چسکیاں لینے لگی۔ بدمزہ چائے پینا بھی اس کی مجبوری بن گئی تھی۔
پیٹ میں کچھ جانے کے بعد مجھ پر خماری چھانے لگی۔ لورا نے بھی دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔
تھوڑی دیر بعد جلادوں نے آ جانا تھا۔ لیکن نہ سونے سے ان کا آنا ٹل نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے آنکھیں بند کر لی
تھیں۔

قدموں کی چاپ سنتے ہی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ شاید جلاد پہنچ گئے تھے۔ لیکن آنکھیں کھلتے ہی میرا دل اچھل کر
حلق میں آ گیا تھا۔ میرے اندیشے بے بنیاد ثابت نہیں ہوئے تھے۔

وہ ممتا دیدی تھی۔ تین افراد کے گھیرے میں زندان کے قریب آئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ درندے معصوم لڑکی
تک پہنچ گئے تھے۔ یقیناً اب میں اپنی ہٹ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ مظلوم لڑکی کو بچانے کو میرا سچ اگلنا ضروری ہو گیا تھا۔ مگر
سچ کا پتا چلتے ہی دھیرندر شکلا پہلی فرصت میں میرا عدم آباد کا ٹکٹ کٹوا دیتا۔ ایک لمحے میں، دماغ نے مستقبل کا تجزیہ کر لیا
تھا۔ میں بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

وہ سلاخوں کے سامنے آ کر رکی۔ نظریں میرے وجود پر گڑی تھیں۔ وہ کالے رنگ کے تھری پیس سوٹ میں تھی جو
ن پر خوب جچ رہا تھا۔ نجانے درندے ان کا کیا حشر کرنے والے تھے۔ ایک پاکستانی جاسوس کو پناہ دینے والی کسی رعایت
حق دار نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی معذوری بھی ظالموں کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی۔ میں نے دل ہی دل میں ان کی مدد کا فیصلہ
ر لیا تھا۔ انھیں بچانے کی خاطر میں نے کرن کے سامنے سارا راز کھولنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

''دروازہ کھولو۔'' مجھے گھورتے ہوئے اس کی پر اعتماد آواز ابھری۔ میرے دماغ کو جھٹکا لگا، کیوں کہ وہ تو اندھی تھ
اندھے یوں کسی سے نظریں نہیں ملا سکتے۔ اس کے عقب میں کھڑے افراد کا انداز بھی مودبانہ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں
ہتھیار تھا اور نہ ممتا دیدی ان کی قیدی لگ رہی تھیں۔

ایک دم جیسے انکشاف ہوا، وہ تو اس ڈرامے کا خصوصی کردار تھیں۔ ورنہ کیسے ممکن تھا کہ اتنا عرصہ ان کے
را ایجنسی کی نظر سے اوجھل ہوتا۔ انھوں نے مہینا بھر مجھے نظر میں رکھا، حقیقت اگلوانے کی کوشش کی، بہن بن کر اتن

بے ارادی میری نظر اپنی گھڑی پر پڑی۔ یقیناً وہ راڈو نہیں، نشان دہی کرنے کا آلہ (انڈیکیٹر) تھا۔ جس کی وجہ سے
[illegible] یہی وجہ تھی کہ گھڑی مجھ سے نہ لی گئی۔ ورنہ قیدی کے پاس گھڑی کون چھوڑتا ہے۔ یہ
[illegible] کی نظروں [illegible] لیکن درمیان نہیں دے سکا تھا۔
[illegible] تمھیں۔ "راج۔" وارفتگی سے کہتے ہوئے اس نے میرا چہرہ ہاتھوں کے
[illegible] بے تابی سے اندر [illegible] شفقت بھرا انداز میری روح تک کو گھائل کر گیا تھا۔ اتنے مقدس رشتے کی آڑ میں
[illegible] نے کرائے پر بھیجا ہوا [illegible] انھیں گھورتا رہا۔
[illegible] میں بس جلتی ہوئی آنکھوں سے انھیں گھورتا رہا۔
نظریں میرے جسم پر پہلے چھالوں پر پڑیں۔ سیاہ آنکھوں میں اضطراب و اذیت ہلکورے لیتی محسوس ہو رہی تھی۔
"سدھیر! یہ کون کر رہا ہے؟" انھوں نے مڑ کر دیکھا۔
"یہ تو کم مادام!"
"ایسا تو کسی وعدے نہ کرنا تھی نا؟" ان کے لہجے میں دکھ و اذیت بھری تھی۔
[illegible] نے سر جھکایا تھا۔ انھوں نے ایک نمبر ملا کر موبائل فون کان سے لگا لیا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا۔" لہجے میں
[illegible] پوشیدہ تھا۔ "تم نے وعدہ کیا تھا۔"
[illegible] دوسری طرف سے کیا کہا گیا، وہ چلائیں۔ "تم صرف بکواس کر سکتے ہو اور کچھ نہیں۔" اور الوداعی کلمات کہے
بغیر رابطہ منقطع کر لیا۔
میری طرف رخ موڑتے ہی ان کی آنکھوں میں پشیمانی بھرا اضطراب نمودار ہوا۔ ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے
ہوئے لہجے میں بولیں۔ "تمھارے لیے کھانا لائی تھی۔ سوچا اپنے ہاتھوں سے راج کو کھلاؤں گی۔"
"ایسی گھٹیا حرکت کیوں کی۔" مجھے اپنی آواز بے گانی لگی تھی۔
"چھوٹے! میں سب بتاؤں گی، پہلے تم کھانا کھا لو۔" ٹفن اٹھائے شخص کو قریب آنے کا اشارہ کر کے وہ میرے
نزدیک ہوئیں۔
"دور ہو۔" میں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں پیچھے دھکیلا۔
"موئے مادام سے بدتمیزی کرتا ہے۔" سدھیر جھپٹا، مگر اس کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ممتا باجی کی ٹانگ حرکت میں
آئی، بھرپور لات کھا کر وہ دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔
وہ دھاڑیں۔ "کسی نے چھونے کی بھی کوشش کی تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔ دفع ہو جاؤ تینوں۔"
وہ کان دباتے ہوئے باہر نکل گئے تھے۔
"اپنی دیدی سے بدتمیزی کرو گے۔" شفقت بھرے لہجے میں کہتے ہوئے وہ دوبارہ قریب ہوئیں۔
"پلیز مادام آپ چلی جائیں۔" میں نے رخ موڑ لیا تھا۔
"اپنی دیدی کو رلا کر خوشی ملے گی۔" انھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر زبردستی سیدھا کیا۔
"آپ نے مجھے دھوکا دیا ہے، جذباتی استحصال کیا ہے میرا۔ کم از کم بہن کر دھوکا نہ دیتیں۔"
وہ دکھی ہوئیں۔ "دیدی تم نے بنایا تھا چھوٹے! بھول گئے۔"
"آپ حقیقت بتا سکتی تھیں۔" کوشش کے باوجود میں انھیں تم نہیں کہہ پا رہا تھا۔ مجھے ہزاروں گلے شکوے
تھے۔ ہم ازلی دشمن تھے۔ مگر نادانستگی میں غلط رشتہ جوڑ بیٹھے تھے۔ اور جس طرح وہ میری حالت دیکھ کر پیچ و تاب کھا
رہی تھیں، صاف ظاہر تھا کہ انھیں چھوٹے بھائی کی تکلیف پر اذیت ہو رہی تھی۔ اب میری الجھن بھی دور ہو گئی تھی کہ کرن

چاول کی سفارش کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کی مجبوری ممتا دیدی کی صورت میرے سامنے کھڑی تھیں۔ یقیناً ان کے
خاص تعلقات تھے، تبھی تو ممتا جی نے اسے اتنے سخت الفاظ میں برا بھلا کہا تھا۔
میں نے چپ سادھ لی۔ وہ نادم ہو گئیں۔ "اپنی دیدی کو مجبور سمجھ کر معاف کر دو۔"
میں کراہتے ہوئے بولا۔ "آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"
"مجبور ہو گئی تھی۔ تمھیں دیکھنے کو دل کر رہا تھا، کسی اور کی تسلی سے مطمئن نہیں تھی تبھی چلی آئی۔"
"ٹھیک ہے، دیکھ لیا، اب چلی جائیں۔"
وہ ہٹ سے بولیں۔ "کھانا کھلا کر پھر چلی جاؤں گی۔"
"بھوک نہیں ہے۔"
"نہیں۔" انھوں نے منہ بسورا۔
"آپ ایک ناپائیدار رشتے کے قیام پر مصر ہو رہی ہیں۔" میں نے انھیں آئینہ دکھایا۔
"زبردستی تو نہیں کر رہی، دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ جانتے ہو نا میرے راجیو نے تمھارے روپ میں دوبارہ جنم لیا
اس نے کئی بار کہی بات دہرائی۔ میں اس کے چھوٹے بھائی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ ہلکی سی مشابہت ضرور تھی مگر وہ
ر ے جیسا نہیں تھا۔ بلکہ وہ بارہ تیرہ سال کا تھا کہ ایک حادثے میں گزر گیا تھا۔ وہ آج تک اسے نہیں بھلا پائی تھی۔
"آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں پاکستانی ہوں۔"
گی سے بولیں۔ "پاکستانیوں سے محبت کرنا جرم ہے کیا۔"
یدی سمجھنے کی کوشش کریں۔"
کے چہرے پر فاتحانہ تبسم ابھرا۔ "جتنا کوشش کر لو، اپنی دیدی کی محبت کو دل سے نہیں کھرچ سکتے۔"
ترض ہوا۔ "آپ میرے انجام سے واقف ہیں، پھر کیوں ایک نئے غم کو اپنا سینہ کشادہ کرنا چاہتی ہیں۔"
سے بولیں۔ "تمھیں مرنے تو نہیں دوں گی۔"
حقیقت اگلی۔ "مجھے نہیں لگتا آپ اتنی بااختیار ہیں۔"
اتے ہوئے انھوں نے امید ظاہر کی۔ "ماؤں، بہنوں کی پرارتھنا (دعا) میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"
نے سامنے کھڑے معروف گفتگو تھے۔ ممتا دیدی امید بھری نظروں سے مجھے گھور رہی تھیں۔ اپنے غلط طرز
وئی توجیہہ نہیں تھی۔ لیکن رویہ چیخ چیخ کر ان کی محبت و بے بسی کا اعلان کر رہا تھا۔ ان کی شفقت کے سامنے
ے میں دھیرے سے بولا۔
بھوک لگی ہے۔"
بولیں۔ "بیٹھو نا؟ دیدی اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلائے گی۔"
میری پسند کا کھانا بنا لائی تھیں۔ انھوں نے خود بھی میرے ساتھ ہی کھانا کھایا اور پھر درد کش گولیوں کی
ساتھ ہی بعد میں کھانے کو بھی گولیوں کا ایک پتا دے دیا تھا۔
"میں نے رسم نبھائی۔
ہو۔" متبسم ہو کر انھوں نے میرا کان پکڑ لیا تھا۔ ان کی پختہ عادت تھی۔ خفگی و محبت ہر دو صورت وہ

گستاخی کر سکتا ہوں۔"

''یہ گھڑی واپس کرو۔'' کہتے ہوئے وہ میری گھڑی کھولنے لگیں۔
میں ہنسا۔ ''آج ہی اس گھڑی کا راز افشا ہوا ہے۔''
چہرہ دیکھے بغیر وہ ایک کالا دھاگا میری کلائی پر باندھنے لگیں۔ شاید ادھوری رسم کو اب پورا کر رہی تھیں۔
دھاگا باندھ کر انھوں نے خفیف انداز میں پوچھا۔ ''ایک بات مانو گے۔''
''آپ اچھی طرح جانتی ہیں کیا منوا سکتی ہیں۔''
''جو نہیں منوا سکتی اب وہ منوانا چاہتی ہوں نا۔'' مصر ہوئیں۔
میں نے تحمل سے کہا۔ ''بولیں، سننے کے بعد ہی کچھ طے کر سکوں گا۔''
''سچ بتا کیوں نہیں دیتے۔ وعدہ کرتی ہوں تمھیں بچا لوں گی۔''
''حکومت کے ایسے عہدہ دار کا ہے جو ذاتی وعدوں کو پورا کروانے کا اختیار نہیں رکھتا۔''
''یہ وعدہ اپنی دیدی سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔''
میں تلخی سے بولا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ میں سچ بتا چکا ہوں۔ اب یہ بتائیں آپ کو کیسے یقین آئے گا میرے پاس بتانے کو کچھ اور نہیں ہے۔''
''کہا تھا نا اپنے دیش لوٹ جاؤ...... اچھی طرح سمجھایا تھا مگر تم نہ مانے۔'' لگا وہ گڑے مردے اکھیڑ رہی ہیں۔
''اب پچھتانے سے گیا وقت نہیں لوٹ سکتا دیدی۔'' میں نے بہ ظاہر غلطی کا اعتراف کرنا ضروری سمجھا۔
''چلتی ہوں...... اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ اور میں بات کر کے تمھاری جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہوں۔ کبھی
زحمت میں اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے پاکستان لوٹنے کی کرو۔'' وہ بین السطور مجھے کرید رہی تھیں کہ اگر میرے رابطے
کسی سے ہیں تو اعتراف کر لوں۔
''کرن آپ کا کیا لگتا ہے؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔
''کچھ نہیں لگتا کمینہ......'' ان کے ہونٹوں پر مدہم تبسم ابھرا جو باور کر رہا تھا کہ وہ ان کا سب کچھ تھا۔
میں نے تصدیق چاہی۔ ''روہن گجرال ایک فرضی نام تھا نا؟''
''کرن کا اصل نام روہن ہی ہے۔'' عجوب انداز میں کہتے ہوئے انھوں نے قریب ہو کر میرے ماتھے پر بوسا
دیا اور جونھی مڑیں، میری نظر ان کے بالوں میں اڑسی لوہے کی باریک تار کی بنی چٹیوں پر پڑی۔ میں ایک دم بولا۔
''ممتا دیدی!''
وہ رک کر پلٹیں۔ آنکھوں میں استفسار اور چہرے پر خفت تھی، جو اعلان کر رہی تھی کہ وہ میری ہر قسم کی مدد سے قاصر
تھیں۔
میں نے قریب ہو کر دونوں ہاتھ ان کے سر پر رکھے۔ ''پلیز، یہاں آ کر خود کو تکلیف نہ دیا کریں۔ جانتا ہوں آپ
بے بس ہیں۔ جب تک زندگی ہے، آپ میری دیدی ہی رہیں گی۔ پاکیزہ، مقدس، معصوم اور بہت زیادہ شفقت کرنے
والیں۔ میں چاہوں بھی تو آپ سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں میری گرفتاری میں آپ کا کوئی کردار نہیں
ہے۔ نہ آپ کے بس میں میری آزادی ہی ہے۔ خود کو کبھی قصوروار اور دوشی نہ سمجھنا۔ کیوں کہ ضروری نہیں جو آپ چاہتی
ہوں، سب ویسا ہی چاہیں۔ اپنا بہت سا خیال رکھنا۔'' ان کے بالوں پر بوسا دے کر میں پیچھے ہو گیا۔ اس دوران میرے
ہاتھ کی انگلیاں اپنا کام کر چکی تھیں۔
آنکھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ایک دم مڑیں اور باہر نکل گئیں۔ یقیناً وہ دہرے احساسات کا شکار

تھیں۔ بھارت ماتا سے محبت و وفاداری ان کے خون میں شامل تھی۔ اور مجھے نادانستگی میں اس بھائی کا درجہ مل گیا تھا
جس نے کبھی ان کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔

جدید ساخت کی بالوں کی چمٹی میرے دائیں ہاتھ سے جیب میں منتقل ہو گئی تھی۔ چمٹی کی بناوٹ میں مضبوط فولادی
تار استعمال ہوئی تھی۔ امید تھی اس سے قفل کھل جاتا۔

تینوں محافظ انتظار کر رہے تھے۔ ان کے نکلتے ہی ایک نے دروازہ قفل کر دیا۔ لورا پر انھوں نے سرسری نظر ڈالنا بھی
گوارا نہیں کی تھی۔

"کیا معاملہ تھا۔" ان کے جاتے ہی لورا نے بے صبری ظاہر کی۔ میں نے مختصر الفاظ میں مستا دیوی کا تعارف کروایا۔
وہ مایوسی سے بولیں۔ "موقع تھا تم اسے یرغمال بنا کر بھاگنے کی کوشش کر سکتے تھے۔"

میں نے منہ بنایا۔ "انھیں اعتماد تھا تو اپنے آدمیوں باہر بھیجا، ورنہ دشمن ملک کے جاسوس کے ساتھ اکیلا بیٹھنے کا خطرہ
کون مول لیتا ہے۔"

لورا وثوق سے بولی۔ "وہ بہن بن کر تم سے راز اگلوانے آئی تھی۔ تبھی اسے تم تک آنے کی اجازت ملی۔

"یقیناً ایسا ہی ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا کہ لورا کی بات سے رتی بھر اختلاف نہیں تھا۔

"اسے نقصان پہنچائے بغیر ہم اپنا کام کر گزرتے۔" لورا نے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

میں نے جیب سے چمٹی نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ لورا کی آنکھوں میں خوشگوار حیرانی نمودار
ہوئی۔ "یہ .... یہ .... کیسے؟"

"انھیں بہن سمجھنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنی فکر چھوڑ دوں۔"

وہ مسکرائی۔ "بلاشبہ تمھاری خیر خواہ نکلی۔"

"وہ دل سے چاہتی ہیں میں فرار ہو کر پاکستان لوٹ جاؤں، مگر مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ بلکہ ان کی حب الوطنی
سے لگتا ہے میرے فرار کو روکنے کو پہلی گولی انھی کے پستول سے نکلے گی۔"

وہ عزم سے بولی۔ "تم فرار ہو کر جو چاہے کرو، مگر میں شکلا کو موت کے گھاٹ اتارے بغیر انڈیا نہیں چھوڑنے
والی۔"

میں بہ ظاہر سنجیدگی سے بولا۔ "اگر اس کام میں مددگار بنوں تو پرانا وعدہ پورا ہوگا۔"

"کون سا وعدہ۔" اسے حیرانی ہوئی تھی۔

میں شرارتی تبسم سے بولا۔ "وہ ڈیٹ والا .... "

اس نے دانت پیسے۔ "ریجا .... انڈین ایجنسیوں نے تمھارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا ہوگا جو میں کروں گی۔"

میں نے موضوع تبدیل کیا۔ "پہلے یہاں سے نکلنے کا سوچو۔"

"صبح ناشتا لانے والے صرف دو آدمی ہوتے ہیں، اپنے ہتھیار بھی انھوں نے کندھوں پر لٹکائے ہوتے ہیں۔"

"گویا آج رات بھی تم شکلا کی میزبانی کو تیار ہو۔"

"نن .... نہیں .... تو۔" وہ گھبرا گئی تھی۔ "ہمیں ابھی کوشش کرنا ہوگی۔"

"مجھے لے جانے والے کافی بے پروا ہوتے ہیں جب زندان میں داخل ہوں گے، تب حملہ کر دوں گا۔ مجھ پر جھپٹ
نے کو وہ تم سے غافل ہو جائیں گے۔ تب تم ٹوٹ پڑنا۔ ایک بار انھیں بے ہوش کر لیا تو باقی کام مشکل نہیں رہے
گا۔ بیرونی دروازہ بھی کھلا ملے گا۔"

اس نے تشویش ظاہر کی۔ "مجھے نہیں لگتا تم خاطر خواہ مزاحمت کر پاؤ گے۔"

میں اعتماد سے بولا۔ "ایک بندے کو ناکارہ کرلوں گا، دو کا بندوبست تمہیں کرنا ہوگا۔"

"ہم گرنا کام ہوئے تو ...."

"تو کیا؟" میں نے قطع کلامی کی۔ "جو ہو چکا، اس سے زیادہ کیا کرلیں گے، زندگی کی امید میں یوں بھی کھو چکا ہوں۔"

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہم منصوبے کی نوک پلک درست کرنے لگے۔

منصوبے کے مطابق لورا کو زندان کا قفل کھولنا تھا۔ وہ تجربہ کار سنائپر اور تربیت یافتہ کمانڈو تھی۔ تار کے ذریعے قفل کھولنے کا شعبدہ اس کے لیے انوکھا یا مشکل نہیں تھا۔ میں نے چمچی اس کی طرف بڑھا دی۔

"قفل کھول دو کیوں کہ وہ کسی بھی وقت ٹپک سکتے ہیں۔ دیدی کے آنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مجھے آج دن کو آرام کا موقع دینے والے ہیں۔"

وہ چمچی کو ادھیڑ کر تار کو سیدھا کر چکی تھی۔ اجازت ملتے ہی قفل کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ ڈیڑھ دومنٹ کی ملغزماری کے بعد اسے کامیابی مل گئی۔

ایک بار کنڈا کھول کر اس نے دروازہ کھلنے کی تصدیق کی اور پھر کنڈے میں تالا پھنسا کر بیٹھ گئی۔ اب ہمیں ساتھیوں کا انتظار تھا۔ گو جلادوں کی ٹولی سے پہلے کوئی لورا کو لے جانے بھی آسکتا تھا۔ اور ایسا ہونے کی صورت ہمارا منصوبہ ناکام ہو جاتا کہ قفل کو کھلا ہوا دیکھ کر وہ نہ صرف چونک جاتے بلکہ ہماری نگرانی سخت کر دیتے۔ اب تو انھیں ہماری بے بسی کا یقین ہو چکا تھا۔ اور اس کے برعکس کرنے کی صورت یہ قباحت تھی کہ جلادوں کی آمد کے بعد لورا قفل کھول کر یورش نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن ایسے منصوبوں میں اتنا خطرہ تو مول لینا پڑتا ہے۔

ہم سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ ذرا سی لغزش ہماری مصیبتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیتی۔ کشیدہ اعصاب کے ساتھ ہم لمحوں کے گزرنے کا ادراک کرتے رہے۔ انتظار کے لمحات طویل ہو کر گھڑیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر کسی بھی شئے کی طوالت اس کے دوام پر دال نہیں ہے۔ وصل کے اوقات جلدی گزرتے ہیں، ہجر و انتظار طول کھینچتے ہیں لیکن گزرنا ہر دو کا مقدر ہے۔

انتظار کا اختتام قدموں کی چاپ پر ہوا تھا۔ لورا اضطرابی انداز میں کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جس سرعت سے اٹھی اتنی ہی تیزی سے بیٹھ گئی۔

"سنائپر پتر! آج ہمیں آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی ہے، لیکن تیرے لیے ایسا علاج سوچا ہے کہ آئندہ کم از کم باپ نہیں بن سکو گے۔" رودی استہزائی انداز میں کہتا ہوا اندر گھسا۔ اس کے ہاتھ میں ہتکڑی تھی۔ عقب میں سربن تھا جس نے رسی کو پکڑا ہوا تھا۔ گوتم دروازے ہی پر کھڑا ہو گیا۔ میں نقاہت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھنے لگا۔

"استاد سنا ہے چھمک چھلو میجرا سے ملنے آئی تھی۔" یقیناً رودی نے ممتا دیدی کا ذکر کیا تھا۔

گوتم بولا۔ "کرن صاحب نے اسے کچھ زیادہ ہی سر پر چڑھایا ہوا ہے۔"

"سر پر تو نہیں البتہ ...." رودی نے ممتا دیدی کے لیے نہایت لچر، غلیظ اور بے ہودہ الفاظ استعمال کیے دونوں مردوں نے قہقہہ لگا کر اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ان لمحات میں رودی، سربن کی جانب متوجہ ہوا۔ ان پر حملہ کرنا میرا حصہ تھا۔ لیکن اس کی گھٹیا بات نے میرے دماغ میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔ یوں لگا میری سگی بہن کے خلاف بات کی گئی ہو۔ پوری قوت استعمال کرتے ہوئے میں نے گھٹنا اس کی ٹانگوں کے بیچ اٹھا دیا۔

''اففف۔'' وہ کراہتے ہوئے جھکا، اس کے ہاتھ مضروب مقام کی طرف بڑھے تھے۔
میرا گھٹنا دوبارہ اٹھا، اب نشانہ اس کی ٹھوڑی بنی تھی۔ زوردار کراہ کے ساتھ وہ لمبا لیٹ گیا تھا۔
''تم کتے...'' سربن مغلظات بکتا ہوا بڑھا۔ جسمانی تکلیف کو خاطر میں لائے بغیر میں قدم آگے بڑھا، اچھلا، میرا گھٹنا نیزے کے سرکی طرح اس کے پیٹ کی طرف بڑھا تھا۔
ایک تو وہ تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ دوسرا میں بھی دو قدم لے کر زور سے اچھلا تھا۔ ''دھپ۔'' کی زوردار آواز ابھری۔ گھٹنا اس کی بائیں پسلیوں کے نیچے لگا تھا۔ وہ ڈکراتا ہوا نیچے گرا اور اذیت سے تڑپنے لگا۔
گوتم ہکابکا کھڑا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی وہ صورت حال نہیں تھی۔ اس نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالنا چاہا، لیکن اس کی بدقسمتی کہ تب تک لورا قریب پہنچ چکی تھی۔ اسے آخری لمحات میں گڑبڑ کا ادراک تو ہو گیا تھا، مگر اس کے سنبھلنے سے پہلے لورا نے کھڑی ہتھیلی کا وار گردن پر کیا، وہ ملبلاتا ہوا اوندھے منہ گر گیا تھا۔
تینوں ہماری توقع سے بھی نرم ہدف ثابت ہوئے تھے۔ لورا نے فوراً گوتم کے پستول پر قبضہ جما لیا تھا۔
روی اور سربن کی تلاشی لے کر میں نے دونوں کے پستول نکالے اور بیلٹ کھول کر ان کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔
گوتم کی جسامت مجھ سے ملتی تھی۔ اس کے جوتے اتار کر میں نے پاؤں میں ڈالے اور قمیص اتار کر پہن لی۔ سب کی جیبوں سے نکلنے والی تھوڑی بہت نقدی بھی اپنی جیب میں منتقل کی۔ اور گوتم کے ہاتھ بھی جکڑ دیئے۔ اتنی دیر میں کسمسا کر تینوں ہوش میں آنے لگے تھے۔
میں لورا کو مخاطب ہوا۔ ''شاید تم سے دیکھا نہ جائے، بہتر ہو گا داخلی دروازے پر چلی جاؤ۔''
''ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔'' اس نے بے صبری ظاہر کی۔
''مقدر نے موقع دے ہی دیا ہے تو سینہ ٹھنڈا کرنے دو۔'' اپنا لہجہ مجھے بھی بیگانہ لگا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے ان کی درندگی کا نشانہ بن رہا تھا، اب بدلہ لینا تو بنتا تھا۔
''جلدی کرنا۔'' سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔
''تمھارا انجام بہت برا ہوگا۔'' ہوش میں آتے ہی گوتم نے دھمکی دی تھی۔
''اب میری باری۔'' گوتم کی جیب سے برآمد ہوئے چاقو کی تیز دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں زہرخند ہوا۔
گوتم نے اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ ''تم ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''
''ایسا بس تم سوچتے ہو۔'' میں نے اس کے بالوں کو مٹھی میں بھرتے ہوئے چاقو کی نوک اس کی آنکھ میں گھونپ دی تھی۔ اس کے حلق سے لرزا خیز چیخ برآمد ہوئی۔ ایسی ہی کئی چیخیں گزشتہ دو تین دنوں سے میرے حلق سے برآمد ہوری تھیں۔ چیخنے کے ساتھ اس کے منہ سے مغلظات کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ توجہ دیئے بغیر میں نے اس کی دوسری آنکھ میں بھی چاقو گھونپ دیا۔ تکلیف کی شدت سے وہ ذبح ہوئے جانور کی طرح پھڑک رہا تھا۔ پتلون سامنے سے گیلی ہوئی اور پانی نیچے تک پھیل گیا۔
روی اور سربن کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا تھا۔
''ب... بھگوان کے لیے، معاف کر دو......'' دونوں گھگھیائے۔
''اسی کے پاس بھیجنے لگا ہوں۔'' اطمینان سے کہتے ہوئے میں نے باری باری دونوں کی آنکھیں پھوڑ دی تھیں۔ مگر افسوس کہ میں زیادہ دیر ان کے تڑپنے کا دلکش منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تینوں مجھے گالیاں بک رہے تھے۔ خطرناک انجام کی

جھکیاں لے رہے تھے اور ساتھ بری طرح کروٹیں بدل رہے تھے۔

تینوں کے حلق سے گٹر کی گندگی کے مانند بدبودار اور گلی سڑی گالیاں برآمد ہو رہی تھیں۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''تمھارا تو پتا نہیں لیکن مجھے بہت مزا آرہا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں تم زیادہ سے زیادہ تکلیف کاٹو لیکن وقت کی کمی کے باعث یہ دلکش نظارہ دیکھ نہیں سکتا۔'' افسوس کا اظہار کرتے ہوئے میں نے تینوں کی کلائیوں کی رگیں کاٹ دیں۔ خون تیزی سے فرش رنگین کرنے لگا تھا۔ ان کے لباس پر رگڑ کر میں نے چاقو صاف کیا اور چاقو جیب میں ڈال لیا۔ وہ کبھی گالیاں بکتے، کبھی زندگی کی بھیک مانگنے لگتے۔

میں کبھی اتنا سنگ دل اور بے رحم نہیں رہا کہ کسی کے تڑپنے پر لطف اندوز ہو سکوں، مگر ان تینوں نے مجھ پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔ اتنی اذیتیں دی تھیں کہ میں سرتاپا انتقام میں ڈھل گیا تھا۔ میں نے تالے کی چابی لورا والے دروازے میں [illegible] کر چھوڑ دی، تاکہ تفتیش کرنے والے سمجھیں میں نے ان تینوں کو ہلاک کر کے لورا کو آزاد کرایا ہے۔ یوں کے قتل میں کسی کو بھی شک نہ گزرتا۔ لورا نے متاریدی کی چٹنی وہیں پھینک دی تھی۔ وہ میں نے اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ جو عزیز ہوتے ہیں انسان ہر حال میں پہلے ان کے بھلے کا سوچتا ہے۔ اس وقت بھی میرے دماغ میں متاریدی کی حفاظت کا خیال حاوی تھا۔ تبھی احتیاطی تدابیر پر عمل کر گزرا تھا۔ ورنہ وہ پھنس جاتیں۔ ان کا میرے ساتھ ہونا ان کے بڑوں کی نظر سے اوجھل نہیں تھا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انھیں ذرا بھر تکلیف پہنچے۔

لورا بے چینی سے منتظر تھی۔ ہم عمارت سے انجان تھے۔ نامعلوم وہاں کتنے افراد موجود تھے۔ اور ان کے پاس کون کون سے ہتھیار تھے۔ کیوں کہ مرنے مارنے کا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور ان کے ہاتھ آنے کا مطلب دردناک موت کو گلے لگانا ہوتا۔

وہ برہم ہوئی۔ ''اتنی دیر لگا دی۔''

اس کے واویلے کو در خور اعتنا نہ جانتے ہوئے میں نے پستول کاک کیا۔ ''کوشش کرنا کسی کی جان ضائع نہ ہو۔''

وہ طعنہ زن ہوئی۔ ''ان تینوں کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔''

''وہ اسی قابل تھے، باقی کسی کے ساتھ ہماری دشمنی نہیں ہے۔''

اس نے منہ بنایا۔ ''مجھے صرف شکلا کی گردن اتارنے میں دلچسپی ہے۔''

''مجھے شانہ بہ شانہ پاؤ گی۔'' اس پر احسان دھرتے ہوئے میں نے دروازے کو آہستگی سے اندر کی جانب کھینچا۔ وہ کچھ کہنے لگی تھی مگر مجھے دروازے کھولتے دیکھ کر ہنکارا بھر کر رہ گئی تھی۔

دروازے میں جھری کر کے میں نے باہر جھانکا۔ سامنے سامان سے عاری کمرہ نظر آیا۔

''چلو۔'' میں سرعت سے باہر نکلا۔ لورا نے میری تقلید کی تھی۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈو اور پیشہ ور سنائپر تھی۔ کوئی عام لڑکی نہیں کہ مجھ پر بوجھ ہوتی۔ کمرے کے داخلی دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اسے داہنی جانب کا خیال رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلا دیا تھا۔

ہم نے ایک ساتھ دروازے کے دونوں پٹ کھولے اور سرعت سے باہر نکلے، دونوں جانب طویل راہداری تھی۔

''اس طرف۔'' سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں بائیں جانب بڑھ گیا۔ لورا میرے پیچھے ہو لی۔ میں مکمل سامنے کی طرف متوجہ تھا، جبکہ لورا الٹے قدموں بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ عقب کا خیال رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ ہم نے کسی بھی کمرے میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ہماری اولین ترجیح وہاں سے بہ خیریت نکلنا تھا۔ موڑ کے قریب پہنچتے ہی ہم دیوار سے ٹیک لگا کر رکے اور پھر ایک ساتھ سامنے ہوئے۔

چند قدموں کے فاصلے پر دو مسلح افراد خراماں خراماں تشریف لا رہے تھے۔ دونوں کے ہتھیار کندھے پر لٹک رہے
''ہاتھ اوپر۔'' میں نے دھیمے مگر سخت لہجے میں کہا تھا۔ لہجے سے زیادہ میرے پستول نے انھیں ڈرایا تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے دونوں نے ہاتھ بلند کر لیے تھے۔

ہم نے بجلی کی سی سرعت سے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ زندگی و موت کا کھیل جاری تھا، ایسے حالات میں مجھے بہت تکلیف بھولی ہوئی تھی۔

''الٹا گھومو۔'' قریب جاتے ہی میں نے حکم دیا۔

مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے وہ مڑ گئے۔ لورا کی سوالیہ نظریں میری جانب اٹھیں۔ میں نے اوپر نیچے ہلاتے ہوئے پستول کو نال سے پکڑا۔ اور دستہ پوری قوت سے سامنے والے کے سر میں جڑ دیا تھا۔ لورا بھی پیچھے نہ رہی، نے کافی سخت وار کیا تھا۔ مضروب دھڑام سے پختہ فرش پر گر پڑے۔

دونوں نے گلے میں ''نائین ایم ایم کاربائن ون اے ون'' لٹکائی ہوئی تھیں۔ جس کی میگزین میں چونتیس گولیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ انڈیا کی ایجاد کردہ سب مشین گن تھی۔ اور کارکردگی میں پستول سے بہتر ہے۔ ہم نے اپنے پستول پتلون کے عقب میں اڑسے اور کاربائن قبضے میں کیں۔ ان کے فولڈنگ بٹ سیدھے کر کے ہم نے کاک کیا اور آگے بڑھ گئے۔

راہداری کا اختتام ایک کھلے ہال میں ہوا، جس ایک کونے میں آمنے سامنے صوفے رکھ کر ڈرائینگ روم کی شکل دی گئی تھی۔ وہاں دو افراد شیشے کے گلاس تھامے پینے میں مصروف تھے۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''ہاتھ اوپر۔'' میں نے کاربائن کی نال سے بھی اشارہ کر دیا تھا۔

ایک آدمی اعتماد سے بولا ''جوان اپنی سختیوں میں اضافہ کر رہے ہو۔ اگر سوچ رہے ہو چھپ جاؤ گے تو یہ غلط فہمی دل سے نکال دو۔ ممبئی کا کوئی کونہ تمھیں پناہ نہیں دے گا۔''

میں دبنگ لہجے میں بولا۔ ''تمھارا مسئلہ اپنی جان بچانا ہے، جو تم ہاتھ اٹھا کر ہی بچا سکتے ہو۔''

انھوں نے ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔

''آگے بڑھو۔'' ان کی پیٹھ سے کاربائن کی نالیں جوڑ کر ہم نے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

دو قدم لیتے ہی لورا کے سامنے والے نے تیزی کا مظاہرہ کیا اور ایک دم مڑ کر ہتھیار پر ہاتھ ڈال دیا۔ بیرل پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اس نے دھانے کا رخ خود سے ہٹایا، مگر لورا کے جوابی ردعمل کا توڑ نہیں سوچا تھا۔ اس نے لورا کو کمزور اندازہ لگایا تھا، وجہ یقیناً اس کا لڑکی ہونا تھا۔

لورا نے کاربائن کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جونہی مخالف نے بیرل کو پکڑا، قدم بھرتے ہوئے وہ قریب ہوئی اور ایک دم اپنا گھٹنا اٹھا دیا۔

''اوغ۔'' کی بلند آواز سے وہ جھکا، اس کی گرفت کاربائن کی نال پر ڈھیلی ہو گئی تھی۔ لورا نے کاربائن کھینچتے ہوئے بٹ کو مضبوطی سے پکڑا اور نال پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کر دی تھی۔

وہ لہراتے ہوئے زمین بوس ہو گیا تھا۔

اسی وقت دو افراد دندناتے اندر آئے۔ جانے کیسے انھیں خطرے کا احساس ہوا تھا کہ دونوں نے ہتھیار فائرنگ پوزیشن میں پکڑے تھے۔

''خبردار ہاتھ اوپر۔'' ایک درشت لہجے میں چلایا۔ اس کا فقرہ بہ مشکل پورا ہوا تھا کہ میں نے گھٹنا نیچے ٹیک کر دو مرتبہ

لبلبی دبا دی۔ اتنی تیزی سے چلائی ہوئی گولیاں رائفلوں پر لگی تھیں۔ ان کے ہاتھوں سے ہتھیار گر گئے تھے۔ ایک کے بازو پر ہتھیار سے اچٹ کر گولی گہری خراش ڈال گئی تھی۔

میں دھاڑا۔ ''ہاتھ اٹھا کر جان بچا سکتے ہو۔'' انھوں نے گھبرا کر ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔

گولی چلنے پر اندرونی عمارت سے شور وغل کی آواز بلند ہوئی تھی۔ نہ جانے وہاں کتنے افراد موجود تھے۔ اگر سب اکٹھے ہو جاتے تو ہمارا بچ نکلنا ناممکن ہو جاتا۔ میں لمحے کے بیسویں حصے میں فیصلہ کیا اور کاربائن کی نال بڑی قوت سے اپنے قیدی کے سر پر رسید کر دی۔ وہ تیز کراہ کے ساتھ نیچے گر گیا تھا۔

اس دوران لورا گن تانے دونوں محافظوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔

''انھیں قبضے میں لو۔'' کاربائن سیدھی کرتے ہوئے میں لورا کو مخاطب ہوا۔

میرے چوکس ہونے کا یقین کرتے ہی لورا نے دونوں ہتھیار قبضے میں لے لیے۔ ان کے پاس کلاشن کوفیں تھیں۔

''گھوم جاؤ ....'' قریب ہوتے ہی میں دھاڑا۔ ہمیں طیش بھری نظروں سے گھورتے ہوئے انھوں نے رخ تبدیل کیا۔ لورا اور میری کاربائن ایک ساتھ حرکت میں آئی تھیں۔ ان کے سر کی سختی کا اندازہ کاربائن کی فولادی نال سے کر کے ہم نے عارضی طور پر چھٹکارا پایا۔ لورا نے ایک کلاشن کوف میری جانب بڑھا دی تھی کہ کارکردگی کے لحاظ سے کلاشن کوف کاربائن سے بہتر ہے۔ دونوں کلاشن کوفوں کے ساتھ دوہری میگزینیں لگی تھیں۔ (دو میگزینوں کو ایک دوسرے کے مخالف رکھ کر درمیان سے شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ اور پھر ایک میگزین کے خالی ہونے پر دوسری میگزین لگائی جاتی ہے) حفاظتی لیور کو اکیلی گولی (سنگل فائر) پر لگا کر میں نے کاک کیا۔ گن پہلے سے کاک ہو سکتی تھی اور ایسا ہونے کی صورت چیمبر میں پڑی گولی باہر نکل جاتی۔ لیکن ہتھیار کے کاک ہونے کی تصدیق کرنا ہر تربیت یافتہ کا پہلا اصول ہے۔ کاکنگ ہینڈل چھوڑتے ہی چیمبر سے گولی باہر نہیں نکلی تھی۔ جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ ان سورماؤں نے اب تک کلاشن کوفوں کو کاک نہیں کیا تھا۔

یہی حرکت لورا بھی دہرا چکی تھی۔ گنیں کاک کرتے ہوئے ہمارے قدم بہرحال رکے نہیں تھے۔ ہال سے نکلتے ہی ہم طویل برآمدے میں پہنچے۔ لورا نے لکڑی کا دروازہ بھیڑا اور کنڈوں میں ون اے ون کاربائن کی میگزین پھنسا کر عارضی رکاوٹ کھڑی کر دی۔ میں داخلی دروازے پر کھڑے چوکیدار کی طرف متوجہ تھا، جس نے ہمیں دیکھتے ہی کلاشن کوف سیدھی کر لی تھی۔

''نیچے ....'' زور سے چیختے ہوئے میں نے لورا پر چھلانگ لگائی اور اسے ساتھ لیے ڈھیر ہو گیا۔

''تڑ تڑ.... تڑ'' کی بھیانک آواز سے گولیاں لکڑی کے دروازے سے ٹکرائی تھیں۔ مجھے ایک لمحے کی دیر ہو جاتی تو لورا چھلنی ہو گئی ہوتی۔ کلاشن کوف میرے ہاتھ سے نیچے گر گئی تھی۔ پختہ زمین سے اتصال ہوتے ہی میرے منہ سے زوردار کراہ خارج ہوئی تھی۔

''ریحا......'' لورا متوحش ہو کر چلائی۔ وہ میرے بازوؤں میں تھی۔ اسے لگا مجھے گولی لگی ہے۔

''ٹھیک ہوں۔'' اسے گرفت سے آزاد کرتے ہوئے میں لڑھک کر اپنی کلاشن کوف کے نزدیک ہوا۔ اس دوران لورا دو مرتبہ لبلبی دبا چکی تھی۔ دونوں گولیاں چوکیدار کی ٹانگوں میں لگی تھیں۔ وہ چیختا ہوا نیچے گرا۔ لیکن اس نے کلاشن کوف کو نہیں چھوڑا تھا۔ کہنی کے بل لیٹتے ہوئے اس نے کلاشن کوف کو سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے میری گن گولی اگل چکی تھی۔ گولی لکڑی کے فرنٹ ہینڈ گارڈ سے ٹکرائی اور گن اس کے

ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

لورا کے منہ سے بے ساختہ تحسین آمیز انداز میں برآمد ہوا۔ ''تم واقعی شارپ شوٹر ہو۔'' میرے نام اس ملکہ نے خود ساختہ معنی پہنائے۔

''گاڑی لاؤ، میں دروازہ کھولتا ہوں۔'' اسے ہدایت دیتا ہوا میں بھاگ پڑا۔ چوکیدار زخموں کی پروا کیے بغیر گیٹ کی طرف رینگ رہا تھا۔ ڈرائینگ روم کے دروازے پر بھی کھٹ پٹ شروع ہو گئی تھی۔ یقیناً لورا کا کنڈوں میں پھنسا رہنا بھی مفید رہا تھا۔

چوکیدار کے کلاشن کوف تک پہنچنے سے پہلے میں اس تک پہنچ گیا تھا۔ میرے پاؤں کی بھرپور ٹھوکر اس کے سر پر لگی، ماتھا پختہ فرش سے ٹکرایا اور اسے عارضی طور پر ساری تکالیف سے چھٹکارا مل گیا۔ اسے پاؤں سے گھسیٹ کر میں نے دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور کنڈا کھول کر دروازے کے پٹ کھول دیے۔

اندرونی عمارت کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ وہ دروازہ کھولنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے، کامیاب ہونے پر ہماری مشکلات میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ انھیں دروازے سے دور رکھنا نہایت ضروری تھا۔ کلاشن کوف سیدھی کر کے میں نے دروازے کے نچلے حصے پر برسٹ مار دی، تاکہ گولی کسی کی موت کا سبب نہ بنے۔ لکڑی کا انچ دو انچ موٹا دروازہ گولی کو نہیں روک سکتا تھا۔ اس متعلق میں پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ دو تین انچ موٹی لکڑی کلاشن کوف وغیرہ کی گولی کو روک سکتی۔

تین چار گولیاں ضائع ہوتے ہی دروازے کا دھڑ دھڑانا رک گیا تھا۔

اسی وقت نئے ماڈل کی ڈبل کیبن دروازے کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لورا بیٹھی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا لورا صحن میں گاڑی روکے اس لیے فوراً گلی میں نکل گیا۔ کسی بھی جانب سے گولی چل کر ہمیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ ہم نہ صرف عمارت کے حدود اربعہ سے انجان تھے، بلکہ وہاں موجود آدمیوں کی تعداد سے بھی ناواقف تھے۔ وہ پوش علاقہ تھا گلی کافی کشادہ اور صاف ستھری تھی۔

باہر آتے ہی اس نے ایک لمحے کو بریک دبائی اور میں سرعت سے اگلی نشست پر منتقل ہو گیا۔

لورا نے اگنیشن کی تاریں توڑ کر گاڑی کو سٹارٹ کیا تھا۔

''یہ سمت ٹھیک ہے۔'' گاڑی آگے بڑھاتے ہی اس نے تصدیق چاہی۔

''ممبئی میرے لیے بھی اتنا ہی انجان ہے جتنا تمھارے لیے۔'' میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے پیچھے جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''وہاں اور گاڑیاں نہیں تھیں؟''

''کھڑی تھیں۔'' گلی کا موڑ تیزی سے کاٹ کر اس نے نسبتاً کھلی گلی میں رفتار بڑھا دی تھی۔

میں برہم ہوا۔ ''ان کے ٹائروں کو پنکچر نہ کرنے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

وہ نادم ہوئی۔ ''معذرت، خیال نہیں رہا۔''

میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''بے خیالیاں زیادہ عرصہ راس نہیں آیا کرتیں۔''

''معذرت کر تو دی ہے۔'' میرا طنز کرنا اسے برا لگا تھا۔

''معذرت کرنا، خطا کا اعتراف ہے۔ اور ضروری نہیں کہ غلطی کے اقرار پر معافی مل جایا کرے۔''

وہ برہم ہوئی۔ ''تمھارے زیر کمان (انڈر کمانڈ) نہیں ہوں۔''

''تمھاری غلطی سے وہ ہمارا تعاقب بھی کر سکتے تھے۔''
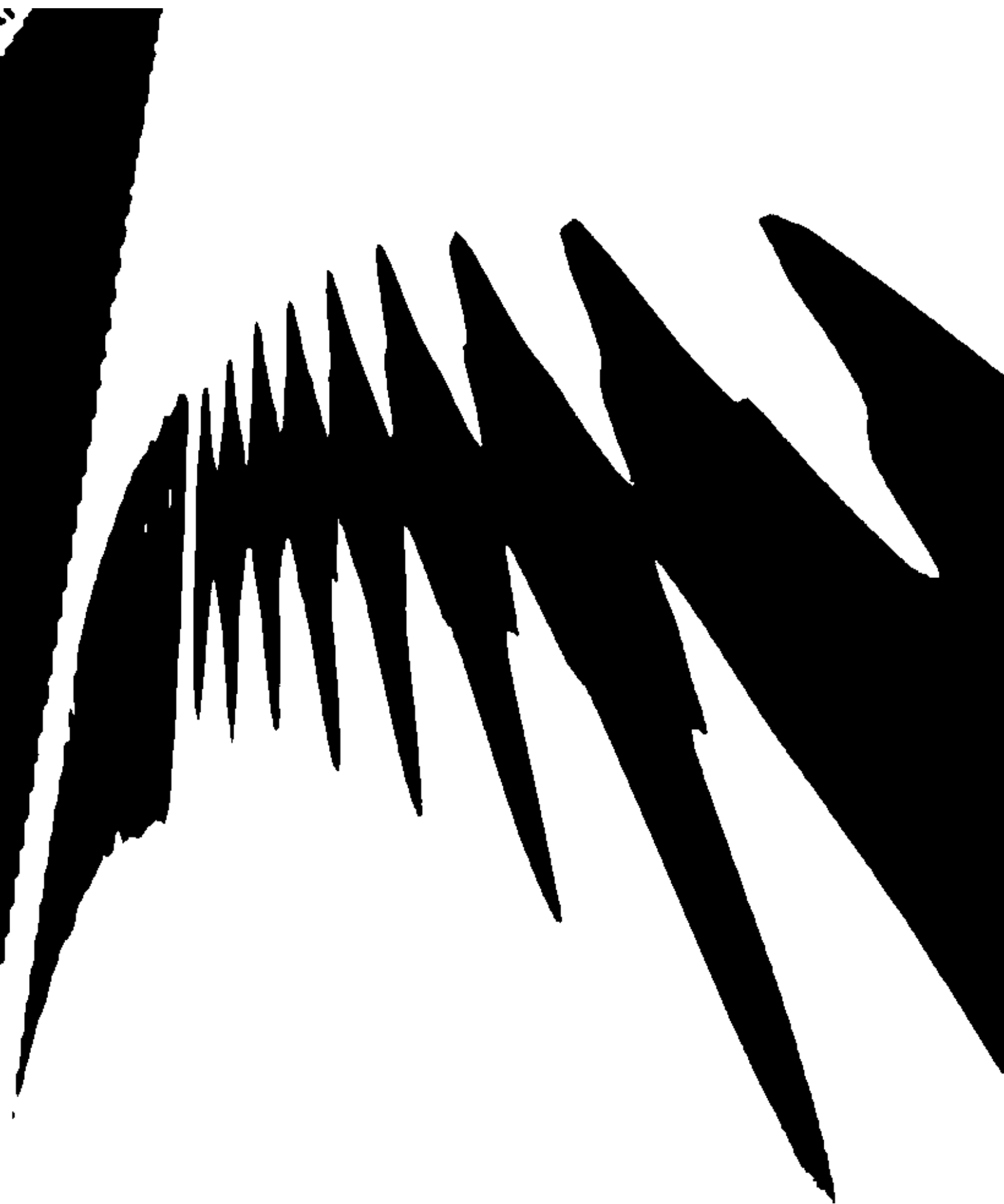
لورا نے کار آگے بڑھائی، ترتڑاہٹ چکا تھا۔ میری سماعتوں میں کسی کے چیخنے کی آواز پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو سائیکل
گئے تھے۔ اور کاروں کا ... ہونے کی وجہ ... باہر نکل کر دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ساتھ ہی اوپر
والوں کو ہمیں روکنے کی ہدایت کر رہے تھے۔

میں چیخا۔ "تیز چلو۔" لورا میری ہدایت سے پہلے ہی ایکسی لیٹر دبا چکی تھی۔ اسی وقت ترتڑاہٹ کو جھٹکا گر آخری کار
میں وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

میں عقبی جانب متوجہ ہوا۔ ترتڑاہٹ پیچھے ہو گیا تھا۔ غالباً وہ پولیس والوں کو اپنی پہچان کرا رہے تھے۔

اس دوران ہم فرلانگ بھر آگے آ گئے تھے۔ تبھی ناکے سے تین گاڑیاں آتی دکھائی دیں۔ ان میں دو گاڑیاں
ہمارے دشمنوں کی تھیں اور تیسری پولیس کی جیپ تھی۔

"بغلی سڑک (لنک روڈ) کو نظر میں رکھنا۔" میری ہدایت پر اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

کلومیٹر بھر آتے ہی چوک آیا۔ لورا دائیں مڑ گئی۔ وہ سڑک مضافات کو جا رہی تھی۔ تبھی رش نسبتاً کم تھا۔ لورا نے
ہونٹ بھینچتے ہوئے رفتار بڑھا دی تھی۔ مگر دشمن بھی تیز رفتاری سے تعاقب کر رہے تھے۔

میں نے عقبی شیشہ کھول کر کلاشن کوف کی نال کھڑکی پر ٹکا دی، لیکن مجھے گولی ضائع کرنے کا شوق نہیں تھا۔ اور یہ بھی
خطرہ تھا کہ گولی غلطی سے کسی بے گناہ کو بھی لگ سکتی تھی۔

لورا نے مشورہ دیا۔ "بے شک نہ لگے مگر گولی چلانا مفید رہے گا۔" اسے عقبی شیشے (بیک مرر) میں میری کارروائی
نظر آ گئی تھی۔

دشمن نے شاید اس کے الفاظ سن لیے تھے تبھی ترتڑاہٹ کی آواز سے فضا گونج اٹھی تھی۔ انھوں نے دو تین لمبے برسٹ
فائر کیے مگر ہم محفوظ رہے تھے۔

لورا کا جھلایا ہوا استفسار گونجا۔ "ریجا! فائر کیوں نہیں کر رہے؟"

میں اطمینان سے بولا۔ "گولی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ بیزاری سے بولی۔ "گولیوں کے بجائے جان بچاؤ۔"

"گولی چلانے سے جان نہیں بچا کرتی مادام! گولی ہدف پر مارنے سے جان چھوٹتی ہے۔ اور ایسی حالت میں
ATGM (اینٹی ٹینک گائیڈنگ میزائل) ہی سے کارآمد فائر کیا جا سکتا ہے۔" (یہ بکتر شکن میزائل ہوتا ہے جو فائر ہونے
کے بعد بھی فائرر کے قابو میں ہوتا ہے۔ اور وہ جدھر چاہے میزائل کو موڑ سکتا ہے)

"نک، ایسے ہی فائر کیا کرتا تھا کہ لگتا گولی فائر ہونے کے بعد بھی اس کے قابو میں ہے۔"

"تو میں نے کب نک سے اچھا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔" مجھے مرے ہوئے دشمن کے خلاف بولنا بہتر نہیں لگا تھا۔ اور
یہ تو تعریف کرنے والی بھی جانتی تھی کہ اس کی بات میں کہاں تک سچائی تھی۔

دشمنوں کی جانب سے تسلسل سے فائر کیا جا رہا تھا۔ مگر درمیانی فاصلہ، متحرک ہدف اور چلتی گاڑی سے ہمیں نشانہ بنانا
ممکن نہیں تھا۔ البتہ کسی بھولی بسری گولی کا ہدف تک پہنچ جانا اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔

ایک لمبا چھنا فائر ہوا۔ کم بخت نے پوری میگزین ہی فائر کر دی تھی۔ دو تین گولیوں نے ڈبل کیبن کی چھت
چھائی۔ لورا نے رفتار بڑھا دی تھی۔ کشادہ سڑک پر گاڑی یوں فراٹے بھر رہی تھی جیسے رن وے پر جہاز دوڑتا ہے۔
گاڑیوں کے درمیانی خلا سے مہارت سے ڈبل کیبن آگے نکالے جا رہی تھی۔ ہاتھ اسٹیرنگ کی چرخی کو دودھ بلونے والی
مدھانی کی طرح گھما رہے تھے۔ تین چار اشارے اس نے بلا جھجک توڑے تھے۔ اگر شہر کی اندرونی سڑک ہوتی تو یقینا

اشارہ توڑنا بھی ممکن نہ رہتا، مگر یہ کشادہ سڑک شہر سے باہر جا رہی تھی تبھی سرخ اشارے پر گاڑیوں کا اتنا رش نہیں ہوتا تھا کہ گاڑی آگے نہ نکالی جا سکتی۔ البتہ یہ لاقانونیت چند پولیس والوں کو متوجہ کرنے کا باعث بنی تھی۔ تبھی دو موٹر سائیکل سوار تیزی سے ہمارے قریب پہنچ رہے تھے۔

ایک موٹر سائیکل سوار نے دائیں طرف سے ہو کر آگے گزرنا چاہا، لورا کی نظر بیک وقت عقبی شیشے اور سامنے تھی۔ جونہی موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ ڈبل کیبن کے عقبی حصے کے قریب پہنچا، اچانک ہی لورا نے اسٹیرنگ کو مہارت سے موڑتے ہوئے ایک دم بریک کھینچی۔ پہیوں کی چرچراہٹ ابھری، موٹر سائیکل کا اگلا پہیہ گاڑی سے ٹکرایا، موٹر سائیکل پھسلی اور سوار سڑک پر جا گرا تھا۔ لورا نے فوراً ہی بریک سے پاؤں ہٹا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ دوسرا سوار بائیں جانب سے آگے نکلنے کی تگ و دو میں تھا۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے کلاشن کوف کی نال باہر نکالی۔ ایک دم موٹر سائیکل سوار نے رفتار کم کر کے جان بچانے کا سوچا تھا۔

اب دشمنوں اور ہمارے بیچ درجن بھر کاریں موجود تھیں تبھی وہ فائر نہیں کر پا رہے تھے۔

مسلسل ادھ پون گھنٹے ہم آگے پیچھے حرکت میں رہے۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ پیچھا چھوڑنے پر آمادہ ہوں گے۔ سڑک شہر سے باہر جا رہی تھی اور مجھے خطرہ تھا کسی بھی لمحے ہمارا واسطہ پولیس ناکے یا چیک پوسٹ وغیرہ سے پڑ سکتا تھا۔ یوں مسلسل ایک سڑک پر سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ ان کے پاس ملاپ کے ذرائع موجود تھے۔ اور اگلی چوکیوں کو باخبر کرنا حماقت و بے وقوفی ہوتی۔ یقیناً دشمن ایسی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

شاید لورا نے میری سوچ پڑھ لی تھی کہ اچانک رفتار میں کمی ہوئی، میں نے سامنے دیکھا۔ ایک بغلی سڑک دائیں جانب نکل رہی تھی۔ ایکسی لیٹر پر دباؤ ہلکا کرتے ہوئے لورا نے ایک دم موڑ کاٹا۔ ایک لمحے کو مجھے لگا گاڑی الٹ جائے گی مگر لورا نے مہارت سے موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی کو سنبھال لیا تھا۔ سیدھا ہوتے ہی لورا نے رفتار دوبارہ بڑھا دی۔ بغلی سڑک کمان کی طرح خم دار تھی۔ اور تسلسل سے دائیں اور ہلکا سا پیچھے گھوم رہی تھی۔ موڑ سے دو تین سو قدم دور آتے ہی میں چلایا۔

"بریک لگاؤ۔"

"کیا ہوا؟" لورا نے گھبراتے ہوئے ایکسی لیٹر سے پاؤں ہٹا کر بریک دبا دی تھی۔ ٹائر زوردار آواز میں چیخے، میں جھٹکے سے اگلی نشست سے ٹکرایا اور پھر سنبھل کر سرعت سے باہر نکل گیا۔

تعاقب کرنے والے موڑ کاٹ چکے تھے اور تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ گھٹنا زمین پر ٹیک کر میں نے شست لی۔

متحرک ہدف کو نشانہ بنانے کو ہمیشہ لیڈ لی جاتی ہے۔ جو ہدف کی رفتار کو مدنظر رکھ کر لی جاتی ہے۔ کیوں کہ براہ راست ہدف پر شست لی جائے تو جب تک گولی ہدف تک پہنچتی ہے، متحرک ہدف آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ لیکن کاروں کا رخ ہماری ہی جانب تھا، اس لیے مجھے لیڈ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شست سادھنے میں مجھے ایک دو سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ لبلبی دباتے ہی گولی کی آواز کے بعد ٹائر پھٹنے کا زوردار دھماکا ہوا۔ تیز رفتار کار ڈرائیور سے نہیں سنبھلی تھی۔ البتہ اس نے کار کو الٹنے سے بچا لیا تھا۔ کار سڑک سے اتر کر ایک درخت سے جا ٹکرائی۔

اس دوران میں عقبی کار پر شست سادھ چکا تھا۔ جو کافی قریب آ چکی تھی۔ اگلی گولی نے اس کا ٹائر پھاڑا۔ یہ ڈرائیور زیادہ ماہر نہیں تھا، تبھی کار لڑھکتے ہوئے سڑک سے دور جا گری تھی۔ سب سے آخر میں پولیس کی جیپ تھی۔ انھوں نے شاید خطرہ بھانپ لیا تھا۔ تبھی دور ہی رک گئے تھے۔

میرے پاس ؟ گولی چلانے کا وقت نہیں تھا۔ ان کے رستے کے بارے میں نے جیپ کے اگلے [illegible]
ایک ایک گولی پھینک دی تھی۔ کان پھاڑ دینے والے دھماکے ہوئے۔ میں مڑ کر دوڑ پڑا۔ دشمن کی جانب سے [illegible]
ہوا۔ گولیاں [illegible] کی آواز سے میرے سر کے اوپر سے گزری تھیں۔ دو تین گولیاں، ایل کیمن کی [illegible]
درست ہوگئی تھیں۔
میں نے اگلی سیٹ پر نشست سنبھالی۔ لورا تیار بیٹھی تھی۔ بریک سے پاؤں ہٹاتے ہوئے اس نے ایکسی لیٹر [illegible]
دیا۔ گاڑی جو جھٹکا کھا کر آگے بڑھی۔ میں بمشکل سر ونڈ سکرین سے ٹکرانے سے بچا سکا تھا۔ ایل کیمن، کمان سے نکلے
تیر کی طرح اڑنے لگی۔
بھاگ کر ہم خطرے کی حدود سے نکل آئے ہیں۔ مگر اسی وقت موڑ کی جانب سے پولیس گاڑیوں کے [illegible]
سائرن کی آواز گونجنے لگی۔
میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔ "پولیس کاریں عام گاڑیوں سے تیز رفتار ہوتی ہیں۔ زیادہ دور نہیں جا سکیں گے۔"
وہ مستفسر ہوئی۔ "بھاگنے کے بارے کیا خیال ہے۔ تکلیف برداشت کرلو گے؟"
میں نے سنجیدہ لہجے میں شرارت اگلی۔ "تکلیف کیا چیز ہے، لوگ جان بچانے کو دشمن کا ساتھ برداشت کر لیتے

ہیں۔"
"طنز کر رہے ہو؟" وہ سچ میں سنجیدہ ہوگئی تھی۔
میں اطمینان سے بولا۔ "ہاں۔"
وہ کھلکھلائی۔ "رہا! تمھیں اس حالت میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔"
"ڈر انسان کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ نہ تو مناسب سوچنے کا چھوڑتا ہے اور نہ کچھ کرنے کی ہمت دیتا ہے۔ سیانے کہتے
ہیں 'جو ڈر گیا وہ مر گیا۔' موت کا فیصلہ تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ ڈرنے سے تو بچا جا سکتا ہے۔"
وہ مسکرائی۔ "مرنے سے بچنے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔" اور ایک دم کار کچے میں اتار دی۔ کار ہچکولے کھاتی ہوئی
آگے بڑھنے لگی۔ چھوٹے سے میدان کے بعد تعمیراتی علاقہ تھا۔ لورا نے گاڑی ایک عمارت کے بغل میں موڑ کر روکی، یوں
کہ اب سڑک سے گزرنے والے ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔
چند لمحوں بعد ہی پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتے ہوئے آگے گزر گئی تھیں۔ میں نیچے اتر کر موڑ کے پاس پہنچا اور
محتاط انداز میں جائزہ لینے لگا۔ تین گاڑیاں تیز رفتاری سے آگے گزر گئی تھیں۔ میں واپس گاڑی میں لوٹا۔ لورا نے اسٹیرنگ
ویل نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے گھورتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں سر ہلایا۔
تین گاڑیاں تھیں، شاید پیچھے مزید گاڑیاں بھی پہنچ جائیں۔ یہاں چھپنا مناسب نہ ہوگا۔ کیوں کہ سیدھی سڑک پر
ہمیں نہ پاکر اس جگہ پر شک کیا جا سکتا ہے۔"
اس نے ہینڈ بریک ہٹا کر گاڑی ریورس کی، کیوں وہاں سے آگے نہیں بڑھا جا سکتا تھا۔ گاڑی جونھی مکان کی آڑ سے
نکل کر چھوٹے میدان ہوئی، سڑک پر پولیس کی دو جیپیں نمودار ہوئیں۔ یہ صورت حال امکان سے بعید تو نہ تھی، کہ ہمیں
چنجا ہوتا۔ لورا نے دائیں موڑ کاٹتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔ پولیس کی جیپیں آگے نکل گئی تھیں، مگر ہم دیکھ لیے گئے
تھے۔ لورا نے گاڑی گلی میں دوڑا دی۔ گلی چونکہ فرلانگ بھر لمبی تھی، کبھی پہلے یہاں نہیں گھسے تھے، ورنہ پولیس کی کاروں کو
دینے میں کامیاب نہ ہو پاتے۔
میں نے پیچھے دیکھا، جیپیں سڑک سے میدان کی طرف مڑ گئی تھیں۔

لورا نے گلی میں گاڑی بھگادی تھی۔ جب تک دشمن میدان سے گلی میں داخل ہوتے ہم گلی عبور کر چکے تھے۔ گلی کے اختتام پر نالا تھا جس پر پل موجود نہیں تھا۔ لورا نے دائیں جانب اسٹیئرنگ کاٹا۔ راستہ زیادہ کشادہ نہیں تھا مگر ڈبل کیبن آسانی سے آگے بڑھ سکتی تھی۔ عقب سے فائرنگ کا درمیانی برسٹ ابھرا مگر ہم مڑ چکے تھے۔ البتہ اس فائرنگ نے مکینوں کو ضرور ہڑبڑا دیا تھا۔ گرمیوں کے موسم میں عموماً دوپہر ڈھلے تک آرام کیا جاتا ہے۔ سورج اب نیچے جھک رہا تھا۔ لورا نے تھوڑا آگے جاتے ہی دوبارہ دائیں جانب اسٹیئرنگ کاٹا اور گلی میں گھس گئی، کیوں کہ راستہ پکا نہیں تھا۔ اور ناھموار راستے پر تیزی سے گاڑی نہیں بھگائی جاسکتی تھی۔

میں عقبی نشست پر منتقل ہوگیا تھا۔ دشمنوں کی کاریں گلی میں موڑ کاٹتی نظر آئیں۔ اکادکا گھروں کی بالائی منزل سے متوحش سر گلی میں جھانکتے نظر آئے، مگر کسی نے داخلی دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تڑ...... تڑ...... تڑ'' کی بھیانک آواز ابھری، ایک دو گولیاں گاڑی کی باڈی میں گھس گئیں۔ تبھی لورا نے ایک دم بائیں موڑ کاٹا۔ میں چیخا۔ ''بریک لگاؤ۔''

میرا سابقہ اقدام اسے یاد تھا، بغیر سوال کے اس نے بریک دبادی تھی۔ نیچے اترتے ہی میں بھاگ کر موڑ کے قریب پہنچا۔ وہ پچاس ساٹھ گز دور تھے اور آندھی وطوفان کی طرح بڑھتے آرہے تھے۔

سیفٹی لیور کو سنگل راؤنڈ پر سیٹ کرتے ہوئے میں نے گھٹنا نیچے ٹیکا۔ مسلسل دو مرتبہ لبلبی دبا کر میں نے اگلی کار کے سامنے والے ٹائر ناکارہ کر دیے تھے۔ کار بری طرح لہرائی اور ایک گھر کے دروازے سے ٹکرا کر ایک جانب آدھی الٹی ہو گئی تھی۔ دوسری کار اس سے بیس پچیس گز پیچھے تھی۔ اگلی کار کو اٹھائے بغیر اس کا وہاں سے گزرنا ممکن نہیں تھا۔ میں بھی گولی چلانے کے بعد سیکنڈ بھر سے زیادہ نہیں رکا تھا اور فوراً بھاگ کر ڈبل کیبن میں بیٹھ گیا۔ لورا تیار تھی۔ بریک سے پاؤں ہٹا کر اس نے ایکسی لیٹر دبا دیا۔ پندرہ بیس آگے دائیں جانب ایک اور گلی نکل رہی تھی۔

''دائیں موڑو۔'' گلی نظر آتے ہی میں چیخا۔ کیوں کہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ہمیں عقب سے نشانہ بنا سکتے تھے۔

گلیاں اتنی کشادہ نہیں تھیں کہ زیادہ تیز رفتاری سے موڑ کاٹا جاسکتا، اس کے باوجود لورا کافی مہارت اور تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے موڑ کاٹنے تک عقب سے تڑتڑاہٹ کی آواز ابھر چکی تھی۔

لورا نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ایکسی لیٹر دبایا، ڈبل کیبن غراکر بھاگنے لگی۔ ذرا سی بے احتیاطی سے گاڑی کا پہیہ نالی وغیرہ میں پھنس سکتا تھا۔ گلی کی چوڑائی اتنی زیادہ نہیں تھی، مگر مصیبت یہ تھی کہ احتیاط برتنے میں بھی بچت نظر نہیں آرہی تھی۔ دشمن موت کے فرشتے کے روپ میں تعاقب میں تھے۔

اگلا موڑ ملنے تک دشمن گلی کے سرے پر نمودار ہو چکے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ اور فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ہمیں نشانہ نہ بنا پاتے۔ میں تیار بیٹھا تھا، جونھی انھوں نے ساکن ہو کر کلاشن کوفیں سیدھی کیں، ان سے پہلے میں نے مسلسل تین چار بار لبلبی دبا کر انھیں حواس باختہ کر دیا تھا۔ میں نے ان کی ٹانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اور صرف ایک ہی گولی نشانے کو چھو پائی تھی کہ متحرک گاڑی میں نشانہ سادھنا دشوار ترین ہے۔

ایک کے گرتے ہی باقی دو بوکھلاتے ہوئے آڑ میں ہوگئے تھے۔ اس اثناء میں لورا کو موڑ مل گیا تھا۔ رفتار ہلکی سی کم کر کے اس نے دائیں جانب گاڑی موڑی اور دوبارہ رفتار بڑھادی۔ دشمنوں کی طرف سے ایک دو چھوٹے فائر ہوئے، مگر وہ فقط اضطراری فائر تھا۔

گلی کشادہ تھی۔ لورا گاڑی کو سیدھا بھگائے گئی۔ میں عقب کی طرف متوجہ تھا۔ دشمن کسی بھی وقت نمودار ہوسکتے تھے۔ اچانک لورا کی متفکر آواز ابھری۔

''ریچا بری خبر ہے۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''بری خبر براہ راست سنایا کرو، اطلاع دے کر دہری اذیت نہ دیا کرو۔''

وہ جھٹ سے بولی۔ ''فیول گیج کی سوئی منہ چڑھا رہی ہے۔''

میں منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ایسے منہ کو چڑھانے کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔''

مجھے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے اس نے دانت پیسے۔ ''شاید تمھیں انڈین ایجنسیوں کے ہاتھوں سے مرنے کا شوق ہے۔''

میں مسکرایا۔ ''سامنے دیکھو کہیں مروا نہ دینا۔ اور مذاق برداشت کرنے کی عادت ڈالو۔''

اسی وقت ایک مکان سے کار برآمد ہوئی اور ہمارے سامنے چلنے لگی۔ چوکیدار کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہم قریب پہنچ چکے تھے۔ ایک دم لورا نے گاڑی مکان کے داخلی دروازے کی طرف موڑی، چوکیدار ایک پٹ بند کر چکا تھا۔ پٹ کو ٹکر مار کر ڈبل کیبن اندر گھس گئی۔ لورا نے فوراً بریک دبائی، چوکیدار ہکا بکا کھڑا تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نیچے چھلانگ لگا چکا تھا۔

''دروازہ بند کرو۔'' میں نے کلاشن کوف اس کی جانب سیدھی کی۔ اس کی رائفل دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ کن اکھیوں سے اپنی رائفل کو دیکھتے ہوئے اس نے تھوک نگلی۔ شاید ہیرو بننے کے چکر میں تھا۔

میں نے اطمینان بھرے انداز میں مشورہ دیا۔ ''گولی سے زیادہ تیز رفتاری سے حرکت کر سکتے ہو تو رائفل تک پہنچنے کی کوشش کرنا مفید ہو سکتا ہے۔''

''کک...... کیا چاہتے ہو؟'' وہ ہکلایا۔

''بتا تو دیا ہے کہ دروازہ بند کر دو۔''

اس نے مرے مرے انداز میں دروازہ بند کیا، اسی وقت اندرونی عمارت سے ایک جواں سال عورت برآمد ہوئی۔ اس نے گود میں بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ لورا کلاشن کوف تانتے ہوئے بولی۔

''ہینڈز اپ۔'' (ہاتھ اوپر)

میں نے چوکیدار کے قریب ہوتے ہوئے لورا کو جھڑکا۔ ''عقل کے ناخن لو، بے چاری کی گود میں بچہ نظر نہیں آ رہا۔''

لورا نے دھمکی تبدیل کی۔ ''غلط حرکت یا چلانے کی کوشش تمھیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

میں نے فوراً اسے تسلی دی۔ ''محترمہ! تمھیں ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا البتہ تمھاری آواز پر ہمارا تعاقب کرنے والے یہاں پہنچ گئے تو ان کی گولیوں سے بچنے کی ضمانت میں نہیں دے سکتا۔''

لورا کی سمجھ میں ہندی واردو نہیں آتی تھی تبھی خاموش رہی۔ میں نے چوکیدار کو کلاشن کوف سے ٹھوکا دیتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

عورت ہکلاتے ہوئے مجھے مخاطب ہوئی۔ ''گگ... گھر میں کچھ ایسا موجود نہیں جسے تم لوٹ سکو۔''

''بی بی! ہم تمھیں لوٹنے نہیں آئے، دشمنوں سے بچنے کو بھاگ رہے ہیں۔ اب بہتر ہو گا تم اندر گھس کر دروازہ کنڈی کرلو۔''

وہ گھبراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''تت... تم شمبھو کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔'' یقیناً چوکیدار کا نام شمبھو تھا۔

''یہ بھی تمھارے ساتھ ہی ہو گا۔ اور اب جلدی سے اندر گھسو۔'' آخری الفاظ میں نے قدرے غصے سے بولے۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ چوکیدار کو بھی اس کے پیچھے دھکیل کر میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ باہر سے کنڈی

وہ چند قدم آگے نکل گئی تھی۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ کرتے ہی وہ قدموں میں سستی لاتے ہوئے بولی: "[illegible]
کہیں پھندا ڈال رکھا ہے گا۔"
میں تحمل سے بولا۔ "تمھارا ساتھ دینے کی کوشش کر تو رہا ہوں۔"
وہ مصر ہوئی۔ "جلد ہی وہ ملاتے کو گھیر لیں گے۔ اور اس سے پہلے ہمیں زیادہ سے زیادہ دور ہو جانا ہو گا۔"
میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ بمشکل غصے پر قابو پاتے ہوئے میں گویا ہوا۔ "کیسے ممکن ہے تم جانتی ہو۔ [illegible]
میں ہماری بچت کے امکان بڑھیں گے۔"
ایک دم قریب ہوتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ "ریحانگی نے بہانے سے دھونڈ، ہم نے وعدہ لیا تھا [illegible]
مارنے میں میری مدد کرو گے۔"
"تم میری نسوانی حالت سے واقف ہو پھر ایسی کھواس کا مقصد؟"
اس نے سرعت سے صفائی دی۔ "جلد بازی میں دھیان نہ دے سکی۔"
میرے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہوا۔ "اتنی بے دھیانیاں اچھی نہیں ہوتیں۔"
وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ "شروع ہو گئی ریحا کی بکواس۔ یقین کرو افغانستان نے محاذ پر تم سے اتنا متاثر ہوئی تھی۔ تمھاری تلاش میں پاکستان جانے پر تل گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے میجر حیدر سے ملاقات ہوئی اور پتا چلا تم تبدیل ہو چکے ہو۔"
میں نے قہقہہ لگایا۔ "وہاں کئی بار تم سے گفتگو ہوئی تھی۔ اور ہر بار میں نے ڈیٹ کا وعدہ لیا تھا جب انداز ایسا نہیں ہوا تھا۔"
اس نے منہ بسورا۔ "میں نے سوچا مذاق کر رہے ہو۔"
"اور کب لگا کہ میں سنجیدہ ہوں۔" میں اسے کریدنے پر تل گیا۔
اس نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔ "کیا یہ وقت ان باتوں کا ہے؟" ہم گلی کے سرے پر پہنچنے والے تھے۔ وہ گلی ایک چوڑی گلی میں ضم ہو رہی تھی۔ اور چوڑی گلی آگے جا کر اس گلی سے مل رہی تھی جہاں سے ہم گھر میں گھسے تھے۔ دو لڑکے سامنے سے نمودار ہوئے۔ لورا کو اشتیاق بھری نظروں سے گھورتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔
لورا دو قدم آگے تھی۔ جونہی اس نے چوڑی گلی میں قدم دھرے، فوراً الٹے قدموں پیچھے ہوئی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا تھا۔
وہ پریشانی سے بولی۔ "دو مسلح پولیس والے اسی طرف آ رہے ہیں۔"
"تمھیں دیکھا؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "شاید نہیں۔"
جتنی دیر گزرے گی، ان گلیوں میں دشمنوں کی نفری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔"
وہ متفکر ہوئی۔ "کیا کریں؟"
میں نے مشورہ دیا۔ "قریبی مکان میں گھس کر تھوڑا انتظار کرتے ہیں، ان کے گزرنے کے بعد آگے بڑھیں گے۔"
مکان کا دروازہ بہ مشکل پانچ فٹ اونچا تھا، لورا با آسانی اندر گھس کر میرے لیے دروازہ کھول سکتی تھی۔
وہ متفق ہوتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ "جلدی کرنا پڑے گی۔"
مگر اس کی تیزی کام نہ آئی کہ ہم پہلے ہی دیر کر چکے تھے۔ پولیس وردی کی جھلک نظر آئی۔ وہ ہماری تلاش میں گھوم

ہے اور یہ ممکن تھا کہ ذیلی گلیوں میں نہ جا سکتے۔ لورا کی شناخت نہایت آسان تھی اس میں چند قدموں کا فاصلہ رکاوٹ
نہ ڈالی تھی۔ میرے ہاتھ نے بجلی کی سی سرعت سے پستول کے دستے پر قبضہ جمایا، انھوں نے بھی لورا کو پہچانتے
ہی کلاشن کوفیں سیدھی کرنے کی کوشش کی، لیکن اس دوران میں ہیمر کو پیچھے کھینچ کر سیفٹی ہٹا چکا تھا۔ پستول پہلے سے کاک
تھا۔ لبلبی دبا کر میں نے دو راؤنڈ فائر کیے، اتنی سرعت سے فائر ہوئی گولیاں کلاشن کوفوں کے فرنٹ ہینڈ گارڈ
سے ٹکرائی تھیں۔ فائر کے جھٹکے سے ان کی کلاشن کوفیں پیچھے گر گئی تھیں۔ ایک گولی اچٹ کر ایک پولیس والے کے بازو سے
ٹکرائی تھی، مگر کلاشن کوف کے فرنٹ ہینڈ گارڈ سے ٹکرانے کی وجہ سے گولی کی طاقت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ وہ خراش ڈالنے
کے علاوہ نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔
ہلکی سی چیخ کے ساتھ مضروب نے اپنا بازو تھام لیا تھا۔
میں دھاڑا۔ "ہاتھ اوپر۔"
زخمی تو اپنے بازو کو ہاتھ سے دبا کر ترحم آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا البتہ دوسرے کے ہاتھ بلند ہو گئے تھے۔
لورا دو قدم بھرتے ہوئے ان کے قریب پہنچی، کلاشن کوفیں اٹھا کر اس نے ایک سلنگ اپ (کندھے سے لٹکانا) کی
اور دوسری پولیس والوں پر تان لی۔
"چلو۔" اس نے بچ جانے والے کی پیٹھ میں نال چبھوئی۔
دونوں تنگ گلی میں آ گئے تھے۔
"مار دوں۔" لورا نے مشورہ چاہا۔ پولیس والوں کو اس کے ہونٹوں پر پھیلا شرارتی تبسم نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور اتنی
انگریزی تو وہ بھی جانتے تھے کہ انھیں قتل ہونے کے مشورے ہو رہے تھے۔
زخمی گڑگڑایا۔ "بھگوان کے لیے مت مارو، ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔"
میں پستول کی نال لہراتا ہوا بولا۔ "وہ تمھارے بچوں کے بڑے ہونے کا انتظار نہیں کر سکتے۔"
وہ ملتجی ہوا۔ "ہم تمھارے بارے کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔"
لورا نے بے صبری ظاہر کی۔ "ریچا وقت ضائع کر رہے ہو۔"
میں نے کہا۔ "مکان کا دروازہ کھولو۔"
وہ سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھی، دروازے پر ہاتھ رکھ کر اچکی اور دروازہ عبور کر گئی۔
اچانک کسی مرد کی کرخت آواز ابھری۔ "کون ہو ادھر۔"
جواباً لورا نے انگریزی میں گٹ مٹ کی، آواز اتنی مدہم تھی کہ میرے کانوں تک مفہوم نہیں پہنچا تھا۔ للکارنے والا
شاید چوکیدار تھا۔ اور چوکیدار عموماً ان پڑھ یا واجبی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ یقیناً اس کے پلے لورا کا جواب نہیں پڑا تھا تبھی
وہ دوبارہ بولا۔
"تم غیر قانونی طور پر گھر میں گھسی ہو، میں تمھیں پولیس کے حوالے ... اف" فقرہ مکمل کرنے سے پہلے
اس کے منہ سے زوردار کراہ خارج ہوئی۔ لحہ بھر بعد دروازہ کھل گیا۔ پولیس والوں کو آگے لگا کر میں اندر گھس
گیا۔ دروازے کے سامنے مختصر سا صحن اور اس سے ملحق گیراج بنا تھا۔ گاڑی موجود نہیں تھی، شاید صاحب خانہ دفتر وغیرہ گیا
تھا۔ چوکیدار گیراج کے سامنے ہی پلاسٹک کی کرسی کے ساتھ لمبا پڑا تھا۔ ایک جدید ساخت کا "ریپیٹر" دیوار کے ساتھ کھڑا
تھا۔ بے چارے کو اپنا ہتھیار استعمال کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔

ہمارے اندر آتے ہی لورا نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"اب کیا کریں؟" لورا نے اگلے اقدام کے بارے میری رائے لی۔

سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں نے پولیس والوں کو حکم دیا۔ "وردیاں اتارو۔"

"ک ک..... کیا..... ؟" وہ ہکلا گئے تھے۔

میں درشتی سے بولا۔ "یقین کرو لاشوں سے وردیاں اتارنا مشکل نہیں مگر خون کے دھبے سے وردیوں کے خراب ہونے کا خدشہ مجھے روکے ہوئے ہے۔" وہ کانپتے ہوئے قمیص کے بٹن کھولنے لگے۔

"جلدی کرو۔" پستول کی نال لہراتے ہوئے میں نے ہدایت دی۔

انھوں نے فوراً سے وردیاں اتار دی تھیں۔

"گھوم جاؤ۔" میں نے انھیں دیوار کی طرف رخ کرنے کا کہا اور ان کے مڑتے ہی لورا کو مخصوص اشارہ کیا۔ لکڑی کے بٹ والی کلاشن کوف کو نال سے پکڑتے ہوئے اس نے باری باری دونوں کے سر بجائے، وہ چوکیدار کے قریب اوندھے منہ نیچے گر گئے تھے۔

انھیں وردیاں اتارتے دیکھ کر لورا میرا منصوبہ جان گئی تھی۔ ان کے بے ہوش ہوتے ہی اس نے بے باکی سے اپنا لباس اتار دیا۔ اسے مختصر لباس میں دیکھنا، نیا یا انوکھا نہیں تھا۔ وہ کئی بار تیراکی کے مختصر لباس میں خوشنما بدن کے نشیب و فراز کا تعارف کرا چکی تھی۔ البتہ کسی عورت کو ایک سے زائد بار مختصر لباس میں دیکھنا، بدنظری کے جائز ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ بے شک اس کی تہذیب و ثقافت اسے شرم و حیا نہیں سکھا سکی تھی، لیکن میرا مذہب و معاشرت میرے لیے ایک دائرہ کار و حدود مقرر کرتا ہے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ کرنے والے بدن سے نظریں چرا کر میں پولیس وردی اٹھانے لگا۔ اس نے میرے لیے زخمی شخص والی وردی چھوڑی تھی۔ اس کے بازو پر خون لگا تھا۔ گیراج کی دیوار کی آڑ لے کر میں نے جلدی سے لباس اتار کر وردی پہنی۔ پولیس والے کا قد مجھ سے بڑا تھا، بھی پتلون ذرا لمبی تھی۔ پائینچے اندر کی طرف موڑ کر میں نے پولیس والے کے جوتے اتار کر پہن لیے تھے۔

لورا بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس کا قد تقریباً میرے برابر ہی تھا۔ ایک آدھ انچ کا فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرا قد پانچ فٹ نو انچ ہے۔ اور مردوں میں یہ درمیانی قامت سمجھی جاتی ہے، لیکن عورتوں کے لحاظ سے یہ لمبا قد سمجھا جاتا ہے۔ اسے پولیس والے کی وردی فٹ آئی تھی۔ جوتے البتہ اس نے اپنے ہی پہنے رکھے کیوں کہ عورتوں کے پاؤں مردوں سے کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔

پولیس والوں اور چوکیدار کی مشکیں کس کر ہم نے اصل عمارت اور بغلی دیوار کے درمیانی خلا میں لٹا دیا۔ ان کے منہ باندھنے بھی ہمیں نہیں بھولے تھے۔ وہاں وہ آسانی سے نظر نہیں آ سکتے تھے۔ گھر کے مکین آرام سے سوئے تھے۔ بند کمرے اور اے سی کی ٹھنڈک نے انھیں اپنے چوکیدار کی حالت سے بے خبر رکھا تھا۔ یوں بھی گیراج میں گاڑی کی غیر موجودی ظاہر کر رہی تھی کہ گھر کا مالک موجود نہیں تھا۔ خاتون خانہ اور زیادہ سے زیادہ معصوم بچوں کی موجودی کا احتمال ما۔ وہاں چھپنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کلاشن کوفیں اٹھا کر ہم محتاط انداز میں گھر سے باہر نکل آئے۔

ساری کارروائی میں چند منٹ ضائع ہو گئے تھے۔ ایک عام آدمی اور تربیت یافتہ سپاہی میں یہی بنیادی فرق ہوتا ے۔ ایسے حالات میں عام آدمی حوصلہ چھوڑ کر رونے دھونے بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی مضبوط اعصاب کا ہو تو فرار کی کوشش تو تا ہے، مگر اسے دشمنوں سے بچنے، جان بچانے اور اپنی حفاظت کے طریقہ کار سے واقفیت نہیں ہوتی۔ وہ بروقت فیصلہ ں کر پاتا۔ جبکہ تربیت یافتہ سپاہی ہمت و حوصلے سے کام لیتا ہے۔ اسے اپنی حرکات و سکنات پر قابو ہوتا ہے۔ گو دشمنوں

سے بچنے اور نبرد آزما ہونے کے لیے بندھے اصول تو نہیں ہیں کہ ہر کسی کو ایک سے حالات پیش آئیں۔ دوران تربیت ہمیں بھی مختلف حالات سے روشناس کرایا گیا تھا۔ بے شک عملی زندگی میں تربیت میں سیکھے ہوئے مسائل سے واسطہ نہ پڑے مگر ہماری اصولوں کو جاننے کے بعد نت نئے مسائل سے نبٹنا ناممکن نہیں رہتا۔

غربی جانب تھوڑے فاصلے پر فائرنگ کی تیز آواز ابھری۔ شاید کوئی بے چارہ ہماری تلاش میں سرگرداں ٹولی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کوئی اور گروہ آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ یہ موقع بھاگنے کے لیے نہایت غنیمت تھا۔ اس سے پہلے میں نے پستول سے دو گولیاں فائر کی تھیں، پستول اتنی زیادہ آواز پیدا نہیں کرتا کہ آواز زیادہ دور تک جائے۔ یقیناً اسی وجہ سے کوئی سن گن لینے وہاں نہیں پہنچا تھا۔ مگر اب کلاشن کوفیں گرجی تھیں۔ اور پانچ چھ چھپٹے (برسٹ) اکٹھے فائر ہوئے تھے، ناممکن تھا ہماری تلاش میں سرگرداں ٹولیاں اس جانب کا رخ نہ کرتیں۔ لورا نے اپنی زلفوں کو لپیٹ کر ٹوپی کے اندر قید کر دیا تھا یوں وہ دور سے مرد ہی نظر آنے لگی تھی۔ ہم نے جانے کی سمت میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ چوڑی گلی میں نکلتے ہی بائیں جانب سے ہیوی بائیک کی مخصوص آواز ابھری۔

وہ جوش سے چلائی۔ ''ریچا!.... اسے روکو۔'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر سر سے ٹوپی اتار کر سنہری بال لہراتے ہوئے گلی کے درمیان میں ہو گئی۔ موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ ان کا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی اتنی قیمتی موٹر سائیکل خریدنا عام لوگوں کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ ایسے بگڑے رئیس زادے کبھی پولیس کے اشارے پر نہ رکتے، مگر روکنے والی کی صورت ایسی نہیں تھی کہ کسی جوان لڑکے کا بریک پر دھرا پنجہ نیچے کو نہ رہتا۔

موٹر سائیکل چلانے والا ہیلمٹ اتارتا ہوا عاشقانہ لہجے میں بولا۔ ''ہائے، ایسی کڑک پولیس والی پہلی بار نظر آئی ہے۔''

لورا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی۔ وہ انھیں روکنے کا سبب بتانے لگی۔ ''جانتے نہیں اس موٹر سائیکل پر ڈبل سواری منع ہے۔''

موٹر سائیکل چلانے والا اوباشانہ انداز میں بولا۔ ''بے بی تم ہمارے درمیان بیٹھ جاؤ، تین افراد پر تو پابندی نہیں ہے نا۔ اور بے فکر رہو تمھیں ایسی عیش کرائیں گے کہ کبھی نہیں کی ہوگی۔'' اس نے انگریزی ہی سہارا لیا تھا۔ یوں بھی انگریزی اس طبقے کے لوگوں کی پسندیدہ زبان ہوتی ہے۔

''اچھا مشورہ ہے۔'' لورا قریب ہوئی، اس کا دایاں مکا بجلی کی سی سرعت سے موٹر سائیکل چلانے والے کی کنپٹی سے ٹکرایا، اس نے جھولتے ہوئے ہنڈل پر سر ٹیک دیا تھا۔

''تت.....تم جانتے نہیں ہم کون ہیں۔'' ساتھی کو اتنا غفیل ہوتے دیکھ کر دوسرے نے گھبرائے ہوئے انداز میں دھمکی دی۔ بدحواسی میں اسے انگریزی بولنا بھول گیا تھا۔ لورا کا دوسرا مکا اس کی گردن پر لگا تھا۔ اپنے ساتھی کو تو اس نے سہارا دیا تھا۔ لیکن اسے روک میسر نہ ہوئی۔ وہ گلی کے پختہ فرش پر جا گرا تھا۔ گود میں رکھا ہیلمٹ بھی نیچے گر کر لڑھکتا ہوا گلی کے وسط میں پہنچ گیا۔

دوسرے کو بھی نیچے دھکیل کر لورا نے ڈرائیونگ سنبھال لی۔

میرا ایسی موٹر سائیکل کی سواری کا پہلا موقع تھا۔ لیکن لورا کا جوش دیکھ کر ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نہ صرف اچھی طرح موٹر سائیکل چلا سکتی ہے بلکہ وہ اس کی پسندیدہ سواری بھی ہے۔ اس نے ہیلمٹ پہن کر شیشہ اٹھایا۔

''بیٹھو۔'' ہینڈل پکڑتے ہی اس نے خالی ریس دی۔ انجن کی مخصوص آواز نے اس کے ہونٹوں پر خوب صورت تبسم

پار کرنے سے پہلے ہم دور ہو چکے تھے۔ سہ پہر ہو گئی تھی اور گلیوں میں لوگوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ عام لوگوں کو بچانے کو وہ
ادھادھند فائر نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ افراد، رکشوں اور ریڑھیوں سے موٹر سائیکل کو
بچاتے ہوئے لورا کمال مہارت سے آگے بڑھتی رہی۔ اسے سڑک کی تلاش تھی۔ اور اس بار ہمیں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ گلی کا
اختتام سڑک پر ہوا تھا۔
سڑک پر آتے ہی لورا نے رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی تھی۔ ہمارے عقب میں دو تین کاریں بھی نمودار ہوئیں، مگر
سڑک پر دوڑتی ہیوی موٹر سائیکل کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ لورا موٹر سائیکل کو لہراتے ہوئے گاڑیوں کے درمیانی خلا سے یوں
گزر رہی تھی جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ اور مجھے ہر لمحے یہی لگ رہا تھا کہ وہ موٹر سائیکل کسی گاڑی میں ٹھوک دے
گی۔ عام موٹر سائیکل کے پچھلے سوار کو ڈر لگا رہتا ہے، وہ تو ہیوی بائیک تھی۔ مگر میرے اعصاب مضبوط تھے تبھی برداشت
کیے بیٹھا رہا۔ بلاشبہ میں اس مہارت سے کبھی موٹر سائیکل نہ چلا پاتا۔ بلکہ اس موٹر سائیکل کو تو شاید چلا ہی نہ پاتا۔
''چند کلومیٹر سے زیادہ سڑک پر نہیں چلی تھی، کیوں کہ سڑک پر ہمیں گھیرنا زیادہ آسان ہو جاتا۔ رفتار کم کرتے ہوئے
اس نے ایک گلی میں موٹر سائیکل موڑ دی۔ ہر طرف چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ لورا نے رفتار دھیمی کر لی تھی، مگر اب لباس
مسئلہ پیدا کر رہا تھا۔ پولیس کی وردی لوگوں کو زیادہ متوجہ کرتی ہے۔
میں نے کہا۔ ''ہمیں کپڑے تبدیل کرنا ہوں گے۔''
اس نے تیار شدہ (ریڈی میڈ) کپڑوں کی دکان کے سامنے بریک دباتے ہوئے کہا۔ ''چلو۔''
موٹر سائیکل کھڑی کر کے ہم اندر گھس گئے۔ آج میڈیا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اور مجھے ڈر تھا کہ شاید ہمارے بارے خبر
چل رہی ہو۔ دکان میں ٹی وی کو نہ پا کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ ہم نے دیر کیے بغیر اپنے لیے ایک ایک لباس کا انتخاب
کیا اور ''ٹرائی روم'' میں گھس گئے۔ دونوں نے جینز کی پتلون اور نصف بازو کی بنیان منتخب کی تھی۔ وردیاں ہم نے ٹرائی روم
ہی میں چھوڑ دی تھیں۔ میرے پاس گوتم لوگوں کی جیب سے نکالی ہوئی نقدی موجود تھی۔ اس لیے میں نے دکان دار کا
نقصان نہ ہونے دیا۔

''اب کہاں جائیں گے؟'' دکان سے نکلتے ہوئے لورا مستفسر ہوئی۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''میری جسمانی حالت علاج و آرام کی متقاضی ہے۔''

وہ شوخی سے ہنسی۔ ''میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں کہ کچھ کر سکوں۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ''جو تمھارے بس میں ہے اسی کا اقرار کر لو کافی ہے۔''

''بکواس کرنا کوئی ریجا سے سیکھے۔'' منہ بناتے ہوئے اس نے چابی میری طرف بڑھائی۔ ''ڈرائیونگ کرو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ موٹر سائیکل کبھی نہیں چلائی۔''

مجھے تیکھی نظروں سے گھورتے ہوئے وہ شکی لہجے میں بولی۔ ''جھوٹ نہ بولو۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیسے یقین آئے گا۔''

''رہنے دو۔'' وہ تلملاتے ہوئے موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اپنی جگہ سنبھالی۔ اگنیشن میں چابی گھما کر اس
نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گئی۔

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ ''بتایا نہیں کدھر جانا ہے۔''

''ممبئی، ہمارے لیے ایک جیسا انجان ہے۔''

''کوئی مشورہ تو دے سکتے ہونا۔''

[illegible] خطرے سے خالی نہ ہوگا، کوئی مکان ہی ڈھونڈنا پڑے گا۔"

[illegible] پولیس کا مسئلہ بھی تو ہے گا۔"

[illegible] نے ظاہر کیا۔ "موٹر سائیکل بیچنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔"

مجھے حل پیش کیا۔ "موٹر سائیکل چوری کی ہے۔"

وہ گھبراہٹ سے بولی۔ "موٹر سائیکل چوری کی ہے۔"

میں ہنسا۔ "یہاں چوری کا مال خریدنے والوں کی کمی نہیں ہے۔"

وہ متفق ہوئی۔ "تو رہنمائی کرو، یوں بھی موٹر سائیکل کو مزید ساتھ رکھنا مناسب نہ ہوگا۔"

میں نے اسے ایک رکشے والے کے قریب رکنے کو کہا، جو رکشا گلی کی ایک جانب روکے سواری کا منتظر تھا۔ ملحقہ تھا، میں چار رکشے کھڑے تھے۔

ہمارے رکنے پر وہ متوجہ ہوا۔ میں نے ہیلمٹ کا شیشہ اٹھا کر کہا۔ "مہاراج! کسی اچھی موٹر سائیکل ورکشاپ کی رہنمائی کر دیں۔"

وہ لورا پر گہری نگاہ ڈال کر میری طرف متوجہ ہوا۔ "وہ بے گھر جانا پڑے گا۔"

اس کے انداز سے لگا وہ گھر تھوڑی دور ہے۔ میں نے پوچھا۔ "نزدیک میں کوئی ورکشاپ نہیں ہے؟"

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "تم نے اچھی ورکشاپ کا پوچھا ہے۔ ورنہ سو قدم آگے بھولے استاد کی ورکشاپ ہے، البتہ اس کی ایمان داری کی ضمانت نہیں دے سکتا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرانی ظاہر کی۔

اس نے منکشف کیا۔ "تمھیں پتا بھی نہیں چلے گا اور نئی موٹر سائیکل سے اصل پرزہ نکال کر دوسرا جوڑ دے گا۔"

ہمیں بھی ایسے ہی استاد کی تلاش تھی۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے لورا کو چلنے کا کہا۔ اس نے [illegible] ہیلمٹ اتارنے کی غلطی نہیں کی تھی، کیوں کہ اپنی رنگت و شباہت کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچان لی جاتی۔ البتہ ہیلمٹ اس کے صنف نازک ہونے کو نہیں چھپا سکتا تھا۔ نصف بازوؤں کی چست بنیان فراخ دلی سے دعوت نظارہ دے رہی تھی۔ تبھی رکشے والا مخاطب مجھ سے اور متوجہ اس کی جانب رہا۔ البتہ انڈیا میں عورتوں کا موٹر سائیکل چلانا اتنا انوکھا بھی نہیں کہ خصوصی توجہ کا حامل بن سکے۔ آج کل تو پاکستان میں بھی خواتین موٹر سائیکل کی سواری کرتی نظر آ جاتی ہیں۔ اگر ستر پوشی و پردے کا اہتمام کیا جائے تو اس پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ کیوں کہ ماضی بعید میں مسلمان خواتین بڑے شوق سے گھڑ سواری کیا کرتی تھیں۔ موٹر سائیکل اور گھڑ سواری میں خاصی مشابہت ہے۔ البتہ کھلا لباس اور بے پردگی کی چھوٹ شریعت نہیں دیتی۔ اور نقاب میں موٹر سائیکل چلانا چنداں دشوار نہیں ہے، کہ نقاب ڈرائیونگ پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ ہیلمٹ بہ ذات خود بہترین نقاب ہے۔

ورکشاپ ایک بغلی گلی میں تھی جو بھولے استاد کی دکان پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ وہاں سے آگے جانے کا رستہ نہیں تھا۔ ایک پرانی موٹر سائیکل سے چھیڑ چھاڑ کرنے والے لڑکے سے رہنمائی لے کر ہم بھولے استاد کی جانب گئے۔ تیل سے چیکٹ شلوار قمیص میں ملبوس وہ ادھیڑ عمر کا صحت مند شخص تھا۔ آنکھوں میں سفاکی و مکاری کی چمک اس کے کرتوتوں کی مظہر تھی۔

اس نے بھی لورا پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے آنا ہوا باؤ؟"

میں سید ھا مدعے پر آیا۔ "موٹر سائیکل بیچنا ہے۔"

وہ رکھائی سے بولا۔ "یہ ورکشاپ ہے بار گین نہیں ہے۔"

میں لجاجت سے بولا ''موٹرسائیکل چوری کی ہے، کسی نے آپ کا پتا بتایا تو یہاں آگئے۔ نہیں خریدو گے تو چلے جائیں گے۔''

وہ متعجب ہوا۔ ''ہوش میں ہو۔''

میں اکتاہٹ سے بولا۔ ''بھولے استاد اتنے بھولے نہ بنو۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

وہ نظریں چراتے ہوئے مشکوک لہجے میں بولا۔ ''تمھیں شاید کسی نے غلط پتا بتا دیا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''درست، ہمارا تعلق خفیہ پولیس وغیرہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ہم خود پولیس سے چھپتے پھر رہے ہیں۔''

اس نے چھاتی پھلائی۔ ''بھولے استاد کو ڈرانے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔''

اسی وقت لورا نے اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے لوچ دار آواز میں کہا۔ ''باؤلا اسٹاڈ، وٹس پرابلم۔'' (بھولے استاد کیا مسئلہ ہے) یقیناً ہماری تکرار کی اسے سمجھ نہیں آئی تھی، البتہ اتنا اندازہ اسے ضرور ہو گیا تھا کہ بھولا اڑی کر رہا تھا۔

لورا براؤن کی صورت اور بدیسی لہجے میں بھولا استاد کہنا اسے لٹو کر گیا تھا۔ وہ ریشہ خطمی ہوتے ہوئے بولا۔

''حکم کرو میڈم۔''

وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ''کیا بک رہا ہے؟''

''تمھاری ترجمانی کرنے کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے سودا کرنے دو۔'' اسے خاموش ہونے کا کہتے ہوئے میں بھولے کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مادام کہہ رہی ہے مجھے کس ڈرپوک کے پاس لے آئے ہو۔''

وہ کڑے لہجے میں بولا۔ ''جوان، بھولے کو دھوکا دینے والا دوسرا سانس لینے کا حق دار نہیں ہوتا۔''

''بھولے استاد، عقل کو ہاتھ مارو، میں صاف گوئی سے بتا چکا ہوں کہ موٹرسائیکل چوری کی ہے۔ اس کے علاوہ کون سی دھوکا دہی ڈھونڈ رہے ہو۔''

اس نے اندیشہ واضح کیا۔ ''اگر تمھارا تعلق کسی ایجنسی یا خفیہ پولیس سے ہوا تو بھولا تمھیں نرگ میں بھیج کر ہی گرفتاری دے گا۔''

میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ ''بے فکر رہو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

اس نے موٹرسائیکل اسٹارٹ کر کے ریس گھمائی، انجن وغیرہ کا جائزہ لیا، چند اور پرزوں کو چھیڑ کر بولی لگائی۔ ''پچاس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

مجھے موٹرسائیکل کی قیمت کا سرسری اندازہ تھا تبھی برہمی ظاہر کی۔ ''سولہ، سترہ لاکھ کی موٹرسائیکل کو پچاس ہزار میں بیچنے کے بجائے آگ لگانا زیادہ بہتر رہے گا۔''

''باؤ یہ چوری کی ہے۔''

''تو چوری کا مال نصف یا تہائی میں خریدو استاد۔ اس کے پچاس ہزار تو تول کر خریدنے والا کباڑی بھی دے دے گا۔''

''زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ۔'' اس نے بہ ظاہر آخری دام بتائے۔

لورا مستفسر ہوئی۔ ''کتنے دے رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ایک لاکھ۔''

''اسٹاڈ باؤلا ڈیل ڈن۔'' لورا نے بھولے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دو لاکھ میں سودا مکمل کر دیا۔ (یعنی

بھولے کی بتائی ہوئی قیمت کے دگنے میں سودا طے ہوگیا)
بھولے کوئی اعتراض تھا بھی سہی تو لورا سے ہاتھ ملانے کی سعادت نے باقی نہ رہنے دیا تھا۔
لورا کا نازک ہاتھ، بھدے ہاتھ میں تھامتے ہوئے اس نے دانت نکوسے۔ ”ٹھیک ہے مادام۔“
لورا کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھیں، میں شوخی سے بولا۔ ”غلام قوم کا باشندہ، حکمراں قوم سے تکرار تو نہیں کرسکتا۔“
”چھوٹے بھاگ کر ٹھنڈی بوتل پکڑلا۔“ بھولا شاگرد کو حکم دے کر ہماری طرف متوجہ ہوا۔ ”آئیں بیٹھیں۔“
”استاد بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔ ہماری رقم لائیں اور اپنی چیز سنبھالیں۔“
سر ہلاتے ہوئے اس نے لورا کو میٹھی نظروں سے گھورا اور ورکشاپ کے اندر گھس گیا۔ اس کی واپسی دو ہزار والے نوٹوں کی گڈی کے ساتھ ہوئی تھی۔ (انڈیا میں، دس، بیس، پچاس، سو، دوسو، پانچ سو اور دو ہزار کے نوٹ مستعمل ہیں)
پیسے لے کر میں نے گنے بغیر جیب میں ڈالے اور ہم بھولے استاد سے الوداعی مصافحہ کر کے چل پڑے۔
لورا نے خجالت ظاہر کی۔ ”شاید ہمیں ان بے چاروں کی موٹر سائیکل نہیں بیچنا چاہیے تھی۔“
میں نے ڈھارس بندھائی۔ ”ان بے چاروں نے تمھارے بارے جو تبصرہ کیا تھا وہ بھول گیا ہے۔ ایسے اوباشوں کو سبق سکھانا ضروری ہوتا ہے۔ باقی ہمیں پیسوں کی ضرورت تھی، موٹر سائیکل کو لاوارث چھوڑ دیتے تو کسی اچکے کے ہاتھ لگ جاتی۔ اور وہ لڑکے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، یہ ان کے لیے بڑا نقصان نہیں ہوگا۔“
اس نے موضوع تبدیل کیا۔ ”اب شب بسری کا سوچو۔“
شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ”پہلے پیٹ بھرتے ہیں، بھاگ دوڑ و اچھل کود میں سب کھایا پیا ہضم ہو چکا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ایک خالی رکشے کو اشارہ کیا۔ اندر گھستے ہی میں نے کسی درمیانہ درجے کے معیاری ہوٹل پر جانے کا کہا۔
آدھے گھنٹے بعد اس نے ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ ہم نسبتاً تاریک گوشے کی طرف بڑھ گئے۔ میری نظریں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں۔ اندازہ تھا کہ ہمارا ذکر خبروں میں ضرور ہوگا۔
بیرا قریب آیا۔ لورا سے ان کی پسند پوچھ کر میں نے مچھلی کے بنے دو پکوان بتائے اور ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرا نصف اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ میرا تعارف بہ طور دہشت گرد کرایا گیا تھا۔ تصویر بھی دکھائی جارہی تھی۔ البتہ لورا براؤن کا ذکر تھا نہ میرا پاکستانی ہونا ظاہر کیا گیا تھا۔
میں نے کہا۔ ”خبروں میں تمھارا کوئی ذکر نہیں ہے۔“
وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ”میرا ذکر کرنے پر برطانوی حکومت متوجہ ہو جائے گی اور انھیں جواب دہی مشکل ہو گی۔“
میں نے مشورہ دیا ”تمھیں برطانوی سفارت خانے جانا چاہیے۔“
”میرے خلاف ان کے پاس مضبوط ثبوت موجود ہیں۔ ایسی صورت میں سفارت خانہ زیادہ سے زیادہ مجھے برطانیہ واپس بھجوا سکتا ہے۔“
میں منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”کسی ایک نقطہ نظر پر تو قائم رہو۔“
وہ متبسم ہوئی۔ ”تمھاری سمجھ ہی میں کچھ نہیں آرہا۔“
میں معترض ہوا۔ ”متضاد باتیں کرو گی تو کیسے سمجھ پاؤں گا۔“
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مسٹر ایس ایس، اگر میڈیا میرا ذکر اچھالے گا تو برطانوی حکومت اپنے شہری کے

''بڑی دیر بعد علاج کا خیال آیا ہے۔''
میں فلسفیانہ انداز میں بولا۔ دیر آید درست آید۔''
کلینک پر کافی مریض موجود تھے۔ اگر نمبر کا انتظار کرتے تو دو تین گھنٹے ضائع ہو جاتے تھے۔ استقبالیہ کو لورا کو کھلا کار ہونے کا جھانسا دے کر ہم اندر گھس گئے۔ اس ضمن میں جھوٹ سے زیادہ لورا براؤن کا غیر ملکی ہونا کام آیا تھا۔ ڈاکٹر چند منٹ پہلے ہی آیا تھا اور اب تک اس نے مریضوں کو دیکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے کنڈی کر دیا تھا۔
ڈاکٹر نے حیرت و برہمی سے ہمیں گھورا۔ ''تم بغیر اجازت اندر کیسے آئے؟''
میں نے پستول برآمد کرتے ہوئے میز پر رکھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اپنی توانائی و درشتی ضائع نہ کرو۔''
وہ ہکلایا۔ ''تت... تم... کیا چاہتے ہو؟'' پستول کی شکل نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔
میں اطمینان سے بولا۔ ''صرف اپنا بھلا، تمھارا ذرا سا بھی نقصان نہیں ہوگا۔'' اور قمیص اتارنے لگا۔
میرے زخموں کو دیکھ کر ڈاکٹر ششدر رہ گیا تھا۔ ''تشدد کا شکار ہوئے ہو۔'' اس کے خوف پر مسیحائی غالب آگئی وہ میرے زخموں کا جائزہ لینے لگا۔
''ہاں ڈاکٹر صاحب! چند درندوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ نرگ واسی (جہنمی) تین چار دن مسلسل زدوکوب کرتے رہے ہیں۔''
اس نے اچھی طرح معائنہ کر کے لمبا سا نسخہ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ ''لگانے کے مرہم اور کھانے کی دوائیاں لکھ دی ہیں۔ میڈیکل اسٹور والا کھانے کا طریقہ کار سمجھا دے گا۔ باقی دو تین دن چارپائی سنبھالو ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔'' اس کے ان شاء اللہ سے پتا چلا اپنا مسلمان بھائی ہے۔
''شکریہ ڈاکٹر صاحب!'' نسخہ پکڑ کر میں نے قمیص ڈالی اور دو ہزار کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اپنے رویے پر معذرت خواہ ہوں، یہ آپ کی فیس ہے۔''
اس کے لبوں پر پیشہ ورانہ تبسم ابھرا۔ ''کوئی بات نہیں۔ اور فیس استقبالیہ پر جمع کرا دیں۔''
ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کر کے ہم باہر نکل آئے۔ استقبالیہ پر فیس کے پانچ سو جمع کرا کے ہم نے میڈیکل اسٹور سے دوائیں لیں اور کلینک سے نکل آئے۔ دروازے کے قریب ہی چند ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہم ایک میں بیٹھ گئے۔
ڈرائیور نے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے باؤ۔''
رکشا ڈرائیور کے ساتھ جن مکانات کا جائزہ لیا تھا ان میں ایک عمارت مجھے اچھی لگی تھی۔ میں نے اس کے قریب واقع ایک مشہور مقام کا نام بتا دیا۔
بیس منٹ بعد ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں مطلوبہ جگہ اتار دیا تھا۔ ڈرائیور کو فارغ کر کے ہم آگے بڑھ گئے۔ بازار کھلا تھا۔ ایک دکان سے چند ضرورت کی چیزیں اور دو تین فالتو لباس خرید لیے۔ لورا کے لیے میں نے مشرقی لباس بھی خریدا تھا تاکہ کہیں جاتے ہوئے اس کی شناخت چھپا سکوں۔ بازار سے نکل کر ہم مطلوبہ مکان کی طرف بڑھ گئے۔
رکشا ڈرائیور کے ساتھ میں نے اسی لیے مختلف مکانوں کا جائزہ لیا تھا تاکہ اپنی پسند کی جگہ تلاش کر سکوں۔ اور بطور احتیاط رکشا ڈرائیور کے سامنے ان مکانوں کو مسترد بھی کر دیا تاکہ پولیس یا کسی ایجنسی کے بندے کی ہم تک رہنمائی نہ کر سکے۔

دشمن ملک میں ایک جاسوس کو شناخت چھپانے اور پوشیدہ ہونے کو کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ درجنوں احتیاطیں برتنا پڑتی ہیں۔ آنکھیں چار نہیں، آٹھ رکھنا پڑتی ہیں۔ کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کیا جاتا، کسی انجان کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ جیسے زخمی شیر کا تعاقب کرنے والا شکاری پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے، یونہی ایک جاسوس کو ہر قدم اٹھانے سے پہلے ہزاروں امکانات کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ بہ قول میرے ''عاشق و جاسوس میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں کو کم ہی سمجھا گیا ہے۔''

گو میں پختہ جاسوس نہیں ہوں اور نہ میری تربیت اس نہج پر ہوئی تھی۔ ایک سنائپر اور جاسوس کے مقاصد اور ذمہ داریوں میں نمایاں فرق ہوتا ہے، مگر ایک سنائپر کی تربیت میں جاسوسی کے طریقہ کار کو زیر بحث ضرور لایا جاتا ہے۔ گو جاسوسوں کو سنائپر بننے کی نہ ضرورت پڑتی ہے اور نہ اس متعلق کچھ سکھایا جاتا ہے مگر سنائپر کا ہر فن مولا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اچھا نشانہ باز ہوتا ہے بلکہ، جاسوس، جنگجو، کمانڈو اور اچھا لڑاکا بھی ہوتا ہے۔ اسے صرف جنگلوں، پہاڑوں اور صحراؤں کی خاک چھاننا نہیں ہوتی بلکہ شہروں اور حساس مقامات سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ آبادی میں زندگی بچانے کے اصول دشت و بن سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ مجھے پہلے بھی چند بار جاسوس بننے کا موقع مل چکا تھا۔ اس لیے تربیت سے زیادہ میرا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔

وہ عمارت کافی کشادہ تھی۔ دروازے پر چوکیدار موجود نہیں تھا۔ گھنٹی کے جواب میں ایک خرانٹ بڑھیا نے دروازہ کھولا۔ ہمارا [illegible] نظر جانچ کر داخل ہونے کی اجازت ملی۔ وہ بیوہ تھی اور دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بیٹیوں ہی کی وجہ سے وہاں کسی چھڑے کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ لورا کو میری بیوی سمجھی تھی۔ میں نے بھی اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہ کی۔ ہدایتوں، نصیحتوں اور مختلف احکامات سے بھرا بھاشن دے کر اس نے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ وصول کیا اور ہمیں ایک کمرہ مل گیا، جس میں ملحقہ بیت الخلاء (اٹیچ باتھ) کی سہولت موجود تھی۔ کھانے پینے کے اخراجات علیحدہ تھے۔ ہمارے علاوہ وہاں تین اور کرایہ دار بلکہ کنبے بھی موجود تھے۔

رات گہری ہو گئی تھی، جسم تھکن سے چور تھا۔ ناگفتہ بہ حالت کے ساتھ دن بھر کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی نے نڈھال کر دیا تھا۔ ایک سنائپر کی سخت جانی اور برداشت ہی تھی جو میں اب بھی قدموں پر چل رہا تھا۔ اگر جسمانی لحاظ سے تندرست ہوتا تو یہ بھاگ دوڑ مذاق سے بڑھ کر نہ لگتی۔

جلادوں نے سامنے سے زیادہ میری پشت کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا تبھی مرہم لگوانے کو مجھے لورا کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ وہ خوش دلی سے تیار ہو گئی۔ میری پیٹھ پر مرہم ملتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔

''خرانٹ بڑھیا نے کافی لمبی تفتیش کی ہے۔''

میں مسکراتے ہوئے اسے بڑھیا کے اندیشے بتانے لگا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ ہمیں میاں بیوی سمجھ رہی ہے۔

''ریچا، سدھر جاؤ۔'' وہ میری پیٹھ پر مکا رسید کرتے ہوئے برہم ہوئی۔

''اف'' میری کراہ نکل گئی تھی۔ ''عقل کی دشمن، میں نے بڑھیا کی سمجھ بتائی ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تمھاری نیت کو اچھی طرح جانتی ہوں۔''

میں خاموش ہو رہا کہ فضول موضوع پر بحث کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ اور نہ کسی آزاد خیال مغربی عورت کو سمجھانا ممکن تھا۔

مرہم سے کافی فرق پڑا تھا۔ رہی سہی کسر درد کش گولیوں اور طاقت کے شربت نے پوری کر دی تھی۔ میزبان خاتون سے دودھ کا گلاس بھی مل گیا تھا۔ وہاں دو سنگل بیڈ ملا کر انھیں ڈبل بیڈ کی شکل دی گئی تھی۔ میں نے ایک جانب لیٹ کر آنکھیں

بند کرلیں۔ پورا بے تکلفی سے دوسرے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا بیڈ دور کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گرلی...
شاید سکون آور دوا بھی شامل تھی تبھی، نیند کی آمد میں دیر نہیں ہوئی تھی۔

منظر ایک باغ کا تھا جہاں میں پلوشہ کے زانو پر سر ٹیکے موہنے چہرے کو تک رہا تھا۔ اس کا ریشمی لمس مجھے ...
سے بے گانہ کر رہا تھا۔ ہلکی نیلی آنکھوں میں چاہت کے دیپ جلائے وہ بھی میری طرف متوجہ تھی۔ آسمان پر گھر...
چھائے تھے۔ ہلکی ہوا سکون آور مشروب کی طرح حواس چھیننے پر تلی تھی۔

اس نے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ تھاما۔ ''راجو مجھے کتنا چاہتے ہو؟''

میں چاہت سے بولا۔ ''بہت زیادہ۔''

وہ مصر ہوئی۔ ''پھر بھی کتنا، کوئی حد شمار تو ہوگا ناں۔ ہر شیئے کی پیمائش کی کوئی نہ کوئی اکائی مقرر ہوتی ہے تو آپ...
چاہت کی بھی ہونا چاہیے۔''

''محبت وزن نہیں کہ تولی جائے، فاصلہ نہیں کہ ناپی جائے، گنتی نہیں کہ شمار کی جائے۔ یہ تو ایک جذبہ ہے...
احساسات کے مرہون منت ہوتا اور احساس و جذبات کو ناپنے کا کوئی آلہ نہیں بنا۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''یہ تو کہہ سکتے ہیں ناں جتنے آسمان پر تارے ہیں، سمندر میں قطرے ہیں، صحرا میں...
ذرے ہیں، دنیا بھر کے درختوں کے پتے ہیں، جتنا آسمان سے زمین تک فاصلہ ہے اتنی محبت کرتے ہیں۔''

''آسمان کے تارے، سمندر کے قطرے، صحرا کے ذرے، درختوں کے پتے جتنی تعداد میں بھی ہوں انگ...
نہیں کہہ سکتے۔ جبکہ میری محبت کا شمار یا پیمائش ممکن نہیں ہے۔''

وہ لاڈ سے بولی۔ ''نہیں ناں مجھے حد جاننا ہے۔''

میں ہنسا۔ ''جتنا مجھے تم چاہتی ہو، اس سے تھوڑی زیادہ کرتا ہوں۔''

''کھائیے قسم۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔

میں خلوصِ دل سے بولا۔ ''مجھے جہانوں کے پروردگار کی قسم ایسا ہی ہے۔''

خوشی و مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا تھا۔ آنکھوں میں امڈتی بے پناہ چاہت اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی
تھی۔ ''اب آپ کو کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔''

''کہیں جانے کو کس بے وقوف کا دل چاہتا ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''میرے راجو کا۔''

میں نے آنکھیں نکالیں۔ ''پلوشے بدتمیزی کی تو مار کھاؤ گی۔''

اس نے مجھے چڑاتے ہوئے للکارا۔ ''دھمکیاں دیتے رہیے، کبھی ہاتھ اٹھانے کی زحمت نہ کرنا۔''

''تمھاری پٹائی کو پھول کی پتیوں سے بنی چھڑی ڈھونڈ رہا ہوں، جس دن مل گئی خوب تواضع کروں گا۔''

محبوبیت کا گہرا احساس لیے اس نے وارفتگی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''اتنا نازک سمجھ رکھا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس سے بھی زیادہ۔''

وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔ ''اچھا کتنا۔''

ایک شاعر اپنی محبوبہ کو کہتا ہے ناں

اس کو باہر چھوڑ کے آؤ شہزادی

جگنو سے نہ ہاتھ جلاؤ شہزادی

تھل کے میں کان یقینا کھینچوں گا
پہلے پوری بات بتاؤ شہزادی
بارش کی بوندوں میں پھرنا ٹھیک نہیں
لگ جائے نہ کوئی گھاؤ شہزادی

پلوشہ کے موہنے رخ پر حیا آلود تبسم نمودار ہوا۔اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔
''راجا بارش ہونے کو ہے۔''ایک دم ہلکی پھوار شروع ہوگئی تھی۔
منظر معدوم ہوا، میں میری سماعتوں میں لورا کی آواز گونجی۔''ریچا اب اٹھ بھی جاؤ۔''زلفیں جھٹک کر اس نے
میرے چہرے پر پانی کی پھوار پھینکی تھی۔وہ نہا کر ایک دم تازہ و کھلی کھلی لگ رہی تھی۔شکلا کی درندگی کے نشانات اس کے
چہرے پر سے معدوم ہوگئے تھے۔
میں انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔پلوشہ کی موہنی صورت کے خوش کن نظارے نے لورا کی اہمیت صفر کر دی تھی۔
''اب طبیعت کیسی ہے؟''وہ بالوں پر تولیہ رگڑتے ہوئے مستفسر ہوئی۔
''الحمد اللہ بہتر ہے۔''
وہ الحمد اللہ کی وضاحت چاہنے لگی۔''آدھی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''
میں نے کہا۔''مسلمان ہر کام کا ہونا اللہ پاک کی منشا کے تابع سمجھتے ہیں۔''
اس نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی۔''تو گزشتہ چند دن تمھیں جو پھینٹی لگی،اس میں تمھارے اللہ (پاک) کی مرضی
شامل تھی۔''
میں فخریہ لہجے میں بولا۔''بے شک،کوئی کام اس کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔''
وہ بپھرتے ہوئے بولی۔''تو اللہ (پاک) اپنے بے گناہ بندے کو پھینٹی لگوانے پر کیوں خوش ہے۔اور جو بندہ اس
کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اس کی مدد کیوں کر رہا ہے۔ایک عورت کبھی اپنی تذلیل پر راضی نہیں ہوتی،تو کیوں کسی درندے
کو عورت پر دسترس پانے کی ہمت دیتا ہے۔''
''تصویر کا ایک رخ دیکھو گی تو ایسے احمقانہ سوال تمھارے ذہن میں پیدا ہوں گے۔اور یاد رکھنا ایک چھوٹا سا سوال
بہت بڑے اور تفصیلی جواب کا متقاضی ہوتا ہے۔زندگی گزارنے کا ڈھنگ کسی ایک فقرے میں ذہن نشین نہیں ہو
سکتا۔مختصراً یہ سمجھ لو کہ دنیا دارالعمل ہے،دارالجزا نہیں ہے۔اچھائی برائی کا بدلہ ضروری نہیں کہ انسان کو زندگی ہی میں مل
جائے۔البتہ ایسا ہونا ناممکن نہیں ہے۔اللہ پاک نے انسان کو دو راستے بتا دیے ہیں۔نیکی و بدی کی تمیز سمجھا دی ہے۔جو غلط
کرے گا وہ ناکام و نامراد ہوگا اور جو اللہ پاک کے بتائے طریقے پر زندگی گزارے گا وہ کامیاب و کامران ہوگا۔بے شک
بہ ظاہر وہ ناکام،مفلس،نادار اور ستم رسیدہ نظر آئے۔ہماری کامیابی کے معیار اور ہیں۔فتح کا حصول کامیابی کو ظاہر نہیں
کرتا۔جیسے سیدنا عیسیٰؑ کو سولی پر لٹکانے والے ظاہری طور پر کامیاب نظر آ رہے ہیں تو کیا انھیں حق پر سمجھا جا سکتا ہے۔یونھی
بہت ساری سزائیں انسان کو اپنے اعمال و گناہوں کی وجہ سے بھی ملتی ہیں۔بلاشبہ اللہ پاک حکیم و خبیر ہے اور اس کے ہر کام
میں حکمت ہے۔''
''جب تمھارا اللہ (پاک) ہر چیز پر قادر ہے تو وہ ظالم کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑتا۔اس سے توفیق کیوں نہیں سلب
کرتا۔اور تمھارے قاعدے کے مطابق تو ہم دونوں کو اپنے کیے کی سزا ملی۔شاید تم نے گناہ کیے ہوں،لیکن مجھے اپنی زندگی
میں ایسا کام نظر نہیں آتا جسے میں گناہ سمجھ سکوں۔''

''دنیا کی زندگی بہ طور آزمائش ملی ہے۔ اللہ پاک نے اپنی مخلوق کا امتحان لینا ہے۔ اگر ظالم کو اسی وقت بدلہ مل جائے
مظلوم کی دادرسی ہو جائے تو امتحان کیسا؟ یوں تو ہر شخص ولی بن جائے گا۔ کوئی برا دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔ جبکہ
پاک کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے زندگی و موت کو اس لیے پیدا کیا کہ تمھارے اعمال و افعال جانچ سکوں کہ کون
اچھائی کرتا ہے اور کون برا رستہ اختیار کرتا ہے۔ اور پھر اسی بل بوتے پر آخرت میں حساب کتاب ہوگا۔ باقی ضروری نہیں
کہ ہر کسی کو گناہ کی وجہ ہی سے دنیا میں آزمائش کا سامنا ہو۔ اللہ پاک کے نیک بندوں پر زیادہ مصیبتیں اور آزمائشیں آتی
ہیں۔ اور سچ کہوں تو تم جانتی ہی نہیں ہو گناہ کیا ہے تو ایسا دعویٰ کیسے کر سکتی ہو۔''

وہ للکارتے ہوئے بولی۔ ''چلو، تمھی بتا دو میں نے کیا غلط کیا ہے؟''

''تم ننگے سر، نصف بازوؤں کی بنیان میں ایک غیر مرد کے سامنے کھڑی ہو، اسلامی نقطہ نظر سے یہ گناہ ہے۔
ماضی میں اپنی مرضی سے تم نے کئی مردوں سے جسمانی تعلقات قائم کیے ہوں وہ بھی بہت بڑا گناہ ہے۔ شراب پینا، خنزیر کا
گوشت کھانا، جوا کھیلنا، یہ تمام وہ گناہ ہیں جو یقیناً تم کرتی رہی ہو۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''اپنی مرضی سے میں صرف نک کے ساتھ سوئی تھی۔ مگر وہ گناہ کیسے ہوا۔ میرا اپنا جسم ہے جسے
چاہے سونپ دوں۔ تمھاری بھی دو بیویاں ہیں کیا وہ تمھارے قریب نہیں آتیں۔ شراب پینا مجھے اچھا لگتا ہے تو غلط کیسے
ہوا، تم بھی تو پیپسی، سیون اپ، مرنڈا اور جانے کون کون سے مشروب پیتے ہو۔ گائے بکری کا گوشت تم بھی کھاتے ہو تو خنزیر
کا گوشت کیوں گناہ ہوا۔ اور جواء کھیلنے والا فائدہ حاصل کرنے کو کھیلتا ہے، تو فائدے کے حصول میں ممانعت کیسی۔ باقی
نقصان تو کاروبار میں بھی ہو جاتا ہے تو کیا تجارت بھی گناہ ہے۔''

''تم برطانوی فوج کی آفیسر رہ چکی ہو کبھی پاکستان آرمی کی وردی پہننے کا اتفاق ہوا؟''

وہ استہزائی انداز میں بولی۔ ''موضوع سے نہ بھاگو۔''

''بھاگ نہیں رہا۔ جواب اُدھار ہے، پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔''

''پاکستان آرمی کی وردی میں کیوں پہنوں گی۔ وہ برطانوی فوج کی وردی سے بہتر تو نہیں ہے۔ باقی قانوناً بھی میں
نہیں کر سکتی تھی۔''

''اللہ تمھارا بھلا کرے میں بھی یہی سمجھانا چاہتا تھا۔ جیسے برطانوی فوج کا سپاہی ہونے کی وجہ سے تم پر کچھ ایسے
قانون لاگو تھے جو عام آدمی پر نہیں ہوتے۔ اور ان قوانین کی مخالفت کرنے پر سزا بھی ملتی ہے۔ بلکہ تمھیں تو کورٹ مارشل
کی صورت مل بھی چکی ہے۔ اور یقیناً اس کی وجہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔ بعینہ ایک مسلمان کلمہ پڑھنے کے بعد اللہ
کے احکامات کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اللہ پاک کے ممانعات سے بچنا ضروری ہو جاتا ہے۔ گناہ و ثواب
کی بڑی حکمت اللہ پاک کی مرضی ہے۔ اللہ پاک نے اجازت دی کہ نکاح پڑھانے کے بعد ایک عورت تمھارے
لیے حلال ہو گئی تو اب اس عورت کی قربت گناہ کے بجائے ثواب ہوگی۔ اسی طرح ہر وہ مشروب جو نشہ دے وہ حرام
ہے، کچھ جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے کچھ کی اجازت ہے۔ ایسا کیوں ہے اس کا جواب تفصیل طلب ہے۔ ایک
مسلمان کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ اللہ پاک نے فلاں کی اجازت دی ہے اور فلاں سے منع فرمایا ہے۔ جیسے فوج کا
قانون بتاتا ہے اس کی حکمت واضح نہیں کرتا۔ چند ٹکوں کے حصول کی خاطر فوج کے قانون پر اعتراض نہیں کرتی ہو اللہ
نے پیدا کیا، اتنی نعمتوں سے نوازا اس کا منع کرنا تمھارے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ''میں اللہ (پاک) کو نہیں مانتی۔ اگر وہ واقعی موجود ہے تو مجھے سزا کیوں نہیں دیتا۔''

''اللہ پاک خود آ کر کسی کو سزا نہیں دیتا۔ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو مسلط کرتا ہے، جیسے تم پر شکلا کو مسلط کیا۔'' مجھے

غصہ آیا اور جو منہ میں آیا اگل دیا۔
"بکواس بند کرو ریجا!" اس نے تولیہ کھینچ مارا۔
اور میں مسکراتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ کسی بے دین کو سمجھانا مجھ جیسے کم علم کے لیے ممکن نہ تھا۔ اپنے تئیں میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دے سکوں، مگر اللہ پاک کو نہ ماننے والوں کا مرض اتنا معمولی نہیں ہوتا کہ ہلکے پھلکے وعظ سے دور ہو سکے۔ اللہ پاک کو ماننا بھی اس کی بخشی ہوئی توفیق سے ممکن ہو سکتا ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت دے اور جسے چاہے گمراہی پر رکھے۔ یہ اس کے اپنے فیصلے ہیں اور اس کے فیصلوں میں انبیاء کرام کے قدسی نفوس دخل نہیں ہو سکتے تو مجھ جیسے گناہ گار کی کیا اوقات۔

میں نہا کر صرف تولیہ لپیٹے باہر نکل آیا۔ وہ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔
میں نے درخواست کی۔ "مرہم تو لگا دو۔"
وہ بدتمیزی سے بولی۔ "اپنے اللہ (تعالیٰ) کو بلا لو۔"
میں نے درشتی سے گھورا، اس نے نظریں نہیں چرائی تھیں۔ افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں خود ہی مرہم لگانے لگا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ بوڑھی مالک مکان کو کہہ دوں مگر پھر اپنے زخمی ہونے کا راز افشا کرنا مناسب نہ لگا۔
وہ چند لمحے مجھے گھورتی رہی اور پھر اٹھ کر قریب آ گئی۔ "سوری، مجھے غصہ آ گیا تھا۔" اس نے میرے ہاتھ سے مرہم لینے کی کوشش کی۔
"شکریہ۔" روکھائی سے کہتے ہوئے میں نے اس کی مدد ٹھکرا دی۔
"ادھر دو ناں۔" اس نے زبردستی مرہم چھیننے کی کوشش کی۔
"کہہ دیا ناں ضرورت نہیں۔" اسے دور دھکیلتے ہوئے میں درشت لہجے میں بولا۔
"سوری ناں۔" اس نے مفاہمتی لہجہ اختیار کیا۔
"مس لورا براؤن! مذہب تمھارا ذاتی مسئلہ سہی، مگر تمھیں کسی دوسرے کے عقیدے پر طنز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھ سے خفگی ہے تو میری ذات کو طنز و تنقید کا نشانہ بناؤ، میرے رب کے بارے گندا منہ کھولو گی تو مجھے تم جیسی کسی ساتھی کی ضرورت نہیں ہے۔"
میری برہمی کو خاطر میں لائے بغیر وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ "اچھا اگر ڈیٹ پر جانے کی ہامی بھروں پھر بھی صلح نہیں کرو گے؟"
"کسی غیر عورت پر میں تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا، اللہ پاک نے مجھے دو حوریں روما و پلوشہ کی شکل میں عطا فرمائی ہیں۔ جن کی صورت ہی نہیں سیرت بھی بہت اچھی ہے۔"
وہ بھناتے ہوئے بولی۔ "افغانستان میں منتیں کرتے تھکتے نہیں تھے، یہاں بھی کئی دفعہ منت کر چکے ہو عقیدے کا سنہ چھڑا تو پارسا بننے کا ڈراما کر رہے ہو ڈھونگی۔ بھول گئے کل موٹر سائیکل پر کیسے چپک کر بیٹھے تھے، اس وقت تمھاری رسائی کہاں گئی تھی۔"
"میں نے ہیوی موٹر سائیکل کبھی نہیں چلایا، ورنہ تمھیں نہ چلانے دیتا، باقی میرے مذاق کو حقیقت سمجھنا تم جیسی کوڑھ مغز کو مشکل نہیں ہے۔"
اس نے دھمکی دی۔ "زیادہ ڈراما بازی کی ضرورت نہیں ورنہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی، میں انتقام لینے کو تمھاری محتاج نہیں ہوں۔ شکلا جیسے غلیظ کو میں اکیلے سنبھال لوں گی۔"

میں فرق آنے لگا تھا۔ جو سو گولیوں تک اتنا بڑھ گیا کہ رائفل سو میٹر پر بھی درست فائر ۔۔۔ قابل نہ رہی۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ میں بھی کبھار ہی تین چار گولیاں فائر کرتی تھی۔ ورنہ رائفل کی خامی بہت پہلے سامنے آ جاتی۔ میں نے ماہرین کو بھاری فیس دے کر مسئلہ حل کرانا چاہا، مگر ایس آر وان کی یہ خامی دور نہ ہو سکی۔ اپنی پہلی مصنوعات سے ایس اے ایس کمپنی دھڑام سے زمین پر آ گری تھی۔ اگر شروع میں معلوم ہو جاتا تو ہم اتنی بڑی تعداد میں نہ بناتے۔ رائفل میں چند تکنیکی تبدیلیاں کر کے اس خامی کو دور کیا جا سکتا تھا۔ مگر ہتھیار تیار ہونے سے بعد تبدیلی ممکن نہ تھی۔ خامیں بس بیرل کا جوڑ ختم کرنا تھا۔ ایمونیشن میں بارود کی مقدار کم نہ تھی، چیمبر کو تھوڑا مضبوط کرنا تھا۔ کوئی بڑا کام نہ تھا۔ یوں کہ یہ 8.165 ایم ایم کے بجائے روایتی قطر 7.12 ایم ایم کی بن جاتی۔ اصل میں رائفل میں خرابی پڑی تو بیرل کے جوڑ کی وجہ سے۔ کیوں کہ رائفل کا وزن گھٹانے کو چیمبر کی موٹائی کم رکھی گئی تھی۔ اور گولی وزن دار تھی، چیمبر میں بارود کے گرین بڑھائے گئے تھے۔ تکنیکی طور پر چیمبر اتنے بارود کے دباؤ کو مسلسل برداشت نہیں کر سکتا تو پچاس ساٹھ گولیاں چلنے کے بعد چیمبر اور بیرل کا قطر معیاری نہیں رہتا۔ چند اور تکنیکی خامیاں بھی سامنے آئیں مگر وہ بڑی نہیں تھیں کہ ہماری محنت پر پانی پھرتا۔ خیر اس افتاد سے ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ہم کمپنی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ تبھی ایک دوسرے کو خطاوار کہنے لگے۔ ڈیوڈ کے تئیں یہ میری وجہ سے ہوا تھا کہ میں نے رائفل استعمال نہیں کی تھی۔ اور میں کہہ رہی تھی کہ اس کی وجہ سے میں اس جنجال میں پھنسی۔ قصہ مختصر آخر سوچا، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا ہو۔ رائفل کی مشہوری ہو چکی تھی اور شوقین حضرات خریدنے کے بھی خواہاں تھے۔ لیکن ہم یہ رائفلیں فروخت کر کے اپنا پول نہیں کھول سکتے تھے۔ کافی سوچ بچار کے بعد طے ہوا کوئی ایسا گاہک ڈھونڈا جائے جو تمام رائفلوں کو اکٹھا خرید لے۔ چند ملک زیر غور آئے اور آخر انڈیا کو منتخب کیا۔ اس کی ایک وجہ تو جنرل شکلا تھا [illegible] تھا۔ امید تھی ایسے شخص سے سودا بازی آسان رہے گی۔ دوسرا انڈیا کے پاس بہت بڑی تعداد میں فوج ہے تو یہاں رائفلوں کی ضرورت بھی زیادہ ہوگی۔ پس میں یہاں آ گئی۔ شکلا نے پہلے دن تو آمادگی ظاہر کی مگر جب [illegible] پارٹی میں جانا ہوا تب اس نے آرمی چیف کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ وہ مصر تھا کہ میں چیف پر گولی چلاؤں۔ مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ ایک بار ایسے معاملے میں گردن پھنسا چکی تھی۔ مگر شکلا نے اس شرط کے علاوہ رائفلیں خریدنے سے معذرت ظاہر کر دی۔ تب میں نے اس کے آدمی کو تربیت دینے کی پیش کش کر کے درمیانی راہ نکالی۔ اور وہ مان گیا۔ مگر اسے میں مخلص سمجھنا میری بھول تھی۔ وہ صرف مجھے پھانسنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ جب پہلے دن مجھ سے بات ہوئی اس کے بعد اس شخص نے لندن میں اپنے آدمیوں کے ذریعے میرے بارے معلومات حاصل کیں۔ اور میری سابقہ شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ پہلے بھی بڑی مشکل سے میری جان چھوٹی ہے۔ اور اب برطانیہ عدالت میں میرا یہ کارنامہ پہنچا تو پچھلا کیس بھی کھل جائے گا۔ اور یہی دھمکی اس نے مجھے قید کے پہلے دن دی تھی۔"

تفصیل سن کر مجھے لورا کی مجبوری آشکارا ہوئی۔ بلاشبہ وہ گردن تک دلدل میں دھنس چکی تھی۔ شکلا کے پاس اس کے خلاف ثبوت موجود تھے۔ شکلا نے ایک تیر سے کئی شکار کھیلے تھے۔ ایک پاکستانی جاسوس کی طرف داری نے اس کی مشکلات میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ اس کہانی سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ مجھے سنائپنگ کی تربیت دلانا سراسر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا۔ اور یہ کہ وشال گپتا میری اصلیت سے واقف تھا۔ یوں شکلا کا میرے بارے جاننا بھی بعید از قیاس نہیں رہا تھا۔ البتہ وہ اس سے لاعلم تھا کہ میں اس کی نواسی کو اغواء کرنے وہاں پہنچا تھا۔ یقیناً شکلا کا آرمی چیف پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ایک سودے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے کے بجائے آرمی چیف کی ریٹائرمنٹ کا انتظار کرنا بہتر سمجھتا۔ انڈین چیف، عہدہ سنبھالنے کے بعد قریباً دو سال کمانڈ کرتا ہے۔ اور بکرم سنگھ کو عہدہ سنبھالے ڈیڑھ سال ہو

زیادہ ہو گیا تھا۔ چند ماہ میں اس نے یونہی ریٹائرڈ ہو جانا تھا۔

وہ میری سوچوں میں مخل ہوئی۔ ''پریشان ہو گئے نا۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''پریشانی صرف پلوشہ کی ناراضی پر ہوتی ہے۔''

وہ حیران رہ گئی تھی۔ ''کیا؟''

''الجبراء کا کلیہ تو نہیں بتایا کہ تمھیں سمجھنے میں دشواری ہو۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ وہی کھان لڑکی ہے نا جس نے میجر جینیفر کی پٹائی کی تھی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مگر وہ تو تمھاری بیوی ہے نا۔''

میں نے منہ بنایا۔ ''کیا بیویاں ناراض نہیں ہو سکتیں۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''اگر بیوی کی ناراضی کا رونا رو کر اور اس سے خوش نہیں ہوں کا چارہ ڈال کر مجھ پر ڈورے ڈالنے کا ارادہ ہے تو تمھیں ناکامی ہوگی۔''

میں نے گہرا سانس لے کر سر کو تھاما اور کراہتے ہوئے بولا۔ ''برطانیہ کی چڑیل، آخر میری کس حماقت سے تمھیں یہ غلط فہمی ہوئی ہے۔ پلوشہ کی وجہ سے میں نے میجر جینیفر جیسی مخلص، وفادار اور پرکشش لڑکی کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا تو تم کس باغ کی مولی ہو۔''

وہ کھلاکھلا کر ہنسی۔ ''ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں، کھل کر اظہار کرو۔''

میں مضمحل ہوا۔ ''مطلب، تم سے مذاق کرنا اتنا بڑا گناہ ہو گیا کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔''

وہ شرارت سے بولی۔ ''افغانستان میں بار بار ڈیٹ پر جانے کی منتیں کرنا، یہاں بھی وہی واویلا کرنا اگر محبت نہیں تو کیا ہے۔''

میں نے سر پکڑا۔ ''وھت تیرے کی، کیپٹن صاحب ہمارے ہاں ڈیٹ پر جانا محبت نہیں بے غیرتی کہلاتا ہے۔''

اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''تو بے غیرتیوں کے لیے تمھیں میں ہی ملی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تمھیں چھیڑنے میں مزا آتا تھا۔ اور سچ کہوں تو بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔''

''مثلاً۔'' اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔

''انگریزی زبان کی وہ گالیاں، کوسنے اور لغویات سنیں جو کسی کتاب میں پڑھنے کا اتفاق ہوا نہ کسی فلم ڈرامے میں۔ یقین مانو اس موضوع پر تم متخصص (اسپیشلسٹ) ہو۔''

وہ تپتے ہوئے بولی۔ ''اور تم لڑکیوں کو چھیڑنے کے اسپیشلسٹ ہو۔''

میں سنجیدہ ہوا۔ ''اچھا فضول بکواس کو چھوڑ دو اور آگے کا لائحہ عمل بتاؤ۔''

''شکلا سے ''ایس آر ون'' کا مکمل معاوضہ وصول کر کے اس کی گردن اتارنا چاہتی ہوں۔''

میں ہنسا۔ ''ایسا بھی کیا غلط کر دیا بے چارے نے کہ تم گردن اتارنے پر تل گئیں۔''

''ریچا کہانا مزید بکواس نہیں۔''

میں نے تجویز دی۔ ''شکلا کے بارے ہمیں وشال گپتا سے کافی کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ دو تین دن آرام کر کے اس پر ڈالتے ہیں۔''

اس نے اپنی الجھن دور کرنا چاہی۔ ''تم میرا ساتھ کیوں دے رہے ہو۔''

''تمھیں ڈیٹ پر لے جانے کے لالچ میں یہ خطرہ مول لے رہا ہوں۔''
اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''تمھارے ساتھ مسئلہ کیا ہے ریجا۔''
میں متبسم ہوا۔ ''شکلا کے ہاں دعوت میں اس کی نواسی کو دیکھا تھا۔''
اس نے تصدیق چاہی۔ ''تمھاری مراد پری سے ہے۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بس مجھے وہ چاہیے۔''
وہ متحیر ہوئی۔ ''کیوں؟''
''ایک مسلمان چار شادیاں کرسکتا ہے اور میں نے اب تک دو کی ہیں۔''
وہ بے بسی سے مسکرائی۔ ''تم نہیں سدھرو گے۔''
''مجھے نیند آرہی ہے۔'' میں نے تکرار ختم کرنے کا اعلان کیا۔ یقیناً نسخے میں سکون آور دوا شامل تھی کہ لمبی نیند لینے کے بعد بھی مجھے نیند کی حاجت ہو رہی تھی۔
وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''مالک مکان کی بیٹی تعلیم یافتہ ہے۔ امید ہے اس کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہو۔ میں ڈیوڈ کو ای میل کر کے اپنی خیریت کا بتادوں۔''
میں نے جواب دیے بغیر آنکھیں بند کر لیں۔

●